دُرِّ عینی
حیات قبلہ بابا عبید اللہ درّانی

ہمچو ادہم بحرِ حق با یک پیالہ جستہ ام
مثلِ قرنی دُرِّ دیگر را تلاشے کردہ ام

در شبیہم بر دیارت نسبتے آوردہ ام
بہرِ اُمت تحفۂ نورِ جمالت بُردہ ام

دُرِّ عینی

حیات قبلہ بابا عبید اللہ دُرّانی مدظلہ العالی

مُرتبہ
ولی الدین

پیش کردہ
مصطفیٰ بانو وسیم (علیگ)

۱۳ صفر ۱۳۹۴ھ، ۸ مارچ ۱۹۷۴ء

ہمچو ادہم بجز حق با یکے پیالہ جستہ اَم مثلِ قرنی دُرّ دیگر را تلاشے کردہ اَم

در شبیہم بر زیارت نسبتے آوردہ اَم بہرِ اُمت تحفۂ نورِ جمالت بُردہ اَم

لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ
مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ

○

بَلَغَ الْعُلٰی بِکَمَالِہٖ
کَشَفَ الدُّجٰی بِجَمَالِہٖ
حَسُنَتْ جَمِیْعُ خِصَالِہٖ
صَلُّوْا عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ

(شیخ سعدی شیرازی رحمۃ اللہ علیہ)

Publisher : Qaim Husain, Nazimabad, Karachi.

Printed at : Ibn-e-Hasan Offset Printing Press, Karachi.

فہرست

پیش لفظ

تمام حیات جاوید اسی ایک نورِ مطلق کی تابانی ہے جو ازل سے ہے ابد تک رہے گا۔ اسی کو بقا ہے۔ ہر شے کو فنا ہے، لاشے کی بقا ہے۔ ہر لا اللہ کی فنا ہے۔ کیا وجودِ انسانی، کیا آفاق۔ حق کو ہی بقا ہے، کیا باطنِ انسانی کیا باطنِ موجودات حق کی حقیقت کا ظہور کائنات میں ہے اور کائنات صفات میں ہی نورِ ازل کی تابانی کی جھلک مل سکتی ہے۔ جو کچھ کائنات میں بالتفصیل ہے مفصل ہے وہی سب کچھ انسان میں اجمالی طور پر ہے۔ اس لئے اس ظہورِ مجمل ہی میں حق کی حقیقت کا ظہورِ اکملی انداز میں مل سکتا ہے اور کسی اکمل تک رسائی اس کی حقیقت سے شناسائی ہی، حق شناسی کی بہترین صورت ہو سکتی ہے اسی لئے حضور اکرمؐ نے فرمایا "من رآنی فقد رای الحق" جس نے مجھے دیکھا اس نے حق کو دیکھا۔

یہ ہم جو صدیقین، شہداء، اولیاء، مصلحین، فقراء اور عاشقین کی سوانح حیات پر نظر ڈالتے ہیں تو گویا اس طرح حق کے مختلف انوار، ان آئینہ ہائے ذات میں دیکھتے ہیں اور اسی طرح حق کے عرفان کی کوشش کرتے ہیں جس کا ظہوری پیکر یہ ہستیاں ہوتی ہیں۔ ان شاہبازانِ فضائے طٰہٰ و یٰسین کی حیات کے الطف پہلوؤں پر نظر ڈالتے ہوئے ہم اسی الطف کی تلاش کر رہے ہوتے ہیں جو خود ہمارے وجودِ ل

میں ہمارے باطن میں جلوہ افروز ہے اُس حق کو جو ہمارے باطن میں ہے اسی حق کے دیکھنے کی تڑپ ہے جو آئینہ صفات میں اکملیت کا انداز لئے حق نمائی کر رہا ہے۔ ہمارا اپنا وجود اور قلب مکدر ہے تو اس آئینۂ کامل میں ہمیں مکدر تصویر ہی نظر آئے گی۔ اس میں آئینہ کا کیا قصور۔ اپنے تصورات، سابقہ علم، خیالات اور ادراک کے حجابات کا یہ قصور ہے۔ وگرنہ نورِ حق کی تابانی تو ذرہ ذرہ سے عیاں ہو رہی ہے۔ حق بیقرار ہے اپنی رونمائی کے لئے۔ یہ سب کچھ کاروبارِ جہان اسی لئے آراستہ ہوا کہ اپنی شناسائی ہو اور حق کی اس رونمائی کا بہترین ذریعہ ہی ہستیاں ہوتی ہیں جنہیں منتخب کر لیا ہوتا ہے۔ صدیق، شہید ولی، مصلح، عاشق یا فقیر بنا کر نواز لیا ہوتا ہے۔ یہی حق کے آئینے ہوتے ہیں جو انسانی تاریخ کو نیا رُخ عطا کرتے ہیں یہ اور بات ہے کہ دنیا والوں نے اپنے مکدر قلوب کی وجہ سے ان آئینوں میں کدورت ہی دیکھی اور یہاں تک کہ پیغمبروں پر بھی انگشت نمائی کی کہ یہ کیسے پیغمبر ہیں جو ہم جیسے ہی ہیں، چلتے پھرتے اور کھاتے پیتے ہیں۔ یہ اپنی عقل و دانش اور علم و فضل کی کدورت تھی یا اپنے دولت، اقتدار اور مذہبی تقدس کی کہ علمائے ظواہر نے ہمیشہ اپنے وقت کے انبیاء کو خلافِ شرع اور دین سے بہکا ہوا دیکھا۔ اپنے علم فضیلت یا دینی رسم و رواج کے جو بت بنا رکھے تھے وہ توڑ ہی نہ سکے۔ نہ شرعِ باطنی پر نظر گئی نہ ذات کے اسرار و رموز پا سکے۔ ان کے نزدیک نبی اور خدا رسیدہ ہستیاں کوئی عجائبِ روزگار ساز و سامان سے مرصع ہونی چاہیئے تھیں۔ اس طرح عالمِ تخلیق اور انسانی وجود کی وہ قدر ہی نہ کر سکے۔ کہ یہی وجود تو بہترین صورت اظہارِ حقیقت کی تھی۔ اسی وجود میں اوج تیج نفسانی اور ملکوتی صفات گویا اختلاف الیل والنہار (دن اور رات کے بدلنے) کی نشانیاں تھیں۔ اعلیٰ اقدار، مجردات اور لطافتوں سے لیسا ہوا بھی

تو یہی جسم تھا اس تک کس کی نظر پہنچتی ۔ اس شمع فروزاں کے دل پر جو گذر رہی تھی اس تک کون اس کے جسم کے اندر جھانکتا ۔ ان دنیاداروں کو کیا معلوم کہ اس مادی جوہر کے ارض سے لے کر اس جسم کے مجردات اور لطافتوں کے آسمانوں میں جو کچھ سمایا تھا وہ ان ہی برگزیدہ ہستیوں کے اندر تھا۔

یوں عام زندگی میں انسان اپنا حسن دیکھنا چاہے تو آئینہ کی تلاش کرتا ہے جو مجلّٰی ہو ۔ ورنہ اپنے اندر کون جھانک سکتا ہے ؎

لیک کس را دیدِ جاں دستور نیست

اُس جانِ جاں کو جو اپنے اندر ہے کیسے دیکھے ۔ اور پھر کیسے پائے ۔ روح کی اس ازلی بیقراری کو کیسے قرار آئے ۔ لہٰذا اب اپنے اندر یہ دیکھو کہ تمہیں حق کی تلاش کی فکر ہے بھی یا نہیں ۔ یہ تڑپ، تجسّس کی آگ تمہاری زندگیوں میں روشن بھی ہے یا نہیں ۔ حق کی تلاش ہے تب ہی آئینہ کی تلاش میں نکلو ۔ اگر اپنے اندر حق کی لطافتوں کی تلاش ہے تو الطف ہی ہو کر کسی کی جانب رجوع ہو۔ یوں اپنی فکر چھوڑ کر دوسرے خدا رسیدہ لوگوں کی ناپ تول کب تک کرتے رہو گے ۔ کب تک اپنے مقرر کردہ پیمانوں سے ان کی جانچ کرتے رہو گے ۔ اگر تمہارے اندر، اپنے سے خلوص ہے تو پھر خلوص، صفا، خدمت اور محبت کا وسیلہ ہی سب سے بہتر رابطہ کی صورت ہے ۔ بلکہ رابطۂ انسانی تک کے لئے تمہارے اندر یہی جوہر ہے جس سے انسان کہلانے کے مستحق ہو سکتے ہو ۔ تم پرخلوص ہو، تمہارے اندر حق کی تلاش کی فکر ہے، تڑپ ہے تو ہو نہیں سکتا کہ کسی مجلّٰی آئینہ میں تم اس کی جھلک نہ پا لو ۔ تمہیں آئینے کے ناپ تول کی اس وقت فکر نہ ہو گی بلکہ اس تجلی کو پا جانے کی تڑپ جو تمہارے قلب میں روشن ہو چکی ہے ۔ اسی لئے یہ فقرائے باطن پہلے

تمہارے قلب میں حق کی وہ تڑپ پیدا کرنے کی فکر میں ہوتے ہیں جو تمہارے اندھیروں سے تمہارے اجالوں میں لے آئے اور ظاہر کی شرع و آئین پر وہ اس وقت تک توجہ نہیں دیتے جب تک تمہاری عبادتوں میں خلوص نہ آجائے۔ یہ خلوص و محبت کا راستہ، یہ عشق کی راہ کھولنے کا سامان بہم کر دینا فقیر کا احسان ہے۔ عالم انسانیت پر اور اسی مقصد کے لئے اس کا ظہور ہوتا ہے۔ یہ صدیقین، صالحین، شہدا، مصلحین، عاشقین سب کے سب فقیر کی کملی اوڑھے ہوتے ہیں اور اپنے اپنے انداز میں دنیا والوں کے لئے مشعلِ ہدایت بنے ہوتے ہیں۔ اکملیت حاصل کر لینے کے بعد، یہ سب کے سب آئینۂ ذات بنے ہوتے ہیں۔ حقیقت محمدیؐ کو اپنائے ہوئے ہوتے ہیں۔ اب خود دیکھو کہ ذات اور حقیقتِ محمدیؐ کی تابانیوں کو کیا تم ان مٹی کی آنکھوں سے کبھی بھی دیکھ پاؤگے۔ اپنے محدود پیمانوں میں لامحدود کو کبھی تول سکوگے۔ ذات اور حقیقت محمدیؐ وُسع کُلِّ شَیءٍ ہے۔ ہزاراں ہزار اندازوں میں ان انوار ہائے ذات کے آئینوں میں یہ تجلیاں ہیں۔ خوب سمجھ لو کہ تمہیں تو اپنے قلب کی کدورت کی وجہ سے ان آئینوں میں وہی جلوہ گری نظر آئے گی جو تمہارے اپنے قلب کے اندر موجود ہے۔ علم و عقل و شعور کی محدودیت میں تم لامحدود کو کیسے دیکھنا چاہتے ہو۔ کیسے ممکن ہو کہ پابندِ نفس و حواس انسان، ان لطافتوں میں قدم رکھ سکے جو صرف مخلص اور عاشق لوگوں کی میراث ہے۔ یہ وفاد محبت کے پتلے صرف محبوب پر فدا ہونا جانتے ہیں۔ یہ اپنے لئے بھیک بھی نہیں مانگتے۔ سب کچھ ان کا دین محبوب پر مرمٹنا ہے۔ یہ نہ ہو سکے تو اپنے کو عاجز ہی بنا لو۔ اس عقل و شعور کی قیدِ جسمانی سے نکل جاؤ اپنے کو کسی کے آگے مٹی کر ڈالو۔ تو رحمت کا ہاتھ تمہیں سہارا دے لے۔ یا پھر ایک ٹوٹا ہوا دل لے آؤ، جو اس کے روزنوں میں سے تمہارے اندر، رحمت کے انوار تجلی دینے لگیں۔ رحمت عاجزوں کے لئے ہی ہے۔ رحمت اللعالمین عام ہے۔

بات لے دے کر اپنی حق کی تلاش اور آئینے تک رسائی کی رہ جاتی ہے۔

المومن مراۃ المومن۔ مومن، مومن کا آئینہ ہے۔ فرمان نبوی ہے اس کی حقیقت کو پاؤ تم وجود میں ہو اس لئے وجودی آئینہ کی تلاش کرنی ہے۔ کسی خدا رسیدہ یا پسندیدۂ حق ہستی کی زندگی کے حالات پڑھ کر یہ ممکن ہو سکتا ہے کہ اپنے خلوص اور صداقت کے مطابق ہمیں کہیں کہیں اپنی جانِ جان، اپنے باطن کی جھلکیاں نظر آتی جائیں تو تشفی ہوتی جاتی ہے اگر طلب میں شدت اور قسمت میں یاوری ہے تو اسی آئینہ ظہور حق کے ساتھ اپنا وہ باطنی لگاؤ بھی قائم ہو سکتا ہے جس میں نظر اس آئینے اور اپنی لطافتوں پر ہی جمنے لگتی ہے بھٹکنے نہیں پاتی پھر لطافتوں سے روشناسی کے بعد یہ لطافتیں کائنات تخلیق میں بھی نظر آنے لگتی ہیں بے شعور زندگی کو ایک شعور اور تہذیب ملنے لگتی ہے۔ اب مجرّدات کی فہم بھی ہونے لگتی ہے اور ان مجرّدات میں زندگی بھی گذرنے لگتی ہے اور ان مجرّدات میں شیوہ ہے۔ گو آئینہ کا وجود بھی مادی ہوتا ہے اور وجود بھی مادی ہے مگر اب اپنی نظر اس وجود کی ظاہری زندگی سے قطع نظر، اس کی لطافتوں کو اپنا کر گذر رہی ہوتی ہے گویا ہم اس شراب طہورا کے کیف میں ہوتے ہیں جو اس جامِ سفالِ وجود میں ہوتی ہے۔ اب ہمارا تخیل، نظر، اُس کے ظاہری جسم، اس کے افعال و حرکات و سکنات تک محدود نہیں رہتی بلکہ اُس مقدس ہستی کی لطافتوں ہی کی جانب ہوتی ہے۔ اگر ہم وفادار ہیں، پُر خلوص ہیں، محبت والے ہیں تو اُدھر سے بھی یہی وفا، خلوص، محبت خود بخود دس گنا انداز میں، ہمیں ملتی ہے۔ تم میری طرف ایک قدم بڑھاؤ تو میں دس قدم تمہاری طرف آتا ہوں۔ یہی بات ہے اور یہ محبت و خلوص کا رشتہ قائم ہونا تو قربِ حقیقت کی طرف پہلا قدم ہے۔ حقیقت تو اس سے آگے کچھ اور بھی ہے۔ لطافتوں، مجرّدات اور اعلیٰ اقدار کی دنیا سے آگے، حقیقت در حقیقت

ہے جیسے حق یا نورِ سمٰوات والارض کے علاوہ اسے اور کیا کہا جائے ۔ قسمت میں
ہے تو طلب میں شدت بھی ہو گی یا ہو جائے گی اور اس حق کی اپنے اندر جلوہ گری کو دیکھ بھی
لیں گے اور ہو بھی جائیں گے ۔ یہ کیفیت وحدت الوجود ہے ۔ کوئی دوئی نہیں مجھ میں
اور تجھ میں ۔ نہ کائنات کی کسی شے میں ۔ حق وسعَ کُلَّ شیئیٍ ہے ۔ ہر غیر حق کی فنا ہے
بقا حق کو ہے اور وہی ہے ۔ نہ میں ہوں نہ تو ہے ۔ بس ہے ! ہے ! ہے ۔
اب مقصدِ تعارف کی جانب آئیں ۔ کسی برگزیدہ منتخب ہستی کا ظہور وجود میں ہونا
اس کا ارتقائے باطن اسی جسمانی زندگی میں تکمیل پاکر، اکملیت کے مقام پر فائز ہونا اور آئینہ
ذات بن جانا ، عینِ مرضئ حق ہے ۔ اسی لئے تو یہ سب کائنات پیدا کی کہ اپنا عرفان اس طرح
عجب عجب رنگ میں ، عجب عجب انداز میں ، عجب عجب زمانے میں ہو سکے ۔ اسی مقصد کے لئے
اس جسم کے پنجرہ میں اس روحِ ازلی کو بند کر کے اس دنیا میں بھیجا جس میں اپنی روح بھی
پھونک دی اور تڑپ بھی دے دی ۔ اب ایسی منتخب ہستیوں کے ذریعہ یہ تڑپ اور تجسس
حقیقت کو عام کرنا تھا ۔ میثاقِ ازل انسانی روحوں کو یاد دلانا تھا ۔ ان ہی کے ذریعہ دوسروں
کی حق تک رہنمائی کرانا تھی ۔ رحمت للعالمین کی کملیٔ فقر اڑھا کر ان کو بھی خلقت کے درمیان
بھیج دیا کہ جس نے تمہیں دیکھا اس نے مجھے دیکھا ۔ یہ دیکھنا نظر نظر کی بات ہے ۔ جیسی اپنی
نظر پہ عینک ، اسی رنگ میں اس تصویرِ حق کو دیکھا ۔ جیسی اپنے قلب کے آئینہ کی حالت
اسی حالت میں اس فقیر کو سمجھا ۔ جب تک دل میں نہ بسایا تو کیا دیکھا ، کیا سمجھا ، کیا اپنایا ۔
یہ فقرائے باطن وہ چراغ ہوتے ہیں جنہیں کوکب دُرّیہ کہا گیا ہے ۔ ان کے جسم کی مشکوٰۃ
میں یہ چراغ نورالسمٰوات والارض منور ہوتا ہے یا پھر وہ چودھویں کا چاند ہوتے ہیں جو
شمسِ حقیقت کی تجلی ہی میں منور ہوتا ہے ۔ الغرض ان مینارۂ نور فقراء کے لئے بھی وہی جسم و

حیات کی قید میں ہیں۔ وہی پیدائش سے لے کر موت تک کا چکر۔ بچپن، لڑکپن، جوانی، بڑھاپا انہیں بھی گذارنا ہوتا ہے جو، ہر ذی حیات کی قسمت میں ودیعت ہے۔ ان ہادیان کی پیدائش سے لے کر تمام زندگی کی جھلکیاں اسی لئے پیش کرنے کی ضرورت ہے کہ ان میں سے علم و فہم عشق و وجدان، لطافتوں اور خوبیوں کی وہ حسین جھلکیاں پالیں جو اپنی زندگی کی بھی ادا بن جائیں اور اس طرح اپنی بیقرار روح کو بھی پروازوں کے لئے ان ہی کی معیت میں ایک آسمانِ کشادہ نصیب ہو۔ ؎

روحِ روح سیمرغ، بس عالی طواف
ظلِ اُو اندر زمیں چوں کوہ قاف

تعارف

صبحِ ما از مہرِ اُو، تابندہ گشت

جو ہستیٔ مبارک اپنے درمیان ہو، اس کے روزمرہ کے ایام اپنی نظروں کے سامنے گزر رہے ہوں۔ اس کی جانب اسی محبت وخلوص کے انداز میں کیوں گا نہ بڑھا جائے جس کے تحت وہ خود، ایک زندہ متحرک جیتی جاگتی کیفیت میں اپنی زندگی ہمارے درمیان گزار رہا ہے۔ لطافتوں کی دنیا میں قدم رکھنا ہو تو الطف ہوکر، ساتھی بن کر اس کا ساتھ کیوں نہ نبھایا جائے جو ہمارے درمیان ایک کھلی کتاب کی حیثیت رکھتا ہو۔ نہ علم وعرفان کے جھول، نہ بزرگی وتقدس کی اجنبیت۔ نہ تبلیغ ورشد وہدایت کا جامہ۔ نہ ذکر واذکار کے حلقے۔ نہ ریاضتوں مجاہدوں کے چلّے۔ بلکہ جیسے عام انسان زندگی گزارتے ہیں اسی عمومی سطح پر ان کا ہم سے رابطہ ہے تاکہ کوئی غیریت ان کے ہمارے درمیان نہ رہے اور ایک یگانگت و یک رخی پیدا ہوکر دوئی اور وہم کے باطل بت ٹوٹ جائیں۔ اس طرح جمیعت کی سطح پر جمیعت کی زندگی، جمیعت کی برکت کے معنی عملی پہلو سے کشادہ ہونے شروع ہوں حشر میں بھی ٹولیاں کی ٹولیاں آئیں گی اور جنت میں بھی گروہ کے گروہ داخل ہوں گے۔ فرداً فرداً تو جہنم میں جائیں گے۔

یہ جمیعت کا احساس جانِ دین ہے۔ بنیاد ہے اپنی انفرادیت سے نکل جانے اور جمیعت کی وسعت میں زندگی گزارنے اور اپنے سے باہر پھیلنے کی۔ تعلقِ خلق، ہمدردیٔ خلق خدمتِ خلق کے سہارے، رحمت اللعالمینی نسبت پیدا ہونے اور خالق سے رابطے کی اس خلق سے رابطے کو عملی صورت میں قبلہ کی روزمرہ زندگی میں دیکھا جائے تو ایسا معلوم ہوتا ہے

کہ جیسے ان کے لئے اس سے زیادہ عزیز اور کوئی بات نہیں کہ کوئی ضرورت مند، تکلیف وغم میں مبتلا انسان ان کے پاس آئے تو وہ اس کی دلجوئی کریں۔ اس کا غم اپنائیں اسے اکیلے پن اور بے آسرا ہونے کا احساس نہ ہونے دیں اور علاج کے ساتھ ساتھ تشفی بھی عطا کریں۔ ان کے قریب رہ کر دیکھنے میں یہی آیا کہ کتنی ہی پریشانی، یا ہیجان میں جو لوگ خلوصِ نیت سے ان کے پاس پہنچے تو جب قبلہ نے ان کو دیکھ لیا تو انہیں تشفی ہوگئی وہ ہمدردانہ لہجہ وہ آنکھوں کی مسکراہٹ، وہ اُبلتے ہوئے محبت کے چشمے، وہ بھروسہ کے ساتھ تسلی دینا بغیر اثر کئے نہیں رہتا۔ صبح سے شام تک قبلہ سے یہ کرالو۔ بار بار کمرہ سے باہر نکال لو۔ نہ وقت کا تعین، نہ پابندیٔ اوقات کے قوانین، حتیٰ کہ ان کی اپنی بیماری کی داستانیں یا پریشانیوں کے قصے ایسے اطمینان سے اُس حالت میں بھی سنتے ہیں کہ جیسے اس سے پسندیدہ ان کے لئے کوئی دوسرا کام ہی نہیں۔ وہ دردِ دل سے دوسروں کی باتیں سننا صبر وضبط کا ایک ایسا معیار پیش کرنا کہ صحت مند سے صحت مند انسان اگر ایسی ہی آزمائش سے گزرے تو ہار مان لے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ جس دن جتنے زیادہ دردمندوں کی دل بستگی کی، اتنی ہی شگفتگی قبلہ کے چہرہ پر آئی۔ گویا کہ یہ رحمت کا بادل برس کر ایک تسکینِ روحانی خود بھی حاصل کر لیتا ہے یا ایک مشفق ماں بچے کو دودھ پلا کر خود کو اور ہلکا پاتی ہے۔ ربوبیت کے ایسے سرچشمے کو دیکھ کر انسان، کچھ نہ کچھ اپنا مقام بھی پا لیتا ہے جس کے لئے اسے بھی دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ جاننے کی بات یہ ہے کہ آخر یہ ہوتا کیسے ہے عقل یہی بتاتی ہے کہ کوئی پریشان حال یا تکلیف میں مبتلا انسان سامنے آیا تو غیرتِ انسانیت اور رحمت اللعالمینی نسبت جو، ہر اُمتی پر فرض ہے، خود بخود جوش میں آجاتی ہے۔ یہ رقیق القلب ہستی اسی غیرت کے وسیلے سے اُس معذور اور مبتلا شخص کی تکلیف اپناتی ہے اور یہ

تکلیف اس پر کچھ اس طرح خود بخود طاری ہو جاتی ہے اور جب ماں بچے کو گلے سے لگا لیتی ہے تو بچہ اپنی تکلیف اس ماں سے گلے لگ لیتی ہے تو بچہ اپنی ساری تکلیف اس یا یوں کہہ لیں کہ فقیر رحمت کے پروردہ ہوتے ہیں۔ ان کا یہ غموں کا جذب کرنا کچھ ایسا قدرتی سا عمل ہے جیسا کہ ایک جاذب کا روشنائی چوس لینا۔ اس طرح فقیر خلقت کی جسمانی اور روحانی دونوں بیماروں کے لئے شفاء کا ذریعہ بن جاتے ہیں اسی لئے فقیر کا وجود احسان ہے انسانیت پر۔ کبھی ان کا شفقت سے ہاتھ رکھ دینا، کبھی آنکھوں سے محبت انڈیل دینا، کبھی تشفی کی بات کہہ دینا بے اثر نہیں رہتا۔ اس طرح ہر دردمند دل کو یہاں پہنچ کر تشفی بھی ہو جاتی ہے اور شفا بھی۔ ہمدردی پا جانا ہی شفا ہے۔ دیکھ لینا ہی شفا ہے اور یہ اسی وقت ہوتا ہے جب تار سے تار مل جائے۔ دیدار کی تڑپ لے کر کوئی بیمار پہنچے تو شفا لازمی ہے۔ دید کی چوٹ بڑی بیماری ہے لہٰذا چھوٹی کو کھا جاتی ہے۔ شفاء کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا بغیر عشق و محبت کے۔ عشق کی آگ سب بیماری کو بھسم کر دیتی ہے۔ مگس، تکلیف میں الجھ کر رہ جاتا ہے۔ پروانے رجوع ہو جاتے ہیں۔ رجوع ہوئے، روح آزاد ہوئی۔ جیتے جی پل صراط طے ہوئی۔ موتو قبل انت موتو کا مقام حاصل ہوا۔ شمس حقیقت کی طرف رجوع ہوئے، ظلمت دور ہوئی۔ المختصر یہ ایام، یہ خلوص اور محبتوں کے عالم میں زندگیاں کسی اور سطح پر گذر رہی ہوتی ہیں۔

قبلہ دُرانی صاحب، شہر پشاور میں کسی تعارف کے محتاج نہیں پڑھے لکھے لوگ انہیں ۱۹۵۴ء سے ۱۹۷۰ء تک انجینئرنگ کالج کی پرنسپلی کرتے دیکھ چکے ہیں۔ عوام و خواص ان کے ہومیوپیتھک علاج سے برس ہا برس سے مستفیض ہو کر واقف ہو چکے ہیں۔ بہت سے سادہ مزاج عقیدتمند یہ بھی کہتے سنے گئے ہیں کہ فقیر کی دعا ان کے ساتھ ہے۔ اسی

لئے ہر طرف سے مایوس ہو کر جب کچھ لوگ ان کے پاس پہنچتے ہیں تو یہی عرض کرتے ہیں کہ ہمیں علاج نہیں چاہیئے، آپ کی دعا چاہیئے، ان کے لئے قبلہ درّانی صاحب طوراً فقیر کے نام سے منسوب ہیں۔

نام نامی محمد عبید اللہ خان درّانی ہے جس سے بہت کم لوگ ہی واقف ہیں۔ ان کے لئے درّانی صاحب یا قبلہ صاحب کہہ دینا ہی کافی ہے۔ اس ادا میں وہ خلوص ٹپکتا ہے جو قبلہ کے لئے لوگوں کو ہے۔ چھوٹے بڑے، غریب امیر، عورت مرد سب کے لئے درانی صاحب وہ وسیلہ بنے ہیں جو ان کے کسی نہ کسی کام آتا رہتا ہے۔ پشاور کے قیام کے دوران ہزاروں لوگ علاج معالجہ یا دکھ درد سنانے آتے جاتے رہے اور فیضیاب ہوتے رہے۔ اس کا شعور شاید بہت کم لوگ ہی کر پائے کہ کسی جگہ پر کسی فقیر کا قدم رنجہ ہونا کسی امرِ ربانی کے طفیل ہوتا ہے اور اندھیری راتوں میں یہ چراغ کیوں سرِراہ رکھ دیا جاتا ہے یا سرِبازار یہ فقیری کیوں عام کر دی جاتی ہے کہ دیکھنے والی آنکھیں بھی انگشت بدنداں ہو کر رہ جاتی ہیں مگر اُس رازِ سربستہ کو پھر بھی نہیں پا سکتیں جو روزِ روشن کی طرح ان کے سامنے ہوتا ہے

قبلہ کے جاننے والوں میں سے کچھ کو اب، یہ شوق بھی ہو رہا ہے کہ قبلہ کی بابت جو کچھ باتیں مختلف لوگوں نے دیکھی ہیں یا سُنی ہیں ان کو حالاتِ زندگی کی صورت میں جمع کر دیا جائے تو قبلہ سے اور زیادہ تعارف ہو جائے۔ یہ تعارف جس کی تڑپ ہر انسان میں فطری طور پر ہے، آسان بھی ہے، دشوار بھی۔ چاہنے والے کے لئے ایک ادا ہی کافی ہے۔ نکتہ چیں کے لئے دفتر ناکافی ہیں۔ یہ تعارف تو خیر ایک محبوب ہستی کا ہے، یوں عام انسان تک کا تعارف اتنا مشکل ہے کہ جو کچھ بھی اس کی بابت بیان کیا جائے کم ہے۔ سپردِ تحریر کرنا چاہیں تو مشکل در مشکل۔ کہاں سے شروع کیا جائے۔ کیا کیا

لکھا جائے کہاں ختم کیا جائے۔ پھر ان کیفیات کو کس طرح بیان میں لایا جائے جو ایک جلتی شمع کے وجود پر گزرتی ہیں۔ اس سے قطع نظر لوگوں کی خود نوشتہ سوانح حیات تک دیکھ ڈالیں تب بھی بات بس جھلکیوں تک کی رہ جاتی ہے۔ اس سے زیادہ نہ شناسائی ہو سکتی ہے، نہ واقفیت، نہ تعارف، پھر جب پیش نظر ہستی ایسی ہو کہ اسے سمندر کہہ لیں تو کسی قسم کے بیان یا تعارف کی بات اور بھی دشوار ہو جاتی ہے۔ سمندر کا کون سا کنارہ، کونسی گہرائی، کون سی سرد یا گرم رو ئیں، کون سی موج، کون سے بھنور، کون سے طوفان، کون سے آسمان، کون سی ہوائیں، کون سے سفر، کون سی غوّاصی (غوطہ زنی)، کون سے موتی، کون سا پانی، جدھر نظر ڈالیں پانی ہی پانی۔ تو پھر قطرہ پر ہی اکتفا کریں۔ مگر یہاں بھی حیرت یہاں بھی عاجزی، قطرہ کو دیکھیں تو سمندر ہے ؎

دلِ ہر قطرہ ہے سازِ انا البحر

عام انسان سمجھ کر کچھ اس کی بات لکھنے کے لئے قلم اٹھایا جائے تب بھی دشوار بات ہے۔ ہے نہ آخر کو یہ بھی بحرِ حقیقت کا ایک قطرہ۔ کائناتِ تخلیق کا ایک انمول جوہر۔ ایک شاہکار۔ ایک پیکرِ لاثانی۔ احد۔ احسن التقویم۔ ظہورِ حق کی نشانی دُرِّ علینی، خواہ مٹی کا ذرہ ہو یا قیمتی نگینہ۔ حقیر گھاس کا تنکا ہو یا تناور درخت۔ عاجز حیوان ہو یا دانا و ہوشمند انسان۔ ہیں تو سب کے سب کسی کی شان کے مظاہر۔ بچہ اپنے باپ کا اپنے خاندان کا مظہر۔ طالب اپنے مرشد اپنے سلسلہ کا مظہر۔ پھر فقیر کی مظہریت کون بیان کرے۔ الفقر ہو اللہ۔ فقیر کا حال کون لکھے۔ ارشاد ہے۔ فقیر میری کملی میں ہوتا ہے اسے کوئی نہیں جانتا سوائے میرے جب فقیر کی یہ شان ہو کہ اسم اللہ جسم فقیر کا، تو اس نوازے ہوئے سے کون دور بھاگے کون بے رخی کرے، کون اس کے قریب آئے، کون اس کو سمجھے، کون اس کا دامن پکڑے

کون اس کے دامنِ رحمت میں جگہ پائے، فقیر رحمت کا پروردہ ہوتا ہے، اس رحمت کو کون پائے، کون بیان کرے۔ رحمتی وسعت کل شیئ۔ میری رحمت تمام اشیاء پر چھائی ہے۔اس رحمت کا وسیلہ لیتے ہوئے۔ اس احسانِ بیکراں کے صدقے، البتہ کچھ بات بن سکتی ہے۔ اسی رحمت کے سایوں میں قلم آگے بڑھ رہا ہے۔ کچھ لکھ گیا، کچھ لکھا جارہا ہے۔ قلم کا کیا۔ لکھنے والا ہاتھ خود لکھتا ہے۔ ہاتھ کا کیا۔ لکھانے والی عقلِ بینا خود لکھاتی ہے۔ عقل کا کیا یہ تو نورِ علم سے روشن ہے جس کا تعلق عالم امر سے ہے۔ اللہ نور السمٰوات والارض۔ اسی نور کی جلوہ فشانی ہر ظہور میں ہے۔ اسی کے طفیل وجودِ خاکی کوکب دریۃ بنا ہے۔ نورٌ علیٰ نور ہے۔ جب وہی ایک ہے تو ہر شے میں اسی کا ظہور ہے خود ہی لکھاتا ہے خود ہی اپنی حمد وثناء کرتا ہے۔

کسی شمع فروزاں کی سوانح ہو تب بھی اسی کی سوانح ہے۔ کسی سرِ کُن کی توصیف ہو تب بھی اسی ایک کی توصیف ہے۔ کسی کا تعارف ہو اسی ایک کا تعارف ہے۔

اَللہ احد اللہ الصمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تاثرات

یااللہ　　یانور　　یاحق　　یامُبین

یاکریم　　یاکریم

صَلّی وَسَلّم علیٰ سیّدِ نا محمّدٍ وّ اٰلِہٖ فوقَ الحدِّ والعَدّ

○

بحمداللہ ایک کوکبِ دُرّیہ کے انوار و تجلیات سے آشنا ایک دلی الدین اِسرار و رموزِ حق کی پردہ کشائی کر رہا ہے اور طالبانِ حق کے قلوب کو منور کرنے اور معاشرہ کو صدق و وفا مہر و محبت، لُطفِ کرم، غمِ اُمّت ایثار و اخلاص سے بہرہ ور کرنے کے لئے عوام و خواص کی توجہ قادر نگر کی طرف مبذول کر رہا ہے کہ لوگ ربّ قادر کی قدرت کے تماشے دیکھیں اور دُرِ عینی کے انوار و معارف سے فیض یاب ہوں۔

یہ صدقہ ہے۔ حضورؐ سرورِ کائنات فخرِ موجودات، رحمتہ اللعلمین کا کہ دُنیا آج بھی اہلِ کرم، اہلِ وفا، اہلِ نظر سے خالی نہیں۔ یہ دعوت ہے کہ آؤ دیکھو اور سمجھو! کسی بزرگ نے خوب کہا ہے ؎

جان پرتوے خدا و نظر نورِ جان تست
جاں را بنورِ چشم ببیں در نظر ببیں!

(جان خدا کا پرتو اور نظر تیری جان کا نور ہے۔ جان کو آنکھ
کے نور سے دیکھ نظر میں دیکھ)

آن کاملانِ حق کہ نمودہ مشاہدہ
ایں آں مشاہدہ است بمادر نظر ببین

(وہ حق میں کمال پائے ہوئے ہیں جنھوں نے دیکھا ہے۔
یہ وہی مشاہدہ ہے ہمارے ساتھ نظر میں دیکھ)

محترم بھائی ولی الدین کا حکم اس عاصی بے مایہ کو آیا ہے کہ
میں بھی ان ابوابِ رحمت میں داخل ہونے کی سعادتوں سے سرفرازی
پاؤں۔ شدید کم مائیگی کے احساس کے باوجود تعمیلِ امر کے سوا
چارہ نہیں جو لکھا جا رہا ہے وہ بھی کسی نظرِ کرم کا صدقہ ہے۔

○
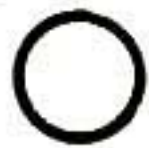
اُستادِ محترم حضرت احمد عبدالصمد فاروقی قادری چشتی رح
نے فرمایا کہ اللہ رب العزت نے حضرت آدمؑ کی تخلیق اپنے
دو ہاتھوں سے فرمائی۔ یہ دو ہاتھ اس کی قدرت و حکمت کے
ہاتھ ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ باری تعالیٰ اس عالم ناسوت کو اپنی حکمت سے چلا رہا ہے اور اخروی زندگی اس کی قدرت کاملہ کے زیر فرماں ہوگی۔ یوں اس عالم میں بھی اس کی قدرت ہر جگہ جلوہ فگن ہے، بلکہ اگر یوں کہیں کہ حکمت خود مآلِ قدرت ہے تو بے جا نہ ہوگا۔

○

اسی قدرت و حکمت کے رموز سے آشنا کرنے اور ایک معبودِ حقیقی کی فہم سے نوازنے اور مخلوق کو خالق سے ملانے کے لئے انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ قائم ہوا جو ختم رسل سید المرسلین پر منتہا ہوا۔ یوں تو ہر مومن کا ایمان ہے کہ بحیثیت نبیؑ انبیاء علیہم السلام میں کوئی فرق نہیں لیکن وہ فضلنا بعضہم علیٰ بعض کی بھی حقیقت سے آشنا اور شبِ معراج کے انعام خصوصی سے بھی آگاہ ہیں جسے قرآن حکیم میں قاب قوسین اوادنیٰ سے سمجھایا گیا اور جس کی ترجمانی شمس تبریزی کے قلب منور نے یوں فرمائی۔

مصطفیٰ یافت در شبِ معراج ؎ خلعتِ لا الٰہ الا ھُو

دراصل بقول ایک بزرگ کے کہ "ذاتِ حق نور ہے، عین نور ہے، نور سے نور کے سوا اور کیا ظہور میں آتا ہے۔

نور سے نور ہی ظاہر ہوتا ہے۔ نور ہی نور کو پاتا ہے"
پاسکتا ہے" لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ
معلوم ہوا کہ آقا دوجہاں کی معراج دائمی قربِ معبود ہے
اور بندے، اُمتی کی معراج قدمِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہے
ایک اور بزرگ نے خوب فرمایا کہ اس ذات احد کی
وحدت کی طرح ذات احمد صلی اللہ علیہ وسلم کی انفرادیت بھی
اپنی جگہ منفرد ہے۔ وہ یکتا تو یہ بے ہمتا۔ آپ آئینۂ حق ہیں اور خواص
کے لئے اس میں قیل وقال محال ہے"۔
یہی وجہ تھی کہ شبِ معراج کی صبح حضور صلی اللہ علیہ وسلم
جب معزز صحابہ کرام، پرستارانِ توحید کے حلقہ میں جلوہ افروز تھے تو
ایک اصحابی نے یوں درود پڑھا۔
اَللّٰھُمَّ صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدِنِ الَّذِیْ مَلَأْتَ قَلْبَہٗ مِنْ
جَلَالِکَ وَعَیْنَہٗ مِنْ جَمَالِکَ فَاَصْبَحَ فَرِحًا مُؤَیَّدًا مَنْصُوْرًا
وَّ عَلٰی اٰلِہٖ وَصَحْبِہٖ وَسَلِّمْ تَسْلِیْمًا وَّ الْحَمْدُ لِلّٰہِ عَلٰی ذٰالِکَ۔
(اللہ رحمت نازل فرما ہمارے رسول محمد پر جن کے دل
کو تو نے بھر دیا ہے اپنے جلال سے اور ان کی آنکھوں کو بھر دیا

ہے اپنے جمال سے۔ پس ہو گئے وہ خوش مدد پائے ہوئے
فتح یاب اور ان کی آل پر اور اصحاب پر سلام اور سب تعریف
اللہ ہی کو ہے اس بات پر)

یہ درود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سُنا اور تبسم فرمایا۔ جو امرِ واقعہ
کی تصدیق بھی ہے اور خوشنودیٔ رسول صلعم کا موجب بھی۔

"یہی نقطۂ رسالت ہے جو کچھ ہے سب اسی میں ہے"

قلبِ رسول ہی کلام ربانی کا متحمل ہو سکتا تھا اور حضور صلعم کی زبان مبارک
سے اس کی تلاوت، زبانِ حال و قال سے اس کی حکمت اور اسوہ
حسنہ سے تعمیل امر کے انداز اور نظرِ التفات سے اس کے انوار قلب
مومن میں جگہ پاتے رہے، پاتے رہیں گے۔

○

اسی مظہرِ حق، اسی ہادیٔ برحق کے اقوال، احوال، اعمال، اور
انوار سے عالم کو منور رکھنے کے لئے اور آیاتِ قرآنی کی حکمت و
قدرت سے آشنا کرنے کے لئے دو جماعتوں کو اس کی ذمہ داریوں
کی سعادتوں سے نوازہ گیا۔ ایک جماعت علماء کرام مفسرین محدثین فقہا
کی ہے جو کلام ربانی کو آئینہ محمدی میں دیکھ کر پڑھ کر سمجھ کر اس کی
تفسیر کرتے ہیں، ایک حکیمانہ انداز سے اس کی حکمت کے ترجمان

ہیں۔

دوسری جماعت فقراء و مشائخ کی ہے جو قرآنِ صامت اور قرآنِ ناطق کے معجزات اور قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کے نور و انوار اپنی اپنی بساط کے بموجب دیکھتے اور دِکھاتے ہیں۔ علما بتاتے ہیں، سمجھاتے ہیں، فقرا اُمت دِکھاتے ہیں، بناتے ہیں، دونوں اصولاً ایک ہیں البتہ دونوں کے انداز اپنے فرائض کے اعتبار سے جُداگانہ ہیں۔ یہ سلسلہ صحابہ کرام اور اہلبیت اطہار سے شروع ہوا اور آج تک جاری و ساری ہے، ابتدا میں اس فرق کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوئی لیکن جوں جوں قلوب پر نفس کا غلبہ بڑھتا گیا۔ ظاہر و باطن کی اصلاح کے انداز بدلتے رہے۔

آج بھی یہ کواکب دُرّیہ آسمانِ ولائت پر چمکتا رہے ہیں اور آسمان کے تاروں کی طرح بظاہر جُدا جُدا اور منفرد نظر آتے ہیں لیکن درحقیقت یہ سب ایک ہی مَعْدنِ جود و کرم منبع علم و حکم، ایک ہی طٰہٰ ایک ہی یٰسٓ سے فیض یاب ہیں۔ اُنہیں کا پرتوِ جمال ہیں اور عالم کو درس توحید و وحدت دے رہے ہیں اور ان صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں تک پہنچانے کے خواہاں ہیں جو ان کی خود اپنی منزل ہے۔

”نظرِ مہر“

یہی وہ کواکب دُرّیہ ہیں جن کی خاموش نگاہیں متکلم ہو کر قلوب کو آشنائے راز بنا دیتی ہیں۔

حضرتِ اُستادِ محترم نے خُوب فرمایا تھا۔

وہ آنکھوں آنکھوں میں کہنے کی باتیں کہہ گزرتے ہیں
کہاں سے آگئی ہے قوتِ گفتار آنکھوں میں۔

میرے محترم بھائی ولی الدین نے جن بزرگ ہستی کی سوانح حیات کا حق ادا کرنے کی جرأت کی ہے۔ ان قبلہ کی "نظرِ مہر" کا بھی یہی خصوصی انداز ہے۔

ایک بار حضرت قبلہ دُرّانی صاحب مدظلہ کی صحبتِ خاص توحیدِ مطلقہ پر گفتگو تھی۔

مجلس میں سورہ اخلاص قُلْ هُوَ اللّٰهُ أَحَدٌ ... کا ذکر آیا فرمایا کہ بھائی میں تو ابھی قُلْ ہی کو سمجھ رہا ہوں۔ یہ لطیف نکتہ اپنے دامن میں ایک دُنیائے اسرار و معارف لئے ہوئے ہے۔ باتوں باتوں میں توحیدِ مطلق کو سمجھانا۔ دوئی سے نکال کر وحدت میں لا ڈالنا، خودنمائی سے نکال کر خدانما بنا دینا انہیں بزرگوں کا حصّہ ہے۔ ماشاء اللہ۔ لا قوۃ الا باللہ۔

انہیں کی صحبت میں معرفت، محبت کے لباس سے آراستہ

ہو کر دلوں میں گھر کر جاتی ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ ۔

محبت ہی کے صدقے میں یہ سب انوار کھلتے ہیں۔

وجود عالمِ امکان شعورِ شان یکتائی!۔

بات صرف اتنی ہے کہ یہ محبت کس کو کس سے، اور کتنی ہے۔

○

ایک بار حضرت امام شافعی رحمتہ اللہ علیہ درس قرآنِ حکیم دے رہے تھے، ہزاروں طالب علموں کا مجمع تھا کہ ان کی نظریں ایک بزرگ پر پڑیں جو ان کی طرف تشریف لا رہے تھے۔ امام صاحب خاموش ہو گئے اور کھڑے ہو گئے۔ طلبا محوِ حیرت تھے کہ یہ کون عالمِ دین ہیں۔ یہ بزرگ تھوڑی دیر امام صاحب کے پاس بیٹھے اور رخصت ہو گئے۔ طلباء میں سے بعض نے جراُت کی اور حضرت امام شافعیؒ سے ان کے متعلق یوں استفسار کیا۔ "حضرت! یہ بزرگ کوئی جید مفسر ہیں" فرمایا نہیں! دریافت کیا۔ کوئی محدث یا فقیہ ہیں؟ فرمایا نہیں۔ طلباء صورتِ سوال تھے کہ پھر یہ ادب کیوں؟ امام صاحب نے فرمایا۔

کہ اصل بات یہ ہے کہ میں الکتاب، قرآن حکیم کو ان سے بہتر جانتا ہوں۔ لیکن یہ بزرگ صاحبِ کتاب کو مجھ سے بہتر جانتے ہیں۔

جب تک علماء صوفیہ کا یہ تعلق قائم رہا دین متین کی وسعتیں اور رفعتیں عالم پر آشکارا ہوتی رہیں، اب جس دور سے ہم گزر رہے ہیں اس میں نظریں صرف حکمت کی فہم تک محدود ہو گئی ہیں۔ اور ان تمام امور سے جو قادرِ مطلق کی قدرتِ کاملہ کا نمونہ اور جن پر ایمان آخروی زندگی کا سرمایہ ہے یہ نظریں ان سے بیگانہ ہوتی جاتی ہیں اور یہی بات ہمارے ایمان کے اضمحلال اور کوتاہ نظری کی موجب ہیں.

ضرورت اس امر کی ہے کہ ان اولیاء اللہ حضرات سے لوگوں کو زیادہ سے زیادہ قریب لایا جائے. شاید زمانے کے شدید تقاضے بھی ان بزرگوں کو گوشۂ عزلت سے نکلنے پر مجبور کر رہے ہیں. شاید یہی وجہ ہو کہ حضرت قبلہ دُرانی صاحب نے بھائی ولی الدین کو اپنی سوانح لکھنے کی اجازت دی ہو، ورنہ میں جانتا ہوں کہ وہ خدمت خلق کے تو قائل ہیں لیکن خلق میں شہرت کے قائل نہیں.

اللہ کا شکر ہے کہ اس طرح ایک دینی اور دنیوی زندگی کی ایک معروف ہستی جو علومِ ظاہر (سائنس) اور علومِ باطن (معرفتِ الٰہی) کا سنگم ہے ان کے انوار اور تجلیات سے لوگ مستفید ہو سکیں

گے اور اس دُرِ عینی کو پڑھ کر اور حضرت قبلہ کو دیکھ کر سمجھ سکیں گے کہ دردِ اُمت کسے کہتے ہیں؛ خدمتِ خلق کیا ہے۔ ایک لطفِ نظر حیاتِ جاودانی کیوں کر عطا کرتی ہے۔ کیا عجب ہو کہ حضرت محترم کا غمِ اُمت قوم کو پھر پیغام بیداری دے اور ہمارے بختِ خفتہ جاگ اُٹھیں اور ہم پھر اُس منزل کی طرف رواں و دواں نظر آئیں جو کبھی ہمارا نصیب تھا۔

محتاجِ کرم
خاکِ پائے اولیاء
حامد حسن بلگرامی عفی عنہ

کراچی
۲۷ رجب ۱۳۹۸ھ

باب ۱ نزولِ کوکبؐ دریہ

یہ دنیا کا عجائب خانہ۔ یہ پیدائش و زیست و موت کی داستانیں۔ مگر اس سے قبل وہ ظہور سے پہلے کی حیات۔ وہ یومِ ازل۔ وہ انفرادی روحوں کا اکٹھا ہونا۔ وہ میثاقِ ازل۔ وہ کون سی حیات تھی۔ یہ حیاتِ عالم سے بہت پہلے کی بات۔ کروڑوں سال پہلے کی بات۔ پھر وجودی دنیا میں آنے سے پہلے وہ طویل انتظار۔ منشائے قدرت، نظامِ فطرت کی تمام حکمتوں کی روشنی میں ہر روح کو اپنے اپنے زمانے میں یہ دنیوی زندگی گذارنے کے لئے منتخب کیا جانا۔ ہر ذی روح پر یہ احسان کہ اسے کارزارِ عالم میں وجودی زندگی گزارنے کے لئے ستراسی سال یہ بوجھ اٹھانے کے قابل گردانا گیا۔ بذاتِ خود ایک تشکرِ وجود اور احسان کی بات تھی۔ پھر اس دنیوی زندگی کی چکّی میں سے گزر کر پھر سرخرو ہو کر اپنے رب کے حضور پہنچنا۔ پھر وہی انتظارِ مدتِ بسیار۔ یومِ حشر اس دنیا میں ہو یا وہاں۔ اور پھر اس کے بعد بھی لامتناہی زندگی کا سلسلہ۔ اور وہاں سے دنیا کے کاروبار میں، اس زندگیٔ روحانی کے ذریعہ بھی فیضان و رحمت کے اجراء کا ذریعہ بنے رہنا، خوش نصیبوں کے لئے ضروری ہوا تو ازل سے ابد تک کی زندگی کا شمار کیا جائے تو یہ دنیاوی زندگی ایک عجیب احسانِ عظیم ہے فرد کے لئے بھی اور انسانیت کے لئے بھی جس کے درمیان ایک کوکب "دریہ" کا نزول ہو۔

پیدائش اور موت کے توہمات سے قطع نظر دیکھا جائے تو جو زندہ روح اس دنیوی وجود میں آئی۔ جسم کے پنجرہ میں کچھ عرصہ مقید رہی اور دنیا میں اپنا کام کر کے چل دی، وہ

تو ہر صورت ویسی کی ویسی آزاد نکلی جیسی کہ روزِ ازل سے تھی اور ویسی ہی آزاد، ابدتک رہے گی ۔ اس کو موت کہاں ۔ اس کی پیدائش کیا معنی ۔ اس کی پیدائش تو یومِ ازل سے پہلے کی بات ہے ۔ جن ارواح میں یہ شعورِ ازلی اس دنیوی زندگی میں قیام پکڑے ہوتا ہے وہی اس وجودی زندگی میں حق کی تلاش میں بے چین رہتی ہیں اور یہی تڑپ ، یہی تلاش بالآخر ان کی وجودی زندگیوں میں بھی شمع کے سوز یا پارے کی بیقراری کی طرح قائم و دائم رہتا ہے یہ شعورِ ازلی قبلہ درّانی صاحب کو بھی فطری طور پر نصیب ہے ۔ کتنی پیاری اور کیف آور بات ہے کہ اپنی وجودی پیدائش کو خود ان کی روح دیکھ رہی تھی ۔ انہوں نے بچپن میں بھی بڑی سادگی سے اپنی والدہ سے دریافت کیا تھا کہ اماں یہ کیا بات تھی کہ جب میں پیدا ہو رہا تھا تو اپنے کو پیدا ہوتے بھی گھر کے آنگن کے ، لانبی لانبی پھلیوں والے گل مہر کے درخت پر بیٹھا دیکھ رہا تھا ۔ اب بھی جب قبلہ درّانی صاحب یہ بات دہراتے ہیں تو اس میں وہ جذب ، وہ لطافت وہ صداقت ہوتی ہے کہ ہر سادہ دل انسان یہ محسوس کر سکتا ہے کہ جیسے یہ کیفیت اس پر سے بھی گزری ہے اور وہ بھی اسی طرح ، کسی گوشہ میں کھڑا یا درخت پر بیٹھا خود اپنی پیدائش کو بھی اسی طرح دیکھ رہا تھا ۔ یہ دیکھنا روح کی بصیرت کی بات ہے ۔ روح زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے ۔ خود اپنے ظاہری وجود سے حجاب بنی ، جسم کے پنجرہ میں زندگی کی محرک قوت بنی ہوئی ہے ۔ جان تک کو ، اپنے وجود میں کوئی کیسے دیکھے ۔ پھر روح جو جانِ جاناں کی بات ہے ، شعور کی گرفت میں کیسے آئے ۔

اس ادراکِ روح کی ایک اور واردات بچپن کے زمانہ میں ہی کچھ ایسی سادگی اور اس انداز میں ہوئی کہ حق کی جانب رجوع کا یہی اہم پہلو بن گئی ۔ یوں اکثر مشاہیر کی سوانحِ حیات میں ایک نہ ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہونے کی مثالیں ملتی ہیں جس کے بعد سے ان کی زندگی

کو ایک نیا رخ ملتا ہے ۔ عموماً یہ ایک دل کی چوٹ ہوتی ہے یا کسی سانحہ کے بعد تائب ہو کر حق کی جانب رجوع کا ذریعہ ہو جاتا ہے ۔ قبلہ درّانی صاحب ابھی بارہ سال کے تھے ۔ جوانی پہلی پھُریری لے رہی تھی ۔ ایک حقیقت بیں کی نگاہ میں یہ رُوح کی ازلی بے چینی ، اپنے اصل سے ملاقات کی تڑپ ہوتی ہے جس کا ظل خاکی بدن پر پڑتا ہے اور وہ کسی نامعلوم شے کی تلاش ، کسی حُسنِ پوشیدہ کی دید کی تڑپ میں ، خود اپنے باطن کی لطافتوں کے محرک نمود میں الطف بنا ہوتا ہے ۔ مجردات سے روشناسی کا یہ لڑکپن ایک فطری زمانہ ہوتا ہے ۔ والد صاحب کو باغبانی کا شوق تھا ۔ ایک گملہ میں صدف کا پودا تھا جس پر ایک لانبا موٹا کیڑا بیٹھا تھا ۔ اتوار کا دن تھا نو بجے صبح کا وقت اور گرمیوں کا زمانہ ۔ قبلہ اسے غور سے دیکھنے لگے کھاتا کیسے ہے ، چلتا کیسے ہے ، پھر اس کا رنگ بالکل سبز ۔ جیسا پتہ کا رنگ ویسا ہی اس کیڑے کا ۔ آدھ گھنٹہ اسی انہماک میں گزر گیا ۔ دیکھا کہ کیڑا سوکھتا گیا ۔ گھنٹہ میں بالکل سوکھ گیا ۔ ایک چھوٹی سی تیلی کی طرح ہو گیا ۔ پھر پھٹا ۔ پَر نکلے ۔ پر پھیلتے گئے ۔ دھوپ میں پر سوکھے کیڑے نے پَر پھیلائے اور تتلی بن کر اڑ گیا اور ساتھ قبلہ کے قلب و دماغ پر یہ نقش چھوڑ گیا کہ ہمارے جسم کے خول کے اندر ، روح کی تتلی موجود ہے اور بہت خوبصورت ہے یہ پھٹ کر اڑے تو ہمیں کسی اور زماں میں بڑی آزادی مل سکتی ہے ۔ روح کی یہ بسیط فضاؤں میں پھیل جانے کی تڑپ کتنی سادگی اور لطافتوں میں جوانی کی پہلی پھریری کی شکل لے کر ہر انسان کو نصیب ہوتی ہے ۔ مگر وہ جسم کی بے قراری کی حد تک ہی محدود رہ کر زندگی گزار لیتا ہے اور یہ موقع کھو بیٹھتا ہے ۔

مگر اس لڑکپن کی منزل سے پہلے تو ہر ذی روح کے لئے وہ جسمانی پیدائش ہے جس کے لئے یوم ازل سے ہر ایک کو اپنی اپنی باری ۔ اپنے اپنے زمانہ کا منتظر رہنا ہوتا ہے

۴ ؍ مئی یوم شنبہ ، ۱۱ بجے دن ۱۹۵۶ء، یہ روحِ سعیدِ ازلی اس دنیا میں بھیجی گئی ۔ مدراس کی ایک خوبصورت سی چھوٹی بستی ، راجمندری ، گنتوُر میں پیدائش ہوئی ۔

خاندان نجیب الطرفین ، مسلمانوں کا دکھ درد اپنانے والا ۔ نجی زندگیوں میں راست باز، حق پرست ، صداقت کا پیکر، شرافت کی تصویر ۔ ہر لحاظ سے ایک اسلامی تہذیب، اخلاق اطوار سے مرصّع ، باعمل ، خاندانِ دُرّانی ۔ احمد شاہ ابدالی کی فتوحات کے بعد، طولِ عرضِ ہندوستان میں، فاتحین اپنی درخشندہ قسمتیں لے کر پہنچے ۔ قبلہ دُرّانی صاحب کا سلسلۂ نسب براہِ راست احمد شاہ ابدالی سے جاکر ملتا ہے ۔ انیسویں صدی عیسوی کے آغاز میں ان کے جدِ امجد ، سردار خاں دُرّانی ، دہلی چھوڑ کر کھلنہ چلے گئے ۔ وہاں سے انہوں نے جنوبی ہند کی راہ لی ۔ جب وہ ریاست کوئم سے گزر رہے تھے تو وہاں کے راجہ کی اُن پر نظر پڑی ، جو سردار خان کی شخصیت سے بڑا متاثر ہوا ۔ اُس نے سردار خان کو اپنی ریاست میں ایک اعلیٰ عُہدہ دے دیا ۔ سردار خان نے نیلی پدی کے راجہ کے خلاف جنگ میں انتہائی جرأت اور مہارت کا ثبوت دیا ۔ ریاست کوئم کا راجہ ان کی خدمات سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے سردار خان کی شادی اپنے کمانڈر انچیف سالار مسعود دُرّانی کی بیٹی سے کرادی ۔ اس طرح سردار خان جنوبی ہند ہی میں رہ پڑے ۔ جہاں ان کی نسل پروان چڑھی اور پھلی پھولی ۔ دُرّانی صاحب کے والد خان بہادر محمد حبیب اللہ خان دُرّانی اپنے عہد کی ایک ممتاز شخصیت تھے ۔ والدہ اور دادی صاحبہ حضرت بندہ نوازؒ گیسو دراز کے خاندان سے تھیں ۔ والدہ صاحبہ سیّدہ محمود النساء کا خاندان کاکی ناڈا میں تھا ۔ تقویٰ ، پرہیزگاری ، عبادت و ریاضت میں یہ لوگ اپنا ثانی نہ رکھتے تھے ۔ چنانچہ شادی کے بعد بھی والدہ صاحبہ کی یہ حالت رہتی کہ خاموش زندگی گزارتیں ۔ اکثر وقت گھر کے کام کاج سے فرصت پاکر عبادت اور تلاوت میں گزارتیں ۔ کھانے پینے میں

کوئی دلچسپی نہ تھی۔ بسا اوقات یہی معمول رہتا کہ صبح ایک کپ چائے، شام ایک کپ۔ صرف زچگی کے دنوں میں ایک وقت کا کھانا کھاتیں۔ گیارہویں شریف کی نیاز بڑے اہتمام سے کرتیں۔ ہر ماہ گیارہویں کو ہرے کپڑے پہنتیں۔ پلاؤ اور میٹھا تقسیم کراتیں۔ عام طور سے چھت پر جاکر عبادت کرتیں۔ ایک روز صبح کو جا نماز پر لیٹی تھیں، چہرہ چمک رہا تھا۔ فرمایا حیرت انگیز تماشہ دیکھا۔ ایک نور، زمین سے آسمان تک منور ہو گیا۔ چار بزرگ تشریف لائے پیرانِ پیر، خواجہ اجمیری، خواجہ بندہ نواز گیسو دراز اور ایک اور۔ فرمایا، مانگ کیا مانگتی ہے والدہ صاحبہ کے منہ سے کوئی بات نہ نکلی اور وہ اوپر چلے گئے۔

خان بہادر محمد حبیب اللہ خاں درانی ۱۸۹۵ء میں گریجویٹ بن کر تعلیم سے فارغ ہوئے اور سرکاری ملازمت اختیار کرلی۔ ۱۹۱۱ء میں وہ ڈپٹی کلکٹر بن گئے۔ جن دنوں وہ گنتور، مدارس میں متعین تھے۔ انہوں نے مقامی مسلمان آبادی کی فلاح و بہبود کے لئے ایک انجمن کی بنیاد رکھی اور اس کے صدر منتخب کئے گئے۔ مسلمانوں کو اُن کی غربت کی وجہ سے اُس علاقہ میں حقارت سے دیکھا جاتا تھا۔ اسی لئے خان بہادر کے دل پر یہ بات شاق گزرتی تھی اور انہوں نے اپنی آمدنی کا بیشتر حصہ مسلمانوں کی فلاح کے لئے صَرف کرنا شروع کیا۔ ان کا فرمانا تھا کہ میں نے بچوں کو علم دے دیا، پڑھا دیا، لکھا دیا۔ ان کے لئے کوئی جاگیر نہیں چھوڑوں گا۔ نہ پیسہ چھوڑوں گا جس کی زیادہ ضرورت نادار قوم کو ہے۔ چنانچہ ان کی ذاتی کوششوں سے شہر میں انجمن کے دفتر کے لئے ایک خوبصورت عمارت تعمیر ہوئی۔ اس عمارت میں عبادت کے لئے ایک وسیع کمرہ موجود تھا اور چند گودام بھی تھے جن سے ماہانہ ڈھائی سو روپیہ کرایہ کی صورت میں وصول ہوتا تھا۔ انجمن کے پاس ایک سو ایکڑ قابل کاشت اراضی بھی تھی خان بہادر صاحب کی کوشش سے ہی ایک عیدگاہ تعمیر ہوئی، قبرستان کی چار دیواری بنوائی

گئی۔ مسجد کے نیچے دکانوں کی آمدنی سے مسلمانوں کی مدد کی جاتی رہی۔ طالب علموں کے وظائف مقرر تھے۔ ان کوششوں کا نتیجہ تھا کہ کئی ایک نادار ذہین طلبا تعلیم حاصل کرکے انجینئر اور جج بنے اور دوسرے باوقار عہدوں پر فائز ہوئے۔ خان بہادر صاحب کی پوری زندگی ایسے ہی فلاحی کاموں میں گزری۔ انہوں نے اپنے تعینات ہونے کے مقامات پر ہر جگہ مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان میں بیداری پیدا کرنے کے فرائض کو ہمیشہ پیش نظر رکھا۔

ان کی سماجی اور دینی خدمات کی بنا پر ترچنا پلی کے نواب صاحب نے انہیں حکومت سے مانگ لیا۔ پن گان پلی میں وہ دو سال تک ریاست کے دیوان رہے۔ خان بہادر صاحب کی نجی زندگی تقوٰی اور نیک مزاجی کا نمونہ تھی۔ تہجد اور تلاوت روزانہ کا معمول تھا۔ دفتر کے کاموں کے علاوہ فلاحی کاموں میں برابر مصروف رہتے۔ کُتب بینی سے خاصہ شغف رکھتے چنانچہ ہندوستان کی کئی زبانوں میں مہارت رکھتے تھے جن میں عربی، فارسی، اردو، تلگو، اوڑیہ، انگریزی قابل ذکر ہیں۔ خان بہادر صاحب کی اولاد میں پانچ لڑکے اور چار لڑکیاں ہوئے جن کے خاندان ان ہی کی نیک عملی اور دعاؤں کے طفیل دنیا میں بھی پھل پھول رہے ہیں اور عاقبت کی بھی دولت سمیٹ رہے ہیں نیکی کے بیج سے جو درخت پیدا ہوتا ہے اس کی بار آوری دیکھنا ہو تو اس خاندان پر آج بھی نظر ڈالی جائے کہ کس طرح پھل پھول رہے ہیں۔ خان بہادر صاحب کی اولاد کے نام مندرجہ ذیل ہیں:

مطہر النساء۔ رحیم النساء۔ محمد حبیب اللہ خان۔ محمد عزیز اللہ خان۔ محمد نصر اللہ خان۔ محمد عبید اللہ خان (ہمارے درّانی صاحب)۔ وحیدہ خانم۔ مسعودہ خانم۔ محمد عبدالمنان خان۔

خان بہادر محمد حبیب اللہ خان، بابا تاج الدینؒ ناگپوری کے معتقد تھے۔ اکثر بابا صاحب کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور حضور سے پگڑی بھی عطا ہوئی تھی۔ اس کرم نوازی

کا صدقہ تھا کہ خان بہادر صاحب کو ان کے، ۔قصے کے لوگ ہمارے حضرت کے لقب سے پکارتے تھے اور جب خان بہادر صاحب کا انتقال ہوا تو نماز جنازہ اور فاتحہ چار گاؤں میں ہوئی جگہ جگہ غائبانہ نمازِ جنازہ پڑھی گئی اور قرآن خوانی ہوئی۔

اس طرح گویا زمین درست کی جا چکی تھی۔ فرش آراستہ تھا، محفل جم چکی تھی جس میں ایک کوکب" دریۃ" کا نزول ہوتا۔ جب ساری کائنات کے درخشندہ نظام کی ربوبیت اُسی قادرِ مطلق کے ہاتھ ہے تو اس کا وجودی اظہارت نئے انداز میں ہوتا ہی رہتا ہے، جس کو ایک سُوجھ بُوجھ رکھنے والی آنکھ صاف طور پر دیکھ لیتی ہے۔ چنانچہ قبلہ کی پیدائش کے وقت والدہ صاحبہ بہت بیمار تھیں۔ نوزائیدہ بچہ کے لئے ماں کا دودھ بھی مشکل سے ہوتا۔ گھر کی ملازمہ سیدُو اور اس کا میاں بیشتُو عرصہ سے گھر کی خدمت کرتے آرہے تھے۔ سیدو کے ذمہ ہی تھوڑی بہت دیکھ بھال بچہ کی پڑی۔ سیدُو کا اپنا بھی نوزائیدہ بچہ تھا اس لئے سیدو کے توسط سے قدرت نے دودھ کا بھی انتظام کر دیا۔ قبلہ کی پیدائش کے دو دن بعد ہی سیدو کا بچہ اکیس دن کی عمر پاکر وفات پا گیا۔ سیدُو پر غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ مگر اس نوزائیدہ بچہ کی جانب فطری کشش نے سیدو کا یہ غم، فوری طور پر ہی غلط کر دیا اور اس نے بہ رضا و رغبت قبلہ کو دودھ پلانے کی ذمہ داری خود ہی لے لی۔ اس طرح ڈھائی سال تک قبلہ نے سیدو کا دودھ پیا اور جسم کافی تندرست ہو کر گول گپا ہو گیا۔ قدرت نے اس طرح جہاں سیدو کا صدمہ دور کرایا وہاں ایک بیمار ماں کے ہوتے ہوئے ایک نوزائیدہ جسم کی پرورش کا بھی انتظام کر دیا۔ اور دو ماؤں کے جذبۂ مادریت کو بھی سکون بخشا۔ ایک نظرِ تشکرُ سے دیکھا جائے تو جیسے قدرت کا سارا کارخانہ ایک ہی وحدتِ وجود اور ایک ہی ربُوبیت کی شان میں کارفرما ہے۔ ایک زندگی دوسری زندگی کو جنم دے رہی ہے۔ ایک زندگی اپنے سے بہتر

زندگی کے اجزاء کا ذریعہ بنی ہے۔ ربوبیت عام ہے۔ اہل کی جگہ اہل تر کو مل رہی ہے۔
ارتقائے حیاتِ جسمانی و روحانی ایک کُن کے محرک کیف میں، ایک ہی رشتہ میں منسلک جاری
و ساری ہے۔

قبلہ کی ابھی اڑھائی سال کی عمر ہی تھی کہ ختنہ کرا دی گئی۔ قبلہ کی ہمشیرہ کا فرمانا ہے
کہ جب ختنہ کی خوشی کے درمیان ماموں صاحب نے قبلہ کے بند ہاتھوں میں سونے کی اشرفی
رکھی تو قبلہ نے مٹھی کھول کر دیکھی اور "چھی" "گو" کہہ کر پھینک دی۔ اس وقت تک اظہارِ
خیال کے لئے ٹوٹے پھوٹے الفاظ بولنے ہی لگے تھے۔ وہ حضرت موسیٰؑ کا بچپن کا واقعہ سونے
کا ٹکڑا اور دہکتا ہوا کوئلہ، پھر جبریل امین کی اعانت سے سونے کا ٹکڑا چھوڑ کر، دہکتا کوئلہ
منہ میں رکھ لینا، گو عمر بھر زبان میں لکنت آجانے کا سبب بنا مگر اس وقت کے فرعون کے ظالمانہ
حکم سے جان بچنے کی صورت بھی ہو گیا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر بیدار روح کی استعانت
قدرت خود کر رہی ہوتی ہے۔ نبی کریمؐ نے بھی تو کفار کی پیشکش کو یہی کہہ کر ٹھکرایا تھا کہ میرے ایک
ہاتھ میں تم سونے کا پہاڑ اور دوسرے میں چاند رکھ دو گے تب بھی اپنے عزم سے نہ ہٹوں گا۔
یہ دین، دنیا میں سے دین کو منتخب کرنا اور دُنیا کو ٹھکرانا ہر بلند مرتبت روح کا شیوہ رہا ہے
اور یہ نشانی اس بات کی ہے کہ ان سونے کے ٹھکرانے والوں کے ہاتھوں یقیناً انسان نے
زر پرستی سے نجات پائی ہے۔ سونے کا بچھڑا اکثر اسی طرح پاش پاش کیا گیا ہے۔
زر پرست قومیں ایسی زندہ روحوں کے ہاتھوں ہی سرنگوں ہوئی ہیں۔ کچھ اسی قسم کی تکرار
کا ایک اور واقعہ بڑی بوجان نے بیان کیا وہ یہ کہ جب قبلہ کی عمر چھ سال کی تھی تو ایک زمانہ میں
گھر میں روپیہ پیسہ کی کمی تھی۔ بڑی بوجان نے قبلہ صاحب سے کہا تھا کہ عُبید تم دعا کرو۔ اس
پر قبلہ نے جھنجھلا کر ان سے کہا تھا کہ یہ کیا "گو گند" مانگتی رہتی ہیں۔

قبلہ جب چار سال کے تھے تو اس زمانہ میں ایک مولوی صاحب گھر میں رہا کرتے تھے جو بڑی بہنوں کو درس نظامی پڑھاتے تھے۔ ایک دن یہ مولوی صاحب قبلہ کو سمندر میں نہلانے کے لئے لے گئے۔ قبلہ کو آج تک اس واقعہ کی جھلک ہے کہ مولوی صاحب کے کاندھوں پر بیٹھے تھے۔ ایک بڑی موج آئی، اٹھا کر لے گئی اور پھر ساحل پر پھینک دیا۔ اس حادثہ میں قبلہ کو نہ کوئی تکلیف ہوئی، نہ بیماری۔ جیسے ایک بچانے والا ہاتھ بھی ساتھ تھا۔ کوئی غیریت نہ اپنے جسم میں تھی، نہ موج میں، نہ سمندر میں۔ یہ احساس قبلہ کو آج بھی ہے۔ جیسے ساری کی ساری زندگی، سب کچھ، ایک ہی تموّجِ حیات ہے۔ ایک ہی بحرِ حقیقت کا قطرہ یہ انسان بھی ہے۔ سمٹے تو قطرہ ہے پھیلے تو سمندر ہے یہ بھی ایک پُرلطف بات ہے کہ بڑے ہو کر جب یوں ہی کسی جوتشی کو ہاتھ دکھایا تھا تو اُس نے زائچہ نکال کر یہ بتایا تھا کہ تم ضرور ڈوبے ہو گے مگر بچ گئے ہو گے۔

قبلہ درانی صاحب کی پیدائش سے آنکھوں میں ایک چمک آئی تھی۔ پلک مارتے تو آنکھوں کے کونے جگنو کی طرح چمکتے۔ والد صاحب نے بھی فرمایا تھا کہ قسمت والا ہو گا، مشہور ہو گا۔ بچپن دادی صاحبہ کے ساتھ گزارا۔ دادی کے پاس ہی سوتے تھے۔ دادی کے انتقال کے بعد ایک خاموشی سی لگ گئی۔ بچپن میں ہی کچھ خاموشی طبیعت میں رہی۔ بچوں سے نہ تو کبھی لڑتے، نہ ان کو مارتے، نہ اگر وہ مارتے تو کسی سے شکایت کرتے۔ ایک خوداعتمادی کی شانِ بے نیازی میں یہ دن چڑھ رہے تھے۔

اسی بچپن کے زمانے میں ایک دو سالہ بچہ کی دیکھ بھال میں خاص دلچسپی لیتے رہے اس کا باپ اس بچہ اور اس کی ماں کو بے آسرا چھوڑ کر چل دیا تھا۔ یتیمی کی سی حالت میں یہ چھوٹا بچہ کس کا سہارا ڈھونڈتا۔ گھر کے لوگ اپنے اپنے کاموں میں مشغول رہتے تو اس

بچہ کی تنہائی کو وہی محسوس کر سکتا تھا جو خود ازلی تنہائیوں سے آشنا ہو۔ قبلہ درّانی صاحب کی ذات میں اس بچہ کو ایک شفیق ساتھی بھی مل گیا تھا اور بڑا بھائی بھی۔ قبلہ کی خود اپنی پرورش اور بیماریوں کے زمانے میں دیکھ بھال ان کی بڑی بہن صاحبہ مطہر النساء نے اس دردِ دل سے کی کہ ان کو قبلہ اماں کے لقب سے یاد کرتے ہیں۔ دوسروں کے لئے وہ بڑی بوجان کے نام سے اب بھی پکاری جاتی ہیں۔ عبادت، ریاضت، نذر نیاز سے اب بھی دلچسپی رکھتی ہیں۔ اور خلوص و محبت کی تصویر ہیں۔ یہی حال قبلہ کے تمام بھائیوں اور بہنوں کا ہے۔ سب ہی محبت والے، پُرخلوص، ایک عظیم خاندان کی یادگار ہیں۔ نمازی، پرہیزگار، پارسا۔ دنیا کے کاموں میں بھی یدِطولیٰ رکھنے والے۔ دین دنیا کو توازن میں لئے زندگی گزارنے والے۔

کھانے پینے سے قبلہ کو زیادہ شوق نہ تھا لیکن خصوصیت ضرور تھی ان کی پسند اور فرمائش میں۔ چنانچہ سادہ چاول کی جگہ پلاؤ پسند تھا اور آم کا شوق کبھی کبھی یہ صورت بھی اختیار کرتا کہ رات کو ایک بجے آپا سے منگوا کر تھوڑا سا کھا لیتے۔ عام طور سے کھانے میں ایک ہی چیز کھانا پسند کرتے اور یہی شعار تمام زندگی اپنایا۔

ابتدائی تعلیم اُن شہروں میں حاصل کی جہاں والد صاحب کا تبادلہ ہوتا رہا۔ اس زمانہ میں ہی دستکاری کا شوق تھا۔ بجائے بچوں کے ساتھ کھیل کود میں وقت گزارنے کے تنہائی میں کارپینٹری کے سامان اور سائنس کے مشغلوں میں وقت گزرتا۔ میٹرک رسول گنڈہ سے کیا اور اعلیٰ تعلیم کے لئے علی گڑھ بھیج دیئے گئے۔ علی گڑھ کی مشہور فرسٹ ایر فُول والی ایکٹیویٹی کا ذکر کئے بغیر علی گڑھ سے روشناسی بھی مکمل نہیں ہوتی۔ ہر نئے طالب علم کو اس سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔ علی گڑھ کی یہ برسوں سے رسم چلی آرہی تھی۔ قبلہ بھی اب اس کا لطف لے کر یوں بیان کرتے ہیں کہ اپریل کا مہینہ تھا۔ زیرِ آسمان سو رہا تھا رسم یہ ہوتی ہے کہ گھڑے میں پانی بھر کر دو آدمی سوتے ہوئے نئے طالب علم کے سینہ پر رکھتے ہیں اور تیسرا آدمی ہاکی سے گھڑا توڑتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی قبلہ کے ساتھ کیا گیا۔ مگر قبلہ کی اُس زمانہ میں اتنی گہری نیند ہوتی تھی کہ کوئی خبر نہیں ہوئی۔ وہ لوگ تو گھڑا توڑ کر بھاگ کر چھُپ گئے اور غالباً یہ سمجھے کہ شرم کے مارے یہ نیا طالب علم حرکت نہیں کر رہا ہے قبلہ کو اس پانی کا علم اس وقت ہوا جب صبح کو ٹھنڈ لگی اور اپنا بستر پانی سے تر پایا۔ کہاں تو اتنی گہری نیند کا عالم کہ ایسی صحت اور دماغی سکون پر انسان رشک کرے اور کہاں اسی فرسٹ ایر کی طالب علمی کے زمانہ میں جو نظر کسی حُسنِ ازلی پر پڑی تو حال یہ ہوا کہ نیند غائب گھر سے کالج آتے جاتے گرلز کالج کے بھی ٹانگے گزرا کرتے تھے۔ ایک دن یہ حسب معمول کالج جا رہے تھے۔ نہ کوئی کوشش تھی نہ اس طرف دھیان تھا۔ تانگے گزرنا معمول تھا

آج جو ایک تانگہ گزرا اور ہوا کے جھونکے نے جو چند لمحوں کے لئے پردہ اٹھایا تو بس جیسے ایک برقِ نظر، برق تجلی سی گری۔ اسی ایک جھلک کا تصور ذہن پر جم گیا۔ بھوک، نیند سب غائب ہوگئی۔ ایک اذیت ناک خاموشی طاری ہوگی۔ دیکھنے والوں نے بیماری گردانا۔ نیند لانے کے لئے ڈاکٹر مارفیا کے انجکشن دیتے اس کے علاوہ دوسری دوا اس زمانہ میں رائج نہ تھی۔ ان انجکشنوں کے زیر اثر صبح کو اگر غنودگی بھی آتی تھی آنکھیں بند ہوتی تھیں مگر حِس اتنی تیز اس حالت میں بھی رہتی تھی کہ دور سے کسی آنے والے کی چاپ سنتے تو بتلا دیتے تھے کہ فلاں آرہا ہے۔ اسی زمانہ میں یار دوست پکڑ کے ہردوار لے گئے وہاں ایک مہنت نے سونے کا آسن سکھایا۔ یہ ایک قسم کا یوگا کہہ لیجئے یا اپنے کو ہپناٹائز کرنا۔ مگر اس مشق نے یہ سہولت ضرور کر دی کہ جب بھی چاہیں اپنے پر نیند طاری کر سکتے ہیں۔ خواہ پانچ منٹ کے لئے ہو یا آدھ گھنٹہ کے لئے۔ چنانچہ اس طریقہ کو سیکھ کر قبلہ اپنے ساتھیوں کو بھی اپنے اوپر نیند طاری کر لینے کا مشاہدہ کرایا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ سڑک کے کنارے یا کنکریوں تک پر لیٹ کر اپنے اوپر نیند طاری کر لیتے اور اسی طریقہ سے ۔۔۔ بعد کی زندگی میں سخت سے سخت تھکن کے عالم میں بجائے انجکشنوں کے قبلہ نے یہی طریقہ اختیار کیا۔

یہ شوقِ تجربہ اور تجسس قبلہ کی زندگی کا سرمایہ بنا ہوا ہے۔ طالب علمی کے زمانہ میں ہی ایجادات واختراعات کا شوق۔ پھر اس میں اتنا انہماک کہ گھنٹوں ایسے تجربات یا چھوٹی چھوٹی ایجادات میں لگے رہنا، ایک اندرونی اضطراب اور محرک نمودِ حیات کی عکاسی تھی۔

علی گڑھ میں ہی قبلہ کو ڈی این ملک ڈی ایس سی جیسا معلّم مل گیا جنہوں نے اپنے اس ہونہار شاگرد کی خفیہ صلاحیتوں کو بھانپ لیا اور قبلہ کی دلچسپیوں کا رُخ خالصتہً سائنس کی طرف موڑ دیا۔ علی گڑھ کی تعلیم کے دوران قبلہ نے خدا کی ریاضی مساوات ترتیب دے کر

اپنے استاد ڈاکٹر ملک کو دکھائی تو ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ یہ سب کیا ہے میں تو اسے نہ سائنس سمجھتا ہوں نہ مذہب۔ لیکن قبلہ کو اب بھی یقین ہے کہ انسان حقیقت کا شعور محض ریاضی کی وساطت سے ہی حاصل کر سکتا ہے۔ قبلہ کا کہنا ہے کہ فزیکل اسٹرانامی یا اٹامک فزکس کے عمیق مطالعہ سے انسان بہت کچھ قدرتِ کاملہ کا عرفان کر سکتا ہے اور اس سے بھی کہیں زیادہ خود اپنے جسم میں دیکھے، فزیالوجی کا مطالعہ کرے تو نہ صرف حیرت اور حیرت میں اضافہ ہوتا جائے گا بلکہ ساتھ ساتھ اس کی عاجز عقل بھی، اس سحر آمیز کار فرمائی قدرت میں، کُن کی وُہ نمود دیکھے گی کہ وہ یقین در یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ہاں ہے ایک ذاتِ مُطلق۔ اور یقینی ہے۔

قبلہ کی طالب علمی کے زمانے کے ایک ساتھی کا کہنا ہے کہ میری ملاقات قبلہ سے اس وقت ہوئی جب وہ تھرڈ ایئر کے اسٹوڈنٹ تھے۔ عام طور پر قبلہ کے ساتھ چھٹیوں میں زیادہ وقت گزرتا جس کا سبب دونوں کا موسیقی سے لگاؤ تھا۔ ایک صاحب لپشاور سے حبیب اللہ نامی بھی اکثر آجاتے تھے۔ دن بھر یا تو موسیقی سے شغف ہوتا رہتا یا پھر شطرنج جمی رہتی۔ چولہے پر چاء پکتی رہتی۔ تھوڑی دیر بعد چاء کا دور چلتا رہتا۔ یہ چائے بھی خاص قسم کی تھی جو شروع میں گونیوں کی شکل معلوم ہوتی لیکن دودھ میں پکتے پکتے ہلکی گلابی ہو جاتی اور گولیاں کُھل کر پوری پتیاں بن جاتیں۔ قبلہ کی حالت عام طور پر اس قسم کی رہتی تھی کہ اکثر احباب انہیں سنکی سمجھتے تھے۔ کھوئی کھوئی سی حالت۔ پڑھائی سے بہت کم شغف اور بعض دفعہ کالج جانے کی بجائے کمرہ میں بند ہو کر بیٹھ جاتے۔ گرمی کی چھٹیوں میں گھر جاتے لیکن کافی چھٹیاں باقی رہتیں کہ واپس آجاتے اور زیادہ تر وقت کمرہ میں بیٹھ کر ہی گزارتے۔ فوٹو گرافی، مصوری اور باغبانی سے کافی لگاؤ تھا۔ اُسی زمانہ میں

ایک تصویر بنائی تھی جس میں دل کھلا ہوا دکھایا تھا اور دل کے اندر ایک شمع روشن تھی۔ پہلو میں غالب کا ایک شعر تحریر تھا ؎

اک نو بہارِ ناز کو تاکے ہے پھر نگاہ
چہرہ فروغِ مے سے گلستاں کئے ہوئے

قبلہ کے اکثر فعل عام لوگوں سے بالکل علٰحدہ تھے۔ وہ محویت کا عالم۔ گمشدنی سی حالت اکثر طاری ہو جاتی جیسے اس جسمانی زندگی کے ساتھ ساتھ کسی دوسری سطح پر بھی زندگی گزر رہی تھی اور وہی اصل زندگی تھی اور یہ ظاہر کی زندگی سب ایک کھیل، ایک دکھاوے کی بات۔ ایک دن جون کی سخت گرمی میں دوپہر کے بارہ بجے شطرنج کھیلنے کے دوران کہنے لگے "چلو یار ایک جگہ چلتے ہیں"۔ اُن صاحب نے کہا بھی کہ اس گرمی میں؟ کہنے لگے بس چلے آؤ۔ چنانچہ دونوں چل دیئے۔ چلتے چلتے جنگل میں کچے قلعے پہنچ گئے۔ دس قدم آگے قبلہ اور پیچھے پیچھے یہ صاحب۔ قلعہ پہنچ کر قبلہ کھائی میں اتر گئے۔ اُن صاحب کو بھی اُترنا پڑا اُن کی حالت گرمی، حبس اور کھائی کے گرم پانی کی وجہ سے ابتر سی ہونے لگی۔ قریب سے کبھی کوئی سانپ نکل جاتا اور کبھی کوئی چھوٹا جانور۔ محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی غیبی کشش انہیں، قبلہ کے ساتھ کھینچے لئے جا رہی تھی۔ اُس کھائی کی یہ چہل قدمی تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ اس دھوپ اور لُو کی شدت میں جاری رہی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے قبلہ کو کسی خاص چیز کی تلاش تھی۔ تھوڑی دیر بعد کھائی سے نکل کر واپس چل دیئے اور کمرے میں آگئے یہ کمرہ بیونس کے بنگلے کے ایک کونے میں تھا جو ظہور وارڈ کے ڈائننگ ہال سے متصل تھا تمام سفر کے دوران قبلہ نے کوئی بات نہ کی۔ واپس پہنچ کر چائے پی گئی اور پھر سے شطرنج شروع ہو گئی۔

قبلہ کی یہ مجنونانہ کیفیت کچھ بڑھتی ہی گئی۔ یہاں تک کہ بی۔ ایس۔ سی کا امتحان احباب نے بڑی ضد اور زبردستی کر کے دلوایا۔ بی۔ ایس۔ سی کر کے قبلہ نے کچھ ایجادات گورنمنٹ آف انڈیا کو پیش کیں اور وہ اعلیٰ تعلیم کے لئے انگلستان بھیج دیئے گئے۔ ۱۹۳۸ء میں اُن صاحب کی قبلہ سے پھر ملاقات ہوئی۔ بہت خوش ہوئے اور فرمایا اچھا ہوا تم مل گئے اب ہم مل کر انجینئرنگ کالج بنائیں گے۔ ان صاحب نے کوئی توجہ نہ دی؛ مگر تقریباً ہر ملاقات میں کالج کا ہی ذکر ہوتا تھا اور قبلہ اصرار کرتے کہ سرکاری ملازمت ملکھنؤ والی چھوڑ دو اور قوم کی خدمت پر کمربستہ ہو جاؤ۔ وہ صاحب شروع شروع میں ٹوٹالتے رہے مگر بعد میں اس نیک مقصد کے لئے بیعت کر لی۔ ابتدائی مراحل میں پریشانیاں اٹھانی پڑیں لیکن رفتہ رفتہ امیدیں بندھتی گئیں اور بالآخر ڈیپارٹمنٹ آف ٹیکنالوجی قائم ہوا جو رفتہ رفتہ بڑھ کر کالج آف انجینئرنگ کہلایا۔ ایک اور صاحب پرنسپل مقرر ہوئے۔ ان کا برتاؤ قبلہ اور ان صاحب سے بہت بُرا تھا اور ایک مرتبہ تو بات اتنی بڑھی کہ ان صاحب نے قبلہ سے کہا کہ میں اب زیادہ برداشت نہیں کر سکتا۔ قبلہ نے فرمایا قوم کی خدمت قربانیاں چاہتی ہے۔ میں ان بداخلاقیوں کے باوجود خوش ہوں کہ جو پودا ہم نے لگایا ہے وہ پروان چڑھ رہا ہے اور آگے چل کر تناور درخت بن جائے گا۔ پھر نئے پرنسپل عبدالرحمٰن آئے۔ کچھ عرصہ بعد وہ بھی چلے گئے۔ اس کے بعد ایک قابل انگریز ٹی۔ ایچ۔ مستھیوملی پرنسپل ہوئے اب وہ پودا، تناور درخت بن چکا تھا۔ گورنمنٹ آف انڈیا سے سندات دینے کی منظوری مل چکی تھی۔

اس زمانہ میں قبلہ کی ساری تنخواہ، ان صاحب کی تحویل میں رہتی تھی اور یہ ان کی ہدایات کے مطابق اس میں سے خرچ کرتے رہتے تھے۔ انہیں اچھی طرح یاد ہے کہ تنخواہ

کا آدھے سے بھی کم حصہ، قبلہ کی اپنی ذات پر خرچ ہوتا تھا اور باقی حصہ امداد پر خرچ ہوتا تھا
اس سارے زمانے میں قبلہ پر ایک عجیب کیفیت طاری رہتی تھی۔ وہ اپنے ماحول اور لباس
وغیرہ سے قطعاً بے پرواہ نظر آتے تھے۔ اور اکثر ٹوک کر لباس تبدیل کرایا جاتا تھا۔ ایک
دن ان صاحب نے "تذکرۃ" کہا کہ آپ فلاں شخص کی امداد کرتے ہیں جو عقائد کے لحاظ سے
دہریہ ہے۔ فرمانے لگے۔ میں جانتا ہوں لیکن اگر تم کھانا کھا رہے ہو اور کوئی بھوکا کتا
تمہارے سامنے آکر بیٹھ جائے تو تم کیا کروگے۔ ان صاحب نے کہا کہ اگر کھانا باقی ہے
تو ایک ٹکڑا اس کو بھی ڈال دوں گا۔ اس پر فرمانے لگے کہ پھر وہ تو انسان ہے اور کتے سے
افضل ہے۔

اس زمانے میں قبلہ نے خاکسار تحریک میں بھی نمایاں حصہ لیا اور جب خاکسار برسر
پیکار تھے تو اکثر رات کو قبلہ کے یہاں قیام کرتے اور دوسرے دن آگے روانہ ہوتے۔
ہومیوپیتھی کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ قرب وجوار میں جاکر مفت دوائیں تقسیم کرتے۔ گھر
پر بھی شام کو مریضوں کا ہجوم رہتا تھا۔ کوٹھی پر اکثر موسیقی کی محفلیں منعقد ہوتیں۔ ایک
مرتبہ تو بہت ہی مشہور ستار نواز تشریف لائے۔ کھانے کے بعد قبلہ نے اُن سے فرمائش
کی۔ سوال یہ تھا کہ طبلے پر سنگت کون کرے گا۔ ان صاحب سے فرمایا۔ لو طبلے سنبھالو
وہ عرض کرنے لگے کہ میں بے استاد۔ آخر اتنے بڑے استاد کا ساتھ کیسے دے سکوں
گا۔ فرمایا "بسم اللہ کرو"۔ ساز چھڑے اور ایسا رنگ جما کہ وہ صاحب آج تک حیران ہیں
کبھی کبھی قوالیوں کی محفل بھی ان صاحب کے ہاں جمتی جس میں قبلہ ہمیشہ شریک ہوتے اور
جب تک قوالی ہوتی رہتی سر جھکائے استغراق میں رہتے۔

علی گڑھ میں ایک نیم پاگل کے ساتھ قبلہ کا چھ ماہ ساتھ رہا۔ اُس نے علی گڑھ کی

تمام لائبریریاں چھان کر ایک بڑی سی کتاب لکھ ڈالی تھی جس میں پردہ کے رواج اور بے پردگی کا تعلق قوموں کے عروج و زوال کے ساتھ ثابت کیا تھا۔ ایک دن یہ شخص غسل خانہ میں گنگنا رہا تھا۔ قبلہ نے اُس سے کہا کہ گانا سناؤ۔ وہ راضی ہوا۔ دونوں آبادی سے دُور ایک اجاڑ میدان میں چلے گئے۔ ایک مُنڈیر پر بیٹھ کر اُس نے راگ الاپا۔ بارش کے موسم میں۔ سورج غروب ہونے کا وقت، وہ شفق کی خوں افشانی، حساس روحوں کے لئے ایک وجدانی حالت، ایک جسم وجان میں اضطرابی کیفیت پیدا کرنے کے لئے خود ہی کیا کم تھی۔ اس شخص نے مغرب کی جانب اس مسحُور کن فضا کی طرف رُخ کر کے، مالکوس کا الاپ شروع کیا۔ صرف ساز۔ اور اس عالم میں بجاتا رہا بجاتا ہی رہا۔ قلب و روح کے چشمے اُبل پڑے۔ آنکھیں بند۔ ماحول اور وقت سے بھی بے نیازی۔ زمان، مکان کی بندشوں سے آزادی۔ بہت دیر بعد یہ ساز رکا۔ اندھیرا چھا چکا تھا۔ اسی مدہوشی کے عالم میں دونوں گھر واپس لوٹے۔ اس شخص کی تو یہ کیفیت ہوئی کہ گھر آکر خون اُگلنے لگا اور قبلہ کی یہ حالت کہ جیسے اس تمام راگ، اس تمام الاپ میں سے خود گزرے ہوں۔ وہ تخلیق کائنات سے پہلے جو تخلیق کی تکلیف تھی یا جیسے ماں بچہ جننے سے پہلے ایک تکلیف سے گزرتی ہے۔ پھر اس کے بعد ایک نظامِ حیات کا آنا۔ زندگی کی نمود۔ نغمۂ حیات کی سحر آفرینی۔ حُسنِ ازلی کی پردہ کشائی۔ قبلہ کا کہنا ہے کہ یہ چیز میں نے اُس پاگل سے محسوس کی۔ خود اس کیفیت میں سے گزر کر۔ یوں تان سین کی بابت بہت کچھ مشہور تھا۔ بہت کچھ کرتا تھا۔ مگر یہ تخلیق اوّل تک رسائی، وہ کن۔ وہ اس کی پہلی نمود اور اس کیفیت میں ہو کر قبلہ کا ہی کہنا ہے کہ اس میں سے گزر کر میں یہی کہہ سکتا ہوں کہ یہ غم کی کیفیت تھی۔ دُکھ درد کی نہیں بلکہ غم کی۔ وہ غم ماں کی ممتا کی طرح۔ عالم گیر غم۔ اس غم کے گہرائیوں میں جیسے قبلہ کی روح فطری طور سے بیدار تھی تھی

قبلہ سائنس کے طالب علم تھے مگر میکینکس کی کتاب کے سرورق پر میرؔ کا ایک شعر درج تھا وہ یہ تھا

غم کے ٹھوکے کچھ ہوں بلا سے آ کے جگا تو جاتے ہیں
ہم ہیں مگر وہ نیند کے ماتے جاگتے ہی سو جاتے ہیں

یہ کتاب ولایت تعلیم حاصل کرنے کے زمانے میں قبلہ کے ساتھ رہی۔ لاشعوری طور پر اس لئے بھی کہ غم سے یہ ازلی نسبت اس شعر کے ذریعہ تازہ ہوتی رہے۔

غالبؔ کی شاعری سے قبلہ کو خصوصی لگاؤ تھا۔ اردو بہت کم آتی تھی اس لئے بسا اوقات دوسروں سے معنی پوچھتے اور اشعار گنگناتے رہتے۔ یہ شوق رفتہ رفتہ اتنا بڑھا کہ غالبؔ کا انگریزی میں ترجمہ کرنے کا سوچا۔ اس کا بیشتر حصہ انگلستان کی تعلیم کے زمانہ میں لکھا گیا۔ یہ ترجمہ ابوالخیر کشفی صاحب کو نظر ثانی کے لئے دیا گیا۔ مگر تقسیمِ ہند اور قبلہ کی بیماری۔ لوگوں کے نقلِ وطن اور اس پُر آشوب زمانہ میں کہیں ضائع ہو گیا۔ قبلہ کا فرمانا ہے کہ غالبؔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کا وہ آنسو تھا جسے حیات و موت کی برزخ کہہ لیں۔ غالب کی ہستی میں مغلیہ دور سمٹ کر جمع ہو گیا تھا اور اس کا مقام قلب اور روح کے درمیان ایک برزخ تھا۔

قبلہ کو اللہ نے ایک صحت مند جسم اور بیدار روح عطا کی تھی جو پوری زندگی کو ایک کُلی توحیدی انداز میں مصروفِ عمل رکھتی۔ دورخی یا منتشر شخصیت کی اس فطری سادگی میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ جو کچھ اندر تھا وہی باہر۔ بچہ کی طرح ایک کھُلی کتاب۔ کسی قسم کی دوئی سے نا آشنا اور یہی تابندگی تمام آئندہ زندگی کو بھی احاطہ کئے رہی جس کا اظہار دیکھنے والوں نے ہمیشہ قبلہ کی آنکھوں کی چمک میں پایا۔ جیسے کائنات کی ہر لطافت ان ہی آنکھوں میں سما گئی ہو۔

اس کم عمری کے زمانے میں ہی قبلہ نے ایک ایسا ڈبہ ایجاد کیا تھا جسے اگر چور کھولنے کی کوشش کرتا تو اس کے ہتھکڑی لگ جاتی اور اٹھا کر بھاگنے کی کوشش کرتا تو ڈبہ میں سے مرچیں نکل کر اس کی آنکھوں میں پڑ جاتیں۔

علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں ریڈیو اور برقیات پر برابر تجربے کرتے رہتے اس میں پروفیسر خلیل مراد صاحب مرحوم نے کافی ہمت افزائی بھی کی تھی اور خود اپنی بنائی ہوئی چیزیں دکھا کر طلبا میں یہ شوق پیدا کیا تھا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ قبلہ کے فطری جذبہ تجسس و تحقیق کو اور تازیانہ ملا۔ اسی زمانہ میں قبلہ کو ایجادات کا شوق ہوا اور کئی تجربوں میں اصلاحی طریقۂ کار کر کے دکھایا جس پر لکھنؤ یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور ماہر طبیعات ڈاکٹر ولی محمدؒ سے بارہا تحسین حاصل کی۔

قبلہ کی ایک ممتاز اختراع وہ جادوئی ڈبہ تھا جس میں چابی نہ تھی اور کسی خاص فرد یا اُس کے گھر کے کسی شخص کی آواز پر کھُلتا تھا۔ اس ایجاد پر گورنمنٹ آف انڈیا نے انہیں پانچ سال کی سکالرشپ دی اور شیفیلڈ سے انہوں نے الیکٹریکل انجینئرنگ کا امتحان پاس کیا۔ پھر انگلستان میں دو سال انگلش الیکٹرک کمپنی اسٹیفرڈ میں فنی تجربہ اور ٹریننگ حاصل کی۔ مالاکنڈ ہائیڈرو الیکٹرک اسکیم اسی زمانہ میں بنی تھی اور قبلہ نے بھی اُس پر کام کیا تھا۔ آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ موٹروں کے سگنل ان ہی دُرانی صاحب کی اختراع ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب وہ شیفیلڈ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ اسی اختراع کی بنیاد پر انگلینڈ میں موجودہ سگنل وضع کئے گئے۔ سروے کے بعض آلات بھی اسی زمانے میں قبلہ دُرانی صاحب نے وضع کئے۔

ولایت کی زندگی کی بابت قبلہ کے تاثرات یہ تھے کہ ابتداء میں تو بڑی کربناک تنہائی

محسوس کرتا رہا لیکن بالآخر اس تنہائی کو ختم کرنے کے لئے موسیقی اور آرٹ میں پناہ لی اپنے ہاتھ سے ستار بھی بنائے اور اس طرح حضرت امیر خسرو ان کے رگ و پے میں بس گئے خسرو کے وہ اندرونی سوز، اور باہر وہ شوخی وہ سادگی وہ زندگی کی دمک کہ ظاہر بیں نگاہیں اس غم کی گہرائیوں کو کیا پاتیں جو غم جاناں بنا ہوا تھا۔ اسی سوز کی بابت حضرت نظام الدین اولیاء نے فرمایا تھا کہ کاش مجھے خسرو کا سوز مل جائے اور میری ساری ولائتیں خسرو کو عطا ہو جائیں۔ قبلہ نے خسرو کے اس سوز کو ایسا اپنایا کہ یہ مشغلہ آگے چل کر ان کی شخصیت کا ایک اہم جزو بن گیا۔ ہندوستان واپس آئے تو اکثر آل انڈیا موسیقی مقابلوں اور فنی نمائشوں میں قبلہ کو جج بنایا جاتا رہا اور یہی کچھ پشاور میں ہوا کہ انجینئرنگ اور سائنسی مقابلوں کے علاوہ موسیقی، فنی نمائش، پینٹنگ اور بحث مباحثوں میں اسی ذوق کی بنا پر جائزہ ہوتی رہی۔

علی گڑھ آنے سے قبل ہی جب میٹرک کے طالب علم تھے تو بزرگوں اور نبی کریمؐ کی سوانح حیات میں دلچسپی اس درجہ بڑھی کہ باطن کی دنیا پلٹ گئی۔ ظاہر میں علم، تعلیم، دنیا کے کاموں میں گھرے ہوئے اور باطن میں ایک حساس دل، ایک روحانی اضطراب، ایک ہیجان کا عالم۔ سوزِ دروں بڑھتا ہی گیا۔ کائنات کی حقیقت، اپنی حقیقت کی تلاش کا جذبہ وہ شدت اختیار کر گیا کہ دینی مجلسوں میں یا ہندوؤں کے مذہبی جلسوں میں بھی شامل ہو جاتے یا پھر اکثر تنہا بیٹھ کر خاموشی کے عالم میں سوچا کرتے۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ آنکھوں میں وہ گہرائی پیدا ہو چکی تھی جو ایک غواصِ حقیقت کو عطا ہوتی ہے۔ علی گڑھ کی طالب علمی کے زمانے میں یہ کیفیت اکثر و بیشتر رہتی۔ پھر اس پر ایک سائنسی تحقیق و تجسس کا قدرتی شوق، جہاں آفاق کے عالم میں، علوم ظواہر کے تجربے یا اعمالِ ظاہر کی مشق ہو رہی تھی۔

وہاں انفس کے عالم میں، اپنی خودی کی پہچان اپنی باطنی صلاحیتوں کے عرفان کا شوق، طرح
طرح سے پورا کرنا چاہا۔ جس کی زندگی ایک تیز دھارے پر بہہ رہی ہو یا بال سے زیادہ باریک
پُل صراط پر سے گزر رہی ہو اسے یہ بھی ہوش کہاں ہو سکتا ہے کہ اپنے ان باطنی تجربات کو
بیان میں لائے یا دوسروں کو سمجھا سکے۔ مثلاً یہ دیکھنے کے لئے کہ حواسِ خمسہ کو کہاں تک دبا
سکتا ہوں آٹھ آٹھ روز تک کھانا نہ کھاتے۔ غالباً طبیعت کی یہ شدت اُس جذب اور عشق
کو پھوٹ پڑنے کے لئے مجبور کر رہی تھی جس کو اب تک راہ نہ ملی تھی۔

کچھ ایسی ہی شدتوں کی بات تھی جسے روح کی بے قراری کو راہ نہ ملنا کہہ لیں یا ناکامیِ عشق
کہہ لیں، یا روح کی حاکمیت عالمِ اجساد پر ثابت کرنا کہہ لیں کہ ایک دن سائنس لیبارٹری سے
کافی مقدار میں پوٹاسیم سائنائڈ ہتھیلی پر رکھ کر پھانک لیا۔ سائنسی اور ڈاکٹری دنیا کا اسے
کرشمہ ہی کہہ لیں کہ آج تک وہ زہر اس جسم پر اثر نہ کر سکا۔

تاج بابا کے پاس جب ناگپور پہنچے تو فرمایا "ارے کیا اس دنیا میں اپنی مرضی سے
آیا تھا جو سمجھتا ہے کہ اپنی مرضی سے یہ دنیا چھوڑ سکتا ہے"۔ قبضۂ قدرت میں اپنی زندگی اور
وجود کے ہونے پر اس طرح ان مبارک ہستیوں کے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے جو کسی کے
دامن سے منسلک ہوں"۔

یہ اور اسی قسم کے بہت سے واقعات میں سے جب انسان اپنی روح اور جسم کو
صحیح و سالم لے کر گزر آتا ہے۔ تب ہی وہ مقامِ روح میں قدم رکھنے کا حقدار ہوتا ہے۔
حیات اور موت کے چکروں سے نکل چکا ہوتا ہے۔ ایک موت ہی کیا، لگاتار موتیں۔ ایک
زندگی ہی کیا، لگاتار زندگی کے رازوں سے آشنا ہو کر ہی انسان حقیقت کے میدان
میں قدم رکھنے کا اہل ہوتا ہے۔

باطنی دنیا میں یہ ہیجان برپا تھا اور ظاہر کی دنیا میں وہی شوخی، سادگی، زندگی کی اُٹھان۔ شکار کا شوق ہوا تو اکثر ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے ساتھ شکار پر جایا کرتے۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس جرمنی کی بنی ہوئی ہیر ٹریگر والی بڑی نفیس رائفل تھی جو قبلہ کو دے دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ نیل گائے کے شکار پر گئے۔ ایک گھنی جھاڑی کے کنارے پر جب قبلہ مُڑے تو دیکھا کہ بمشکل آٹھ دس گز پر ایک نر نیل گائے سامنے کھڑا ہے۔ اُس کے حُسن کا اتنا رعب پڑا کہ قبلہ تکتے ہی رہ گئے۔ کہاں کی رائفل، کہاں کا شکار۔ جب حُسنِ ازلی اپنے چہرہ سے نقاب ہٹا لے تو دید کی مجال کہاں رہتی ہے۔ نازک اور حساس دل کائنات کی ان ہی لطافتوں اور حسین لمحوں میں حُسنِ ازلی کا عرفان کرتے ہیں۔

اسی لڑکپن اور جوانی کے زمانے میں شکار میں ایک بار یوں ہوا کہ بھوپال کے جنگل میں ایک ہرنی شکار کی۔ جب ذبح کرنے کے لئے لوگ پہنچے تو ہرنی کے تھنوں سے دودھ بہہ رہا تھا۔ یہ دیکھ کر قبلہ کا حساس دل لرز اٹھا۔ وہ بچہ۔ وہ ماں۔ اس لئے وہ دن اور آج کا دن پھر نہ شکار کو ہاتھ لگایا، نہ دوسرے کا شکار کرنا پسند کیا۔

اسی لڑکپن کے زمانے سے تمام عمر، خود ہاتھوں سے کام کرنے اور ہنر سیکھنے کا شوق ایسا چڑھا کہ جوتوں کی مرمت، جلد سازی، تالے بنانا، کارپینٹری، بجلی کے سامانوں کی درستگی، مشینوں کی درستگی میں ہمیشہ اپنے کو مشغول رکھا۔ اسی شوقِ انہماک میں ایجادات اور اختراعات میں دلچسپی ہمیشہ قائم رکھی۔ دل بہ یار دست بہ کار کو اپنی روزمرہ زندگی کا اصول بنالیا اور آئندہ زندگی کے ہر دور میں اسی اصول پر اپنے فقر کی بنیاد رکھی۔ اس طرح قلب و روح پر جو وارداتیں گزریں اُن کی شدتوں میں جسم بھی وحدتِ زندگی کا نقشہ بن کر پیش ہوتا رہا۔ جو کام کیا وہ چھک کر کیا۔ قبلہ اب بھی اکثر فرماتے ہیں کہ مرد وہی ہے کہ فقر اندر ہو مگر ہاتھ

میں ہنر ہو تاکہ روزی خود کمائے۔ یہاں تک کہ اعلیٰ علم حاصل کرنے یا پیشہ ورانہ صلاحیتوں میں ید طولیٰ رکھنے کے علاوہ معمولی ہنر آتا ہو تو دو پیسہ کہیں بھی کسی حالت میں کما سکتا ہے؛ اور دوسروں کے کام بھی آسکتا ہے۔ جسم و قلب و روح کے اس جوشِ نمود میں قبلہ کی فطری، باطنی صلاحیتوں کو توحیدی عمل پیرائی کے نئے نئے مواقع ملے۔ باغبانی کا شوق، پینٹنگ کا شوق۔ خدمتِ خلق غریبوں کی دیکھ بھال، مریضوں کو دوا دارو، خاکسار تحریک میں عملی حصہ، بزرگانِ دین سے ملاقاتیں، علمی و ادبی جلسوں میں خصوصی دلچسپی، کتب بینی، تصوف کے مسائل، الغرض روزمرہ زندگی کی ہر ادا کو، اپنی راہِ حقیقت کی تلاش اور وحدتِ حیات میں عمل پیرائی کا ذریعہ بنائے رکھا۔ دین و دنیا کو ایک ہی توحید میں اپنایا۔ اس طرح حقیقت بینی یعنی حقائق پر نظر رکھنا، ہر چیز کے باطن، ہر چیز کے عینِ معنی پر نظر رکھنا عادتِ ثانیہ بن گئی۔ اسلام بھی حقیقت بینی کا سبق دیتا ہے۔ آسمانوں میں خیالی پرواز کرنے کی بجائے ہر چیز کی بنیاد اور اصل پر نگاہ رکھنے کا سبق دیتا ہے تاکہ قدم ہمیشہ زمین میں رہیں اور ہر شے کی بنیاد یا جڑ، زمین میں ہی دیکھنے کی عادت رہے۔

اسلام کا دوسرا سبق جمعیت بندی ہی جانِ اسلام ہے اسی لئے قبلہ نے کبھی تنہا عروج حاصل کرنے یا اعلیٰ مدارج حاصل کرنے کی انفرادیت میں اپنے کو گرفتار نہ کیا بلکہ حسنِ حقیقت کو جمعی وحدت میں اپنانے کی کوشش کی اور اس طرح جمعیت کے رنگ، الخلق عیال اللہ کے انداز کو پاکر ہمیشہ مقصدِ تخلیق سے ہم آہنگی قائم رکھی۔ اسلام کا تیسرا سبق خالق سے رابطے کا طریقہ خدمت خلق ہی تو تھا۔ اس میں اپنی ساری زندگی وقف کر دینے کی ٹھان لی اور چوتھا سبق فروغِ ملت ہمیشہ نصب العین بن کر تازیانہ کا کام دیتا رہا۔

نصب العین فروغ کا حصول اسلامی زندگی کے نصب العین فروغ کے حصول کی صورت میں

ممکن تھا یہ فروغِ حیات ظاہر میں بھی ہے اور باطن میں بھی ۔ اس لئے فتح الدہر اور فتح الغیب ہر مومن کا نصب العین ہوتا ہے قبلہ فرماتے ہیں کہ جس میں جھک کر کام کرنے، اپنی ذاتی صلاحیتوں کو کلی طور پر بروئے کار لانے کی فکر ہے وہی زندہ کہلانے کا مستحق ہے۔ زندگی ہے ہی فروغ کا نام ۔ اور بات کی مسلسل حیاتِ ابدی بھی اس کے ظاہر و باطن کے توازن یعنی توحیدی عمل پیرائی میں ہی پوشیدہ ہے ۔ یہ قوم صرف شیرانہ زندگی گزار کر زندہ رہ سکتی ہے کہ شیرِ نر کا بہترین دفاع اس کا حملہ ہی ہوتا ہے اور وہی اس کی شہنشاہیت کی ضمانت بنتا ہے۔

مردِ حق از کسِ نگیرد رنگ و بُو
مردِ حق از حق بگیرد رنگ و بُو

باب ۳ ناگپور

اسے والدہ صاحبہ کی جانب سے روحانی تربیت کا اثر کہہ لیں یا والد صاحب سے حاصل کردہ اخلاقی دینی تعلیم اور بزرگوں کی داستانوں میں خصوصی دلچسپی، کہ روح کی ازلی تڑپ نے ناگپور باباتاج الدینؒ کے حضور، حاضری دینے کی جانب رجوع کیا۔ کس کیفیت، کس حال میں کسی بزرگ تک پہنچتے ہیں یہ قسمتوں کی بات یوں ہے کہ کسی بزرگ تک رسائی بغیر اس کی اپنی مرضی کے ناممکن ہے۔ متلاشیانِ حق کو حق کی اتنی تلاش کہاں جو خود حق کو ان کے لئے ہوتی ہے اور بات کچھ یوں بھی ہے کہ ایک بڑے متضاطیسی دائرہ اثر میں ایک چھوٹی مقناطیس کا رخ مرکزِ اثر کی جانب ہو جانا، لازمی سا بھی ہوتا ہے۔ شعوری یا لاشعوری طور سے یہ کشش اپنا اثر پیدا کئے بغیر نہیں رہتی۔ یہ کمسن جوانی کے الہڑپن کا زمانہ بھی اپنی ایک حسین معصومیت لئے ہوتا ہے۔ علم ودانش کی بندشوں، عقائد کی ناپ تول، عارضی نفع نقصان کی طلب سے یوں بھی انسان اس زمانہ میں آزاد ہوتا ہے۔ اپنی باطنی صلاحیتیں ایک ہیجانی، جذباتی انداز میں اس وجود سے پھوٹ رہی ہوتی ہیں۔ قدم قدم پر دل کی دھڑکنیں، ایک والہانہ نامعلوم سا شوق، خاکی جسم کے خول کو پھاڑ کر باہر نکل آنے کے لئے بیتاب ہوتا ہے۔ اب کہیں انسان فطرت کے ظاہری باطنی توازن کی میزان بنا ایک مدہوشی کے سے عالم میں قدم رکھ چکا ہوتا ہے ایک پُل صراط، بال سے باریک راستے پر زندگی کا سفر ہوتا ہے۔ وجود کی نفسانی خواہشات نے اگر اس فطری بیتابی پر قابو پالیا تو عقل وجسم کی سطح پر تسکین پا کر گہرائیوں کے علم

میں جا گرتا ہے اور اگر روح کی فطری بے تابیوں کو عروج کی راہ ملی تو جسم کی خواہشات فنا ہو کر اس الطف حالت میں یہ پُل صراط بھی پار ہو جاتی ہے۔ وجود کی بندشوں اور خواہشات کے بوجھ سے، جس ذرہ کو اپنے جذبات کی مدہوشی میں نجات ملی وہ کھنچ کر مقناطیس سے جا ملتا ہے۔

ناگپوریوں تو بہت سے پہنچے اور اس گنج العلوم سے بے فیض بھی کوئی نہیں گیا اس باطنی ماحول کی جلالی شان کی داستانیں تو ہزاروں ہیں۔ سمجھ اپنی اپنی، ہوش اپنا اپنا، دل اپنا اپنا، ایمان اپنا اپنا۔ مگر کچھ ایسے بھی تو ہوں گے جو ایک ناگ کاٹے کا سا نشہ لے کر پہنچے۔ یہ کیفیت اسی سے پوچھیے جسے عشق کے ناگ نے کاٹ لیا ہو۔ ایک میٹھا میٹھا نشہ مدہوشی در مدہوشی کا عالم۔ زیست اور موت کی برزخ۔ جو اس لذت سے نا آشنا ہو وہ کیا جانے کہ ناگپور کے ناگ کا روپ کیا تھا۔ اور کس طرح یہ امت کے درد کا زہر اپنے وجود میں جذب کر کے تریاق بنا دیا جاتا ہے جہاں فرد کی چلّہ کشی کے لئے چالیس دن سے چالیس سال تک کا عرصہ کچھ نہیں ہوتا وہاں امت کی ارتقائی منازل کیلئے ہزار سال بھی تھوڑے ہوتے ہیں۔ اسی لئے انقلابی طریقہ سے بھی قوم کی حیاتِ نو کے لئے کم از کم اس کا ہزار واں حصہ تو ضرور درکار ہے۔ اس لئے جلد ہی زمانہ دیکھ لے گا کہ اس دنیاوی مار گزیدہ امت کو یہ باطنی تریاق، کن کن وسیلوں سے پہنچا دینے کا انتظام کیا جا چکا ہے۔

اس امت کی شفایابی کے لئے انقلابی طریقہ کی بھی ضرورت ہے اور ارتقائی کی بھی۔ انقلابی طریقہ سے عقل و ہوش کی رکاوٹوں اور توہمات کو دور کیا جاتا ہے تو ارتقاء کی دھیمی چال سے باطنی اصلاح کی جاتی ہے۔ اس طرح شجرِ مبارک کی آبیاری دونوں پہلوؤں سے کرنا فقراء کا کام رہا ہے۔ قومی انحطاط اور بے لبسی کے زمانے میں، انقلاب

کے بغیر کام نہیں بنتا۔ جب ایک روحانی آتش فشاں ظہور میں آتا ہے تو مردہ مٹی کے ڈھیر کے اندر کے جذبات بھی پھٹ پڑتے ہیں جو سب غیر اللہ کو بھسم کرڈالتے ہیں۔ اب یہی زمین روحُ کی کاشت کے لئے زرخیز ہوجاتی ہے۔ روئی سے حسد، غصہ، لالچ، خواہش نفسانی کے چار بنولے نکال کر جب اپنے وجود کو روئی کی طرح دھنکا جاتا ہے تو تو ُہی تو ُ، اللہ ہُو کی ضرب سے ساری گتھیاں عقل و دانش کی سُلجھ جاتی ہیں۔ اب یہ دُھنکی ہوئی رُوئی کہیں جمیعت کے انداز میں تاگہ بٹنے کے کام آتی ہے۔ پھر ایک ایک ڈورا اپنی انفرادیت کا ایک ہی حبل اللہ میں ضم کر دیا جاتا ہے۔

اس طرح یہ مجذوبین، باطنی نظام کے مؤکل بن کر وہ کام کرتے ہیں کہ عقل و دانش خیرہ ہوجاتے ہیں۔ یہ جذب اپنے اندر غرق ہونا ہے۔ غرق ہونا آسان نہیں۔ لاکھوں میں ایک، وہ بھی صرف اللہ کے فضل سے۔ یہ انفاس کا راستہ ہے۔ من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ۔ اسی لئے مجذوب کی صحبت میں برابر اللہ کا خیال رہتا ہے۔ مجذوب سب سے کٹ کر اللہ کی ذات کو اپنائے ہوتا ہے۔ خود اسم اللہ جسم فقیر کا مصداق ہوتا ہے کیونکہ العشقُ جذبۃٌ من جذبات الحق (عشق ایک جذبہ ہے اللہ کے جذبوں سے)۔ جب کسی کو نگاہِ بصیرت مل جاتی ہے تب ہی اس کی نظر ظاہری پردوں کو چاک کر کے کسی ہستی میں حُسنِ مجرّد کی جھلکیاں دیکھ سکتی ہے۔ بابا تاج الدینؒ کا ظاہری روپ وہ پیشانی کی چمک نورٌ علیٰ نور وہ نشستِ جسم قدسی، سراپا رحل و قرآن۔ وہ جسم پر برص کے نشان امت کے جذام کی نشانی یہ ہے وحدت الوجود کی تصویر بالشہود۔ جانِ من جانِ عالم کا سراپا وہ جلال کو جمال میں جذب کر کے جمال میں ڈھالنا قدوسیتِ لازوال کی نشانی بنا کر جب بابا صاحب کی آنکھوں میں سمٹ آئی تو جدھر نظر ڈالی اندھیرے اجالے ہوگئے

خلقت کے کام صرف ایک نظر کے ذریعہ ہونے لگے ۔ وہ نظر کیا تھی، اک ننگی تلوار ۔ اک برق رعداں ۔ پھر یہ ظاہر بیں نگاہوں سے پردہ کس لئے ۔ وجہ یہ ہے کہ حق پردے میں ہے اور ہمیں آشکار کیا ۔ بدلہ یہ ہے کہ ہم پردہ میں رہ کر اسے آشکار کردیں ۔ حق ہمارے وجود سے خود بخود نشتر ہو ر باہر اور متلاشیانِ حق خود بخود اس جانب رجوع ہوں اور مٹی کے جسمانی بت سے ماوراء، حق کی کارفرمائی ہی کی تجلی دیکھیں ۔ یہ راہ دشوار بھی ہے مگر عشق کی فطری صداقت میں آسان بھی ہے ۔ عشق ہی وہ جذبہ ہے جو باعثِ تخلیقِ کائنات ہوا اور کائناتِ فطرت میں اس عشق کی تجلّی کے ذریعہ ہی حق تک رسائی کی راہ کھلی ۔ عقلِ کور بیں تو مٹی کے جسم سے آگے کیا دیکھ سکتی ہے اور فطرت کی توحیدی یکتائی میں بھی اپنی "میں" شامل کرکے شرک کی خود مرتکب ہوتی ہے اور مشرک یا مرتد دوسروں کو گردانتی ہے جو حسنِ مجرد کو مٹی کے جسم سے پرے حق کی تجریدی تجلی میں دیکھتے ہیں ان ہی کی نگاہ پاکباز بھی ہوتی ہے اور موحّد بھی اور وہ مشاہدہ بھی کرتے ہیں ۔ ہر عکسِ رخسار میں انہیں نورِ ازلی کی جھلک ہی ملتی ہے ۔

اب اسے کششِ ازلی ہی کہہ لیں کہ قبلہ درانی صاحب چودہ سال کی عمر میں جب پہلی بار ناگپور پہنچے تو شام کا وقت تھا ۔ اپنی یہ حالت تھی کہ عرصہ سے زہرِ عشق کی مدہوشی سی طاری رہتی نہ دنیا کی طلب ۔ نہ مقاماتِ فقر کی منازل طے کرنے کا شوق ۔ بس ایک شدتِ عشق ۔ ایک والہانہ پن ۔ بے سبب ۔ بے آرزو ۔ بے تمنا ۔ باہر خسرو کی سی شوخی تھی تو اندر خسرو جیسا شمع کا سوز ۔

زندگی کی سب دلچسپیاں اس موت وزلیست کی برزخ میں یوں بھی ختم ہوگئی تھیں ۔ جسم ایک سوکھا ہوا ڈھانچہ ۔ کیسی تمنا ۔ کیسی طلب ۔ کیسا حرفِ سوال ۔ جس کا وجود خود حرفِ سوال بن گیا ہو وہ کیا سوال کرے ۔ جس کے تن بدن میں عشق کا زہر پھیل چکا ہو اس کو کیا دنیا کے ڈھول نقارے ہوش میں لائیں ۔ مگر یہ عشق ایک بھڑکتی ہوئی آگ بھی تو ہوتا ہے ۔ العشق نارٌ محرق

اب اس آگ کو جو ایک آئینہ ملا تو اندھیرے، اجالے ہو گئے۔ آنکھیں چکا چوند گئیں۔ بابا صاحب اس وقت گھوڑے پر سوار تھے اور معمول کے مطابق سیر کو نکلے تھے اردگرد خلقت کا ہجوم تھا۔ قبلہ کی جو ادھر نظر پڑی تو بابا صاحب کی جگہ اس کا سراپا دکھا جس کی تصویر دل میں بسی تھی۔ اس تجلّی سے کچھ ایسی آنکھیں خیرہ ہوئیں کہ دونوں ہاتھوں سے چہرہ ڈھانپ لیا۔ وجود میں تلووں سے لے کر سر تک آگ سی لگ گئی۔ لڑکھڑا سے گئے۔ بابا صاحب کی نظروں نے سنبھالا دیا۔ اب جو چہرہ سے ہاتھ ہٹائے تو بابا صاحب ہی گھوڑے پر سوار تھے۔ اب کہیں قبلہ پر یہ بات روشن ہوئی کہ آئینہ ذات میں اپنی باطنی کیفیت کا ہی مشاہدہ ہوا تھا اور ساتھ ہی یہ بات بھی واضح ہوئی کہ حُسنِ ذات ایک ہی ہے۔ خواہ کسی روپ میں ہو۔ حُسنِ لیلیٰ عکس رخسارِ من است والی بات کو ان مٹی کی آنکھوں سے بھی دیکھا اور تیسری آنکھ سے بھی جو حقیقی آنکھ ہے۔

شام گزری رات آئی۔ بھوک لگی۔ ایک آنہ کا دودھ لیا۔ تاج بابا ؒ نے اپنے ہاتھوں سے مسل کر دودھ میں پیڑا ڈالا۔ قبلہ کو اس وقت نہ گھن آئی نہ نفرت۔ اس کا ہوش ہی کہاں تھا۔ ایک مستی طاری تھی۔ دیدار کی مستی۔ یا ایک نشہ تھا۔ ناگ کاٹے کا نشہ، ہوش اور مدہوشی کی برزخ۔ اس دودھ کی لذت آج تک یاد ہے۔ دودھ پینا تھا کہ سَن سے بدن میں، پیٹ میں، قلب میں ایک ارتعاش سا آگیا۔ اسمِ ذات روئیں روئیں، عضو عضو سے جاری ہوگیا۔ یہ تھا بابا صاحب کا فیضان جس نے ہر لاالٰہ کی لا کر کے الا اللّٰہ کا رنگ جما دیا کیسی ریاضت۔ کیسی مجاہدہ۔ کیسا اوراد کا سبق۔ اپنا وجود اور ترتیبہ اس ذکر کی تائید کر اٹھا اور یہ ذکر ایسا قیام کر گیا کہ ہر حال، ہر کیفیت میں اس نے بعد کے زمانے میں ساتھ دیا یہاں تک کہ برسوں بعد جب بابا قادر اولیاءؒ کے یہاں شرفِ باریابی ملا تو ان کے کرم و احسان سے اس ذکر کے جلال کو ایک جمالی شان نصیب ہوئی۔ تاج الدین جو روئیں روئیں میں بس

گیا تھا اس کے جلال کو جب بابا قادر اولیاءؒ نے رگ رگ سے باہر کھینچا تو وہ موت کی سی اذیت قبلہ کو اب بھی یاد ہے مگر ساتھ ہی بابا قادر اولیاءؒ کے احسان سے جو نئی حیاتِ روح ملی اور ارتقائے باطن کی راہ کھلی وہ بھی تو اسی چشمۂ فیضان کی دوسری شیرینی تھی۔ جس کا منبع بابا تاج الدینؒ کی ذات تھی۔

ذات کے دونوں پہلو جلال، جمال ہی ذات کی اکملیت ہوتے ہیں۔ جب تک جلال کی بھٹی سے کندن ہو کر نہ نکلے، جمال کی جِلا نہیں چڑھائی جا سکتی۔ اس لئے جس کام کی تکمیل بابا تاج الدینؒ نے اپنی وجودی زندگی میں نہ کرائی تھا۔ وہ اپنے ہی نورِ عشق، بابا قادر اولیاء کے ذریعہ کرا دی۔ زمانہ شاہد ہے کہ قبلہ ورانی صاحب میں بابا تاجؒ کا جلال، بابا قادر کا جمال دونوں ہی ایک توازن میں ہو کر کمال کا روپ لئے ہیں۔ اور ایسے پردہ در پردہ اور حجابات در حجابات میں کہ اس حُسن ولایت کی جھلک بھی ان مٹی کی آنکھوں سے نظر نہیں آ سکتی۔

بابا تاج الدینؒ فنا فی الشیخ تھے، فنا فی اللہ۔ یعنی فنا فی الذات کی جلالی شان۔ بابا قادر اولیاءؒ فنا فی الرسولؐ تھے۔ جمالی شان کے پیکر۔ گویا لا الٰہ الا اللہ کے بعد محمد رسول اللہؐ۔ اس طرح پورے کلمہ کی تفسیر، جیسے دو مل کر ایک جسم۔ پھر کوئی تیسرا پیکر ایسا بھی درکار تھا جو پہلے کی تصویری پیکر اور پھر دوسرے کی تصویری کاپی اپنے باطن میں مکمل کر لے اور اس طرح پورے کلمہ ـــــ کی تکمیل اپنے باطن وجود میں ہو جائے۔ ان باتوں کی فہم، عقل وادراک سے پرے، نورِ باطن کے ذریعہ ہی ممکن ہے۔ اس میں نہ کسی کی ذاتی کوششوں کو دخل ہے نہ اس کی ظاہری ریاضتوں یا مجاہدوں کو۔ یہ تو کچھ جیسے قدرت کے منشا کے تحت، زمانہ کے اعتبار سے کسی وجود کو پہلے سے چُن لیا جاتا ہے اور اُسے امت کا بارِ امانت سونپ دیا جاتا ہے اس فقیر کی اپنی ذات کے لئے یہ نہ نام ونمود والی بات ہوتی ہے نہ وکھی طور پر بھی اس راز کو

افشاء کر سکتا ہے۔ باباتاجؒ کا جب بارِ امانت کسی دوسرے کو سونپ کر رخصت ہونے کا زمانہ آیا تھا تو فرمایا تھا "بلی رام" ہاتھی پر سوار ہو کر آئے گا۔ راز کی بات راز میں ہی کہہ دی۔ "بلی رام" 'اللہ ولی'، 'قادر ولی'۔ اور ہاتھی اس کی روح کی سواری۔ جیسے حضرت آدم کا بیل۔ حضرت عیسیٰ کا گدھا۔ حضرت علی کا شیر۔ پیرانِ پیر کا گھوڑا۔ نبی کریمؐ کا اونٹ اور معراج پر براق۔ بڑوں کی باتیں بڑی ہوتی ہیں۔ روح کی بصیرت کس کس کے نصیب میں۔ اور ابھی تو قبلہ کے لئے فقر کے میدان میں قدم رکھنے کی پہلی ہی منزل تھی۔ ایک ناسمجھی کا سازمانہ۔ وگرنہ جس کی نظروں میں اس راہ کی دشواریاں پہلے سے کھول دی جائیں وہ اُلٹے پاؤں ہی واپس جائے مگر مشیتِ ایزدی کے آگے کس کی چلتی ہے۔ کاروبارِ جہانِ عالم کو چلانے کے لئے، بہت کچھ پہلے سے عالمِ مثال میں کر دیا جاتا ہے اور ان ہی نقشوں کے تحت عدم سے وجود میں لایا جاتا ہے۔ قبلہ کا ناگپور پہنچنا بھی کچھ ایسے ہی مقتضائے الٰہی کے تحت ہوا۔ ابھی ناگپور آئے دو تین دن ہی گزرے ہوں گے کہ ایک دن بابا کی سواری کے پیچھے جہاں خلقت بھاگتی تھی یہ بھی تانگہ کا کنارہ پکڑ کر بھاگنے لگے۔ بابا نے دو تین دھپ کمر پر لگائے جن کی یاد جب بھی کرتے ہیں وہی کیفیت، وہی آواز وہی دھپ آج تک کمر پر محسوس ہوتی ہے یہ دھپ کیا لگنا تھی کہ آہستہ آہستہ کیفیت بدلنی شروع ہوئی۔ خاموشی، تنہائی، گم سم سی حالت ہوتے ہوتے جذب طاری ہو گیا ایک نئی پُر کیف دنیا میں آ گئے۔ نہ کپڑوں کا ہوش رہا، نہ کھانے پینے کا۔ ایک مستی سی۔ ایک لذتِ حُسن سی، ایک عشق کی تڑپ سی۔ ایک اپنی ذات کی مستی۔ احببت ان اعرف کی کیفیت۔ ہر چیز حسین۔ دھوپ کی شدت حسین، موسم کی سختی، جسم کی تکالیف، بھوک، پیاس سب کچھ حسین۔ بابا کی نگاہ کیا پڑی کہ قلب کی دنیا ہی بدل گئی۔ کپڑے تک اتار پھینکے۔ یوں بھی جب دوئی کا پردہ اٹھ جائے، کوئی غیریت نہ رہے تو ان عارضی پردوں، لباسوں

کی ضرورت بھی کیا ہوتی ہے۔

کمر پر دھپ لگاتے وقت بابا تاجؒ نے فرمایا۔ ابے مرغے۔ گویا قبلہ کے باطن کے روپ کا اظہار کر دیا۔ بابا تاج کا طریقۂ کار انقلابی تھا۔ دھپ لگنا تھا اور ذکر جاری۔ قبلہ کی ہمشیرہ نے اسی زمانہ میں بشارت میں دیکھا کہ ایک کلغی والا مرغ کیلیلی کو کھا رہا ہے۔ یہ کیلیلی وہ ٹی۔ بی تھی جو اس زمانہ میں قبلہ کو تھی۔ اس طرح اپنے باطن نے اپنی ٹی۔ بی کو کھایا۔ وِدَر۔ ای سادھو کی انگریزی کتاب میں بھی مرغ کا ذکر ہے۔ مُرغ بغل میں ہے۔ اس کو حلال کرتے ہیں۔ تو خون کی ندی کے پار ایک بکری کھڑی ہے۔ ارتقائے باطن کی یہ کڑیاں ور کڑیاں بابا قادر اولیاء کے دربار میں طے کرائی گئیں۔ بابا قادر اولیاء کا انداز صرف محبت تھا اور نگاہِ طریق کار یہ ارتقائی راستہ تھا۔ قادر نگر کے قیام میں بشارتوں میں یا جذب کی حالت میں قبلہ نے اپنے اندر باطنی ارتقاء کی منزلیں خود دیکھیں۔ باطن جاگنے کے بعد اپنے اعمال کا تعلق جبلتوں سے ہوتا ہے جیسے اعمال خود بخود ہو رہے ہوں۔ یوں عقل و ہوش کے سہارے عمل پیرا ہونا علحدہ بات ہے اور جبلتوں اور باطن کے زیر اثر عمل پیرائی علحدہ بات ہے۔ یہی حقیقت ہے جس میں کوئی بناوٹ نہیں۔ اپنے اندر جو ہے اسی کی عمل پیرائی ظاہر میں ہے۔ کوئی دوئی نہیں۔ اپنی توحید میں عمل پیرائی ہے۔ اس باطن کے جاگنے کی ابتداء ناگپور سے ہوئی اور یہی بابا تاجؒ کا احسان تھا کہ صدیوں کی گم گشتہ روح کو یوں انقلابی طریقہ سے بیدار کر دیا۔

قبلہ کا فرمانا ہے کہ یہ دور بھی عجیب دور تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ ذکر کرتا ہوا محسوس ہوتا ایک ہی یکتائیت توحید میں ایک ہی وحدت وجود میں۔ تاج الدین، تاج الدین رگ و پے میں سما گیا تھا۔ دو سال یہ کیفیت رہی۔ علی گڑھ کی تعلیم کا سلسلہ ختم ہوا۔ عزیز و اقرباء سمجھ بیٹھے کہ دماغ کی خرابی ہے۔ کون اندر جھانک کر دیکھتا کہ وہاں کیا گزر رہی ہے۔

قبلہ کے والد صاحب حقیقت شناس ہستیوں میں سے تھے۔ بابا تاج الدینؒ کے مقام سے بھی آشنا تھے۔ اس لئے اپنے بیٹے کی اس حالتِ جذب کو خاموشی سے دیکھتے رہے۔ کسی نہ کسی طرح انہوں نے اس وقت کو گزرنے دیا پھر دو سال بعد بابا تاج الدینؒ کے پاس لے گئے اور عرض کی کہ آپ نے میرے بچہ کو کیا کر دیا ہے۔ بابا صاحب مسکرائے اور فرمایا اچھا کمبل اوڑھائے دیتے ہیں۔ ان کا یہ فرمانا تھا اور ادھر قبلہ درّانی صاحب کا یہ حال ہوا کہ جیسے آنِ واحد میں اس کیف و انبساط و سرور کی دنیا سے ادھر عالم رنگ و بُو کے حبس میں پھر سے آ گئے۔ جس نے آزادی دیکھی ہو۔ روح کی کیفیات و لذات سے آشنا ہو چکا ہو اسے پھر سے اس جسم کے پنجرے میں قید کر دیا جائے تو کیونکر نہ چلّائے، فریاد کرے۔ مگر یہ دنیا، اس کی پابندیاں، اس کا اپنا اصولِ حیات۔ اب کہیں ہوش میں واپس آ کر قبلہ درانی صاحب کو اپنی گزشتہ حالت کا احساس ہوا۔ مٹی کی آنکھیں اب اپنے وجود اور اردگرد کے وجود پر پڑیں تو گزشتہ زندگی یاد آئی مگر ساتھ ہی سخت صدمہ بھی ہوا کہ کن لذتوں کی زندگی اور سرور کی کیفیات سے، کس آتش زار میں، پھر سے یہ ہوش کی دنیا لے آئی۔

اس کے بعد پھر سے علی گڑھ میں تعلیم کا سلسلہ جاری ہوا۔ گھر سے علی گڑھ آتے جاتے راستہ میں ناگپور ضرور اترتے اور بابا صاحب کی خدمت میں حاضری دیتے۔ یہ سلسلہ بابا صاحب کے وصال کے بعد بھی، یعنی ۱۹۲۶ء کے بعد بھی جاری رہا۔ ناگپور کے مختلف قیاموں کے دوران کے چند واقعات ہی اس جگہ بیان کرنے کی گنجائش ہے۔ بابا تاج الدینؒ کی کرامتوں کے احوال یوں تو عام لوگوں کی زبانوں پر آج تک ہیں۔ اب بھی بہت سے ایسے لوگ موجود ہیں جنہوں نے خود آنکھوں سے دیکھا کہ بابا صاحب ایک وقت میں یہاں بھی ہیں وہاں بھی۔ قبلہ کے عزیزوں میں جو ناگپور سے پانچ سو میل کے فاصلہ پر رہتے تھے بابا صاحب پہنچے تھے۔ چائے

پی تھی اور تسلی تشفی دی تھی اور ادھر ناگپور سے بابا صاحب بالکل باہر نہیں گئے تھے۔ خود قبلہ نے بابا صاحب کا ہاتھ اپنے کاندھے پر دیکھا تھا جب وہ ولایت میں ایک وقت یہ بھول چکے تھے کہ بابا ساتھ ہیں۔ اسی طرح اور بہت سی آنکھوں اور عقل کو خیرہ کر دینے والی باتیں اس دربار میں دیکھی تھیں۔ قبلہ نے بھی اُس پیدائشی اندھے کو دیکھا تھا جو اکثر بابا آنکھیں دے۔ بابا آنکھیں دے پکارا کرتا تھا۔ پھر وہ بھی دن آیا جب بابا نے ایک دن ادھر سے گزرتے ہوئے ایک لات ماری اور کہا "ابے تو سب ہی دیکھ لے گا"۔ اس کے بعد یہ دیکھنے میں آیا کہ اس شخص کی آنکھیں پک آئیں اور آنکھوں سے پٹی بندھی رہنے لگی۔ اور ایک دن جب بابا صاحب کے اشارہ پر پٹی کھولی گئی تو اس کی بینائی آ چکی تھی اور ساتھ ہی تیسری آنکھ بھی کھل چکی تھی۔ قبلہ کے علم میں وہ واقعات بھی تھے جب ایک گانے والی جو اکثر "تاج الدین، نور مبین، عظمت والے بابا"۔ گایا کرتی تھی۔ کنویں میں گر کر مر چکی تھی۔ اس کی لاش پر بابا کا جبہ ڈالا گیا تو وہ زندہ ہو کر اٹھ بیٹھی تھی اور وہ واقعہ بھی جب ایک پارسی لڑکی جس کے ذمہ بابا صاحب کو چائے پلانا ہوا کرتا تھا، مر گئی اور والدین بابا صاحب کے پاس خاموش جا کر بیٹھ گئے تو بابا صاحب کے دریافت حال پر انہوں نے کہا تھا کہ لڑکی مری پڑی ہے اس پر بابا صاحب نے فرمایا تھا مری نہیں ہے، سو رہی ہے اور باپ کو کہا جا لڑکی سے کہہ کر بابا کو چائے دے۔ باپ نے لاش کو یہی الفاظ کہے اور لڑکی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ قبلہ نے یہ بھی دیکھا تھا کہ ایک نوجوان جس کے دونوں بازو ریل کے ایکسیڈنٹ میں ضائع ہو چکے تھے یہی رٹ لگائے رکھتا تھا کہ بابا ہاتھ دے۔ لوگوں کے سمجھانے پر بھی وہ اپنی ضد سے نہ ہٹا اور عرصہ تک یہی مانگتا رہا۔ بالآخر بابا نے ایک دن اس سے کہا کہ جا، کام کر۔ عرصہ کے انتظار کے بعد جو اُس خوش نصیب کو یہ الفاظ براہ راست بابا صاحب نے کہے تو اس نے انہیں اس انداز میں لیا کہ قسمت کھل گئی۔ اب اس نے پہلے پہلے سائیکل مرمت

کی دوکان کرلی۔ اپنی نگرانی میں مستریوں سے کام کراتا رہا۔ بڑھتے بڑھتے اس نے موٹر مرمت
کی دوکان کی۔ پھر ایک کارخانہ کھول لیا۔ اس کی آمدنی سے نہ صرف اس کے والدین کے بلکہ تمام
لواحقین اور مزدوروں، ملازموں کے خاندانوں کے اخراجات کھانا پینا کپڑا رہائش، شادی
بیاہ سب ہی ہوا کیا۔ اس طرح اس لڑکے کو اپنے کٹے ہوئے ہاتھوں کی جگہ یہ در پردہ بہت
سے ہاتھ مل گئے اور اسے اس پر ایمان بھی تھا کہ صرف اپنے ہاتھ مل بھی جاتے تو بھی کیا کرتا اب
تو بابا کے کرم سے یہ چاروں طرف کام کرنے والے سارے ہاتھ اس کے ہاتھ تھے۔
مگر یہ ظاہر میں جو کچھ ہو رہا تھا اس سے قبلہ کو کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ دیکھا بھی
تو کیا کیا۔ جاننا تو ہوجاتا ہے جب ظاہری علم تک کو عملی صورت میں بروئے کار لانے کے بغیر
کام نہیں بنتا تو باطنی علم کو بس حیران نگاہوں سے دیکھ کر حیران رہ جانے سے کیا بنتا ہے
یہ جو سچائی، یہ جو اعجازات، خلقت کے آگے بابا تاج پیش کر رہے تھے آخر ان کے پیچھے
کیا حق کی رضا تھی۔ قبلہ نے اُس زمانے میں بھی اور بعد کے زمانے میں بھی جب بابا تاج کے
وصال کے بعد برسوں، تنہائیاں در تنہائیاں اس روحانی سفر میں رہیں، ان حقیقتوں کی
گہرائیوں میں پہنچنے کی کوشش کی۔ اکثر اس عقدہ کا حل تلاش کرنا چاہا کہ فقر کے اس روپ
میں کیا مقصدِ فطرت پوشیدہ تھا۔ ان ظاہری کرامات کے پردوں میں چھپ کر۔ اس ظاہری
مجذوبانہ زندگی کے احوال میں حجاب لے کر آخر بابا تاج کونسی ولایتوں کی حفاظت کر رہے
تھے، جس کی عصمت آمرینِ حق کی نگاہوں سے بھی پوشیدہ رکھی تھی۔ اب نظر آتا ہے کہ
ان باتوں کو جاننے کے لئے اسی مشیت ایزدی کی طرف نگاہِ بصیرت کرنی ہوتی ہے جس کے
تحت کسی فقیر کا ظہور ہوتا ہے۔ ایک یہ کہ خلقت کو حق کی جانب رجوع کرے۔ اس کے لئے
پہلے اپنی ذات سے لگاؤ اور لگن کے جذبہ کو وہ شدت دے کہ اپنی قید سے انسان کو نجات

ملے ۔ تُو ہی توُ اس کے روئیں روئیں میں لبس جائے یہاں تک کہ توُ ہی توُ، اللہ ہُو کی راہ اس کے لئے کھل جائے ۔ اور ساتھ ہی ساتھ بے سہارا، بے آسرا مسکینوں کو اس دنیاوی زندگی میں بھی فیض پہنچتا رہے کہ ربوبیتِ حق کا یہی تقاضہ ہے یوں بھی الخلق عیال اللہ کے تحت خلقت کی دیکھ بھال ہر صاحب اقتدار کے لئے فرض ہے ۔ روپیہ پیسہ والوں کے لئے روپیہ پیسہ کی حد تک ۔ علم والوں کے لئے علم کی روشنی پہنچانے تک اور علیٰ ہذا القیاس آمرینِ حق کے لئے امر کی سطح پر ۔ مگر یہ تو رہی فرد کی حد تک بات ۔ جمیع خلائق کے لئے، امت کے لئے جس سطح پر کام کرنا ہوتا ہے وہ تو عالم مثال کی بات ہے ۔ فقر کی باطنی سطح کی بات ہے کہ باطنِ انسانیت جو صدیوں کی زنگ آلودگی سے خراب ہو چکا ہوتا ہے ۔ اسے برقِ تجلّیٰ کی حرارت سے ہی پھونک کر کندن بنایا جا سکتا ہے ۔ یہ محویت درمحویت کے عالم میں شدتِ ذکر کی لطافت میں ہی ممکن ہے کہ اس حالتِ یکتائی میں، خود مرکزِ کائنات ہو کر، وجودی زندگی کو بھی حیات بخشنے کا ذریعہ عطا ہو ۔ باطن کی یہ راہ اس برصغیر میں بابا فریدؒ کے احسان سے کھلی اور اس چودھویں صدی میں آمرانِ حق کا یہی اولین فریضہ رہا کہ باطنِ عالمِ انسانی کو باطن کی راہ سے وہ تربیت دے دی جائے جو آگے چل کر باطن جمیعت کے حسن کی جلوہ افشانی، ظاہری زندگیوں میں بھی کرا دے ۔ باطنی راستہ ارتقاء کا ہے ارتقائے باطن کی دھیمی چال ۔ اس کا تعلق ظاہر کی دنیا سے اس طرح وابستہ ہے کہ باطن کی اصلاح ہوئی ۔ باطن جاگا تو ظاہر پر بھی اثر انداز ہوتا ہے ۔ یہ طریقہ سالک کا ہے اور مجذوب کا طریقہ، انقلابی ہے عقل و ہوش کی دنیا میں انقلاب ۔ عقل کو خیرہ کر دینے والی حرکات و سکنات ۔

اُن فقرائے باطن کا، باطن تو نرالا ہوتا ہے ہی، ان کا ظاہر بھی نرالا ۔ ان کی باتیں

بھی نرالی۔ ان کا گفت ایک آیت ایک نشانی۔ پھر اس عقل کی فریب خوردہ انسانیت میں بیٹھ کر فقیرانا امتی کو بھی تو جنونِ عقل کا بہروپ لینا تھا، جو اس عقلِ ظاہر بیں کو حیران کر دے یہ گویا انقلابی طریقہ ہے، ظاہر میں عقل میں، ایک انقلاب بپا کر دینا۔ اور پردہ یوں کہ انسانی ذہانت اور دماغ کی کرشمہ سازیاں اس مجذوبیت کے پردہ کو عبور نہ کر سکیں اور معلم الملکوت کے چیلے دُور ہی رہیں۔ مگر اس جذب و جنوں کے پیچھے پردہ کر لینے کے باوجود خلقت برابر باباصاحبؒ کو گھیرے رکھتی۔ سواری باہر نکلتی تو خلقت ساتھ لگ جاتی۔ ایک دن باباصاحب کی سواری جاتی تھی۔ خلقت پیچھے بھاگ رہی تھی۔ قبلہ درانی صاحب بھی ساتھ ہی لگے تھے۔ دربار کے ملنگ، ٹائیگر مستان بھی برسوں سے دربار میں تھے۔ آج ان پر بھی ملنگی چڑھ گئی۔ آخر برس ہا برس کا صبر کب تک۔ اور اب تو باباتاجؒ کی واپسی روانگی کا زمانہ آرہا تھا۔ مستان ٹانگے کے آگے کچھ فاصلے پر بیچ سڑک میں ہاتھ پھیلا کر کھڑے ہو گئے کہ ٹانگہ روکا جائے۔ زوردار آواز میں ٹائیگر مستان نے باباصاحب سے کہا۔ یہ خلقت تیرے پیچھے بھاگ رہی ہے اور تو انہیں چھوڑ کر چلا جا رہا ہے۔ باباصاحب کا بھی آخری زمانہ تھا۔ سخاوت کے دریوں بھی کھلے تھے۔ مستان کا یہ کہنا تھا اور باباصاحب نے وہ تمام ہار جو اپنے اوپر اور تانگہ کے ارد گرد تھے اٹھا کر پھینکنے شروع کیا۔ فقیری یوں سرِ بازار لٹا کر چل دینے والے کم ہی آئے ہوں گے۔ قبلہ کا کہنا ہے کہ یہ بھی نقشہ تھا عجب۔ صدیوں کی میراث یوں سرِ بازار لٹائی جا رہی تھی۔ جسے بھی اُن ہاروں میں کی ایک بھی پتی ملی یا اُس تک کسی طرح پہنچی وہ بے ریاضت کے بہت کچھ لے گیا۔ خود قبلہ کی گردن میں ان ہاروں میں سے ایک ہار بے طلب بے تمنا کے ایسا آن گرا جیسا کہ یہ مقرر تھا۔ رحمت کی ہواؤں کا یہی حال ہوتا ہے کہ جب چلتی ہے تو اچھے برے سب ہی اس رحمت کے زیرِ اثر آجاتے ہیں۔ اس عالم میں

رحمتوں کی فراوانی کچھ اسی انداز میں ہے۔ بس نگاہ اور دل رجوع ہونے کی بات ہے۔ شمسی حقیقت کی تجلّی بلا خصوصیت سب کے لئے ہے۔ کوئی آنکھیں بند کر لے یا تاریکیوں میں چھپ جائے یہ اس کی اپنی خود ساختہ بد قسمتی ہے۔ ناگپور میں باباتاجؒ کے دربار میں پڑھے لکھے لوگ جبل پور والے بابا نیل کنٹھ رائے کے پاس بھیجے جاتے جو تنکر دھرا سے قریب ہی باباتاجؒ کی حضوری میں برسوں سے پڑے ہوئے تھے۔ نیل کنٹھ راؤ ایم۔ اے فلاسفی تھے۔ اور تعلیم سے کافی شغف رکھتے تھے۔ اپنے فطری تجسّس حق کی تڑپ میں کتابوں کو ہی اپنی مشعل راہ بنایا تھا اور اپنے علم کی روشنی سے ہی راہ کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے اپنی منزل، ناگپور پہنچے تھے اور یہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ باباتاجؒ کے دربار میں پہنچ کر ان پر بھی جذب کا وہ رنگ چڑھا کہ ذات پات سب بھول کر عشقِ مسکین کی تصویر بن گئے تھے۔ اکثر جذب کی حالت میں ہی رہتے۔ مگر ہوش کے عالم میں جب کچھ پڑھے لکھے خوش نصیبوں کو ان کے پاس بھیجا جاتا تو تصوف اور عرفان کے وہ رمز کھولتے جن کی، ان متلاشیانِ حق کو تلاش ہوتی تھی۔ یہی جبل پور والے بابا تھے جو بابا قادر اولیاء کو ان کی ناگپور پہلی حاضری کے موقع پر دیکھ کر ایک بار، کبوتر کی طرح زمین پر لوٹے تھے کہ تمہارے میں کیا کمال ہے۔ تمہارے میں کیا کمال ہے یعنی ہم برسوں سے آگ میں جل رہے ہیں اور تم پر باباتاجؒ کی نظر التفات آخر اتنی کیوں ہے اس پر باباتاجؒ نے جبل پور والے بابا کو ایک موقع پر یہ کہہ کر کہ ارے تو ہمارے میں کیا کمال دیکھنا چاہتا ہے۔ حیرت میں ڈال دیا کہ بابا صاحب نہ صرف ہر بات سے واقف ہیں بلکہ بابا قادر اولیاء کو وہ قُربِ عطا کر چکے ہیں کہ " تو مَن شدی من تُو شدی۔ قبلہ دُرّانی صاحب اکثر گھنٹوں، جبل پور والے بابا کی صحبت میں بیٹھتے اور خصوصاً اس زمانہ میں جب باباتاجؒ کا وصال ہو چکا تھا۔ قبلہ درانی صاحب کو جبل پور والے بابا سے یوں بھی لگاؤ تھا کہ وہ باباتاجؒ

کے وصال کے بعد مجسم غم کی تصویر بن گئے تھے۔ جیسے کہیں "میں بھول گئیاں تیرے سنگ نہ گئیاں" یا جیسے "چھپ گیا سورج رہ گئی لالی" بابا تاجؒ سے اسی لگاؤ کی بنا پر حضور قبلہ کو بابا تاج سے تھا۔ یہاں تک کہ رؤیں رؤیں میں تاج الدین لبسا تھا اور جسم کی یہ حالت تھی کہ ایک سوکھی تتی کی طرح رہ گیا تھا۔ اسی لئے جبل پور والے بابا کے پیچھے پڑ گئے کہ اپنا جیسا عاشق بنادو انہوں نے فرمایا تم اس آگ میں کیوں جلتے ہو۔ تم تو خوش نصیب ہو کہ تاج الدین مل گئے۔ فاذکرونی اذکرکم۔ تم جب اللہ کو یاد کروگے تو کیا اللہ والے تمہیں یاد نہیں کریں گے۔ یہ سبق قبلہ نے ایسا لیا کہ اگلے تیرہ سال اسی کے سہارے ظاہر باطن کے چراغ روشن رہے۔ بابا اندر ہی لبسا تھا پھر جب ۱۹۴۸ء میں بابا قادر اولیاء کے حضور پیش ہوئے تو اسی نورِ تاج دین کی جھلک دیکھ کر بابا قادر اولیاء نے اپنی ساری شفقتیں ان ہی پر نچھاور کر دیں۔ بابا تاج کا جلال اور جذب آگے کے ارتقائے روحانی کے لئے بھی شدتِ بنیاد بنا رہا اور زندگی کے خصوصی موقعوں پر اسی برق تجلی نے تاریکیوں کے سینے چیر کر امر ربانی اور نور حق کے اجراء کی ضمانت دی۔ وہ اک نظر کہ جدھر اٹھ گئی برق بن کر گری اور خانۂ دل میں محبتوں کو اجاگر کر گئی۔ یا وہ شدتِ کیف میں منہ سے نکلی بات کہ جو کہا و لیسا ہی ہوا۔

قبلہ بحیثیت چیئرمین
الیکٹریکل ڈیپارٹمنٹ انجینئرنگ کالج
علی گڑھ

باب ۴ علی گڑھ

شیفیلڈ سے واپس علی گڑھ آئے تو ڈاکٹر سر ضیاء الدین وائس چانسلر پر مسلسل زور دینا شروع کیا کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں انجینئرنگ کی تعلیم کا آغاز کیا جائے۔ ان کے بار بار مجبوریوں کے اظہار کرنے کے باوجود قبلہ دُرانی صاحب اکثر گھنٹوں ان کے برآمدے میں بیٹھے رہتے۔ ڈاکٹر صاحب کی نظر آتے جاتے پڑ جاتی مگر کام نہ بنا۔ اُدھر دُرانی صاحب کے لئے یہ خیال سوہانِ روح بنا ہوا تھا کہ علی گڑھ میں مستقبل کے صرف ڈپٹی کلکٹر اور آئی سی ایس ڈھالے جا رہے ہیں لیکن ملک کی تعمیر اور قومی مفاد کی خاطر جن علوم کی آئندہ زمانے میں خاص طور پر ضرورت ہے انہیں نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ آخر کو دو ایک سال کی بات چیت اور حجت کے بعد ایک پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں رکھی گئی اور ۱۹۴۲ء میں اسے ڈگری کالج کی شکل دے دی گئی۔ زمانہ نے ثابت کیا کہ اس کالج نے مسلمان انجینئروں کی ایک بھاری تعداد پیدا کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس سے پہلے ہندوستان بھر میں مشکل سے پندرہ انجینئر ہر سال بنتے تھے۔ لیکن اس کالج کے قیام کے بعد ہر سال ایک سو بیس مسلمان انجینئر بننے لگے۔ قبلہ دُرانی صاحب اس پولی ٹیکنیک انسٹی ٹیوٹ کے پرنسپل تھے اور جب ان کی کوششوں سے کالج بنا تو ان کو صرف الیکٹریکل ڈپارٹمنٹ کا چیئرمین مقرر کیا گیا۔ یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ علی گڑھ کے اس انجینئرنگ کالج کے لئے جس زرِ کثیر کی ضرورت تھی وہاں علی گڑھ یونیورسٹی کا ہاتھ بٹانے کے لئے خود قبلہ نے رامپور اور بھوپال کے نوابانِ ریاست سے رابطہ قائم کر کے امداد حاصل کی اور اپنی اس آرزو کے پورا ہونے

کے لئے اجمیر کے راجہ، خواجہ معین الدین اجمیریؒ کے دربار میں بھی جبیں فرسائی کی تھی۔
پھر جب سلطان الہندؒ سے فرمانِ مقبولیت مل چکا تو یہ آرزو کیسے پوری نہ ہوتی۔ اس
کالج کا پرنسپل بننے کی نہ تمنا تھی نہ کوشش۔ جسم و تن، دل و جان ایک ہی دھن میں تھے
جو پوری ہو کر رہی اور یہ ہی نہیں بلکہ اس دور میں جو بھی طالب علم اس کالج سے تعلیم حاصل
کر کے نکلے ان کے دلوں میں بھی وہی جذبہ، خدمتِ قوم ان کی زندگیوں کا سرمایہ بن کر ابھرا
اس کالج کے بنانے میں لس یوں سمجھیں کہ اپنے ہاتھوں اور اس وقت کے توانا جسم سے جتنا بھی
کام ہو سکا وہ رات دن کیا۔ ۱۹۳۵ء سے ۱۹۴۲ء تک تعمیری کاموں کے لئے اخراجات کا
اکٹھا کرنا۔ سامان مہیا کرنا۔ انجینئر اور ان کے عملے سے عملی رابطہ قائم رکھنا۔ خود شریکِ کار
ہو کر مزدوروں، مستریوں میں جوشِ عمل برقرار رکھنا، اپنے اور ساتھیوں کے لئے ایک لائحہ
عمل بن گیا۔ دل بہ یار دست بہ کار کے مقولہ کو یوں اپنا لینا کوئی آسان بات نہ تھی۔ یونیورسٹی
کی طرف سے کچھ مجبوری کچھ سرد مہری۔ اپنی نجی زندگی میں عزیز شریکۂ حیات کے انتقال کا
گہرا زخم۔ بابا تاج الدینؒ کے پردہ فرمانے کے بعد وہ تنہائیوں کا خلا۔ مگر اس کالج کے کام کو
چھوڑ کر، غم میں ڈوب جانے کی بجائے غمِ امت میں تبدیل کر لیا یہاں تک کہ قیام پاکستان
کے بعد میں بھی قبلہ درانی صاحب اس کالج کے تعمیری کاموں اور ترقی میں لگے رہے۔ خود اپنے
ہاتھوں سے کام کرنے میں بالکل نہ شرماتے۔ مزدوروں کے ساتھ مل کر کام کرتے۔ اسی دوران
ایک الماری اپنی کمر کے بل سرکاتے ہوئے ریڑھ کی ہڈی میں لکڑی چبھی۔ زخم پک کر ناسور بنا
اسی زخم اور ناسور کی بیماری میں بھی جب تک جسم میں سکت رہی کام کرتے رہے۔

ایک دفعہ علی گڑھ یونیورسٹی نے کلکتہ ڈیوٹی پر بھیجا۔ یہاں جا کر جنگ کا بچا ہوا زائد
سامان مفت حاصل کرنا تھا۔ ٹرک میں سامان لے کر چلے۔ راستے میں ایکسیڈنٹ ہوا۔

بیہوشی کی حالت میں ہسپتال لے جائے گئے۔ امریکن ڈاکٹر نے اچھی طرح دیکھا جانچا مگر نہ
سانس نہ جان۔ اس نے اپنے نزدیک مُردہ قرار دے دیا اور اس کی بھی حیرت کی انتہا نہ رہی
جب اس مُردہ جسم سے پھر سے چار پانچ منٹ بعد زندگی کے آثار آ گئے۔ یہ اور اس ثبوت
کی بات تھی کہ روح کی حیات کے ہوتے ہوئے جسم کی فنا کوئی معنی نہیں رکھتی۔ جسمانی زندگی پر
روح کا دار و عمل ہے۔ جب شدّتِ عشق میں روح کی گہرائیوں تک اثر ہو چکا ہو۔ نگاہ کسی پر
جم چکی ہو، تو اس مدعا کے حصول سے پہلے، روح، قالب کو کیسے چھوڑ سکتی ہے۔ اس موت
کے کیف کو قبلہ اکثر بیان کرتے ہیں کہ وہ انبساط، وہ بے پایاں کشادگی، آزادی اور سرور سی
خوشی کی کیفیت الفاظ میں نہیں آتی اس حالت میں اسی طرح ایک اور مرتبہ جب ٹرک سے سامان
اتارا جا رہا تھا تو ایک بھاری ٹرانسفارمر اُن کو اور ایک مستری کو مل کر اتارنا تھا۔ مستری نے
بوجھ اٹھانے کی تاب نہ لا کر سارا ٹرانسفارمر کا بوجھ قبلہ پر چھوڑ دیا اور قبلہ بیہوش ہو کر گر
پڑے۔ دیکھنے والے بھی سمجھے کہ ختم ہیں۔ مگر جن کی قسمت میں فنا در فنا کی منازل سے گزر کر
ہی حیاتِ جاوید میں قدم رکھنا ہے۔ مقربین ان کے لئے یہ موتیں ایک تجدیدِ مذاقِ زندگی ہی
ہوا کرتی ہیں۔ یہ قلندرانہ زندگی کا وہ سیلاب سا ہوتا ہے کہ ہر رکاوٹ کے بعد موجِ زندگی کچھ
اور شدت سے ابھرتی ہے اور حیاتِ جاوداں ایسے پیکروں میں سے گزرتی ہوئی ایک نئی دھمک اور
ادا کی حامل ہو جاتی ہے پھر یہ فروغِ زندگی اردگرد کے ماحول میں بھی نظر آنے لگتا ہے۔ اسی
کالج کے ایک فارغ التحصیل تابندہ نگینے حسن اختر صاحب کی زبانی معلوم ہوا کہ انہوں نے سنہ
سے سنہ تک قبلہ دیوانی صاحب کو علی گڑھ میں بہت قریب سے دیکھا تھا عرس کو جھپڑتے تھے
اسی لئے اپنی اس وقت کی فہم کے مطابق ہی ان سے تنگ سر سائی رہی۔ اُن کی نگاہوں میں اس وقت
بھی قبلہ صاحب نہایت نرم گفتار، شفیق اور مخلص ساتھی تھے۔ اس وقت بھی عقیدہ بھائی علیہ

بھی عبید بھائی۔ اُن کے آگے جبن درانی صاحب کا نقشہ گزرتا ہے وہ مستعد، توانا، صحت مند
اور ہر وقت کسی نہ کسی کام میں جسمانی طور پر معروفِ عمل رہنے والے کا ہے۔ ان کے مطابق قبلہ
محنت سے پسینہ پسینہ ہو کر ایک سکون سا محسوس کرتے۔ سیڑھیوں پر چڑھے ہوئے بجلی
کے تاروں پر کام کرتے۔ بھاری ہتھوڑے جو حسن اختر نیچے سے پھینکتے ان کو مستعدی سے
سیڑھی پر چڑھے ہوئے پکڑ لیتے۔

اسی زمانہ میں قبلہ نے علی گڑھ ایر ٹرینگ کور میں یونیورسٹی کی طرف سے انچارج
کی حیثیت سے کام کیا۔ فلائنگ سکھانے کا کام تو ایئر فورس والوں کے سپرد تھا مگر طلبا کو
جمع کرنا اور پروگرام میں شرکت کرانا قبلہ کے ذمہ تھا۔ اسی سلسلے میں قبلہ نے خود بھی
فلائنگ سیکھی اور کئی بار جہاز اڑائے۔ ایر ٹرینگ کور کے سلسلہ میں بھی اچھا خاصہ
مشغولیت کا پروگرام ہوتا تھا اور یہ کام تمام جنگِ عظیم نمبر ۲ کے زمانہ میں بھی اور بعد میں
بھی جاری رہا۔

کلاس روم اور ورکشاپ میں تعلیم دینے کے علاوہ قبلہ کو کالج کے روزانہ ایسے
کام کرنے پڑتے جو مستریوں کو کرنے چاہیئے تھے۔ جب حسن اختر صاحب نے فارغ التحصیل
ہو کر پڑھانے کی ملازمت کرنے کا شوق ظاہر کیا تو قبلہ نے فرمایا۔ دیکھو بھائی علم بیچا نہیں
جاتا، ہنر بیچا جاتا ہے۔ اسی لئے میں جو یہ بیس روپیہ روزانہ تنخواہ کے حاصل کرتا ہوں
اس کے عوض کالج کا بیس روپیہ کا کام کر دیتا ہوں جو مستریوں سے کرانا پڑتا۔ یہ سلسلہ
چنانچہ اسی انداز میں جاری رکھا کہ کالج کے لئے مشینیں مرمت کیں یا پرانے سامان سے
جمع کر کے ایسی مشینیں بنالیں جو براہ راست خریدنے میں کافی رقم میں حاصل ہوتیں۔ پھر اسی کالج

سے ایک اچھی خاصی تعداد انجینئروں کی نکلی جنہوں نے پاکستان بننے پر اس جسم نوزائیدہ کے لئے ریڑھ کی ہڈی کا کام دیا اور خدا کے فضل سے ان کے باطن کی ریڑھ کی ہڈی بھی وہ مضبوطی لے کر اٹھی کہ انجینئرنگ کے ہر شعبہ میں خانقاہی انداز جما۔ جس طرح زندگی کی ہر بنیاد زمین میں ہوتی ہے۔ اسی طرح فقر کی بنیاد بھی روح، قلب کی بلندیوں تک اٹھانے سے قبل، روزمرہ زندگی کے عملی جسمانی پہلو میں ہی نشوونما پاتی ہے۔ ایک انہماکِ کار۔ ایک جذبۂ خدمت۔ ایک جمعیت بندی ہی، کسی قوم کے فروغ کی راہ میں پہلا قدم ہوتا ہے۔ اس سطح کی توحید حاصل کرنے کے بعد ہی امتِ واحدہ کی منازل کی راہ کشادہ ہوتی ہے۔

علی گڑھ کے اور ایک تعلیم یافتہ انجینئر غلام کبریا صاحب کا کہنا ہے کہ انہوں نے قبلہ کے ساتھ [illegible]ء سے ۱۹۴۸ء تک علی گڑھ میں وقت گزارا۔ پہلے وہاں تعلیم حاصل کی پھر ۱۹۴۵ء میں اُنیس سال کی عمر میں ادھر ہی لیکچرر مقرر ہوئے۔ طبعاً شوخی کے باعث قبلہ سے اپنے کو سب سے زیادہ قریب تر سمجھتے تھے اور یہی خیال قبلہ سے ہر ملنے والے کا اپنی اپنی بابت تھا کہ وہی قبلہ سے قریب تر ہے۔ قبلہ ایک توانا شخصیت کے حامل تھے۔ ہر کام خود ساتھ لگ کر کرتے۔ کالج کی زیادہ تر مشینری کباڑیوں سے سامان حاصل کر کر کے بنائی تھی۔ کام کرتے رہنے اور کام کرانے کی وہ دھن تھی کہ کبریا کہتے ہیں کہ میں اکثر لوگوں سے کہتا کہ مجھے ایسا بڑا استاد ملا ہے جو کسی کام میں "نہ" تو سنتا ہی نہیں جانتا ایک دفعہ ہی قبلہ کو ڈانٹتے سنا ہے اور اس ڈانٹ ملنے کا فخر مجھ ہی کو حاصل ہوا ہے اس ڈانٹ نے میری زندگی ہی بدل دی۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب مجھے ایک سخت کام کالج کے سلسلہ میں کرنے کو دیا۔ میں نے چہرہ پر بناوٹی کرب کا عالم طاری کر کے کام ٹلانے کی کوشش کی تو ڈانٹ کر کہا "یہ مت کہو کہ نہیں ہو سکتا۔ تمہیں یہ کرنا ہے۔ نہ میں نے کسی کو نہ کہی ہے نہ میں نہ سننا

چاہتا ہوں"۔ ۱۹۳۰ء میں عمر رسیدہ لیکچررز کی موجودگی میں نوعمر غلام کبریا صاحب کو ہائیڈرولکس لیب اور میٹیریل ٹسٹنگ لیب بنانے کی ذمہ داری سونپی گئی اور فرمایا میں جا رہا ہوں یہ دونوں لیب تم بناؤ گے۔ کس کی مجال تھی جو دخل دیتا۔ قبلہ، کالج کے پرنسپل اور وائس چانسلر کی نگاہ میں عزت سے دیکھے جاتے تھے۔ وہ لوگ خود قبلہ سے ملنے بنگالی کوٹھی آتے۔ سامان حاصل کرنے کے لئے رقم کہاں تھی لہٰذا ان صاحب نے بھی وہی عمل کیا جو قبلہ کو کرتے دیکھا تھا۔ دادے جی کے پاس جاتے اور بِل ان کے پاس چھوڑ کر آجاتے۔ وہ جانیں اور یونیورسٹی۔ کیونکہ اس قسم کا قرضہ تو اسی زمانہ سے مختلف جگہوں سے چل رہا تھا جب سے ٹیکنیکل انسٹی ٹیوٹ بنا تھا۔ شروع زمانہ میں تو قبلہ کو یونیورسٹی سے تنخواہ تک نہ ملتی تھی۔ والد صاحب ہی گھر کے اخراجات کے لئے رقم بھیجتے۔ پھر جب چند سالوں کے بعد پہلی تنخواہ ۱۹۳۸ء یا ۱۹۳۹ء میں ملی تو اپنی تنخواہ سے لیکچرر بھٹا چارجی کو بھی اپنے ساتھ لگا لیا تھا۔ پندرہ بیس طلبا کو جمع کر کے سٹی اینڈ گلڈز کے امتحان کی تیاری شروع کرائی گئی اس پہلے بیچ میں ممتاز قریشی مرحوم بھی تھے جو بعد میں انجینئرنگ یونیورسٹی لاہور میں پروفیسر ہوئے اور جنہوں نے اپنی تمام زندگی قلندرانہ ذوق و شوق اور خدمت خلق کے جذبہ میں گزاری۔ علی گڑھ کے اسی چھوٹے سے انسٹی ٹیوٹ نے یونیورسٹی مارکیٹ کے دو کمروں میں جنم لیا اور ۱۹۴۸ء تک اس میں طلبا کی تعداد چودہ سو تک ہو گئی تھی۔ اسی کالج میں جب قبلہ کے چھوٹے بھائی منان دُرانی صاحب نے ملازمت چاہی تو انٹرویو بورڈ سے قبلہ، بورڈ کے چیئرمین عبید الرحمٰن صاحب شیروانی سے معذرت کر کے اٹھ گئے تھے اور ایسا ہی کچھ پشاور یونیورسٹی میں کیا جب ان کے بھتیجے نے وہاں ملازمت چاہی تھی۔ ایک دفعہ ۱۹۴۲ء میں علی گڑھ انجینئرنگ کالج کے طلبا نے جمع ہو کر یہ چاہا کہ دُرانی صاحب کالج کے فاؤنڈر ہیں اس لئے ان کا فوٹو اس کالج

میں لگائیں گے قبلہ نے کہا تو جب یہ نام و نمود میرا صلہ مقرر کیا جا رہا ہے تو میں یہاں سے
چلا جاؤں گا۔ اس پر طلبا اپنے ارادے سے باز رہے۔ ہر انسان کی عزتِ نفس رکھنے کا قبلہ
کو اتنا خیال تھا کہ ایک بار ایک ویلڈر نے کالج کا کافی سامان چوری کر لیا۔ جب وہ پکڑا گیا تو
اس نے اپنی جان بچانے کے لئے اپنے کیرکٹر کی تصدیق میں قبلہ کا ہی نام پیش کیا۔ قبلہ نے
بھی اس کے پچھلے کام کی تعریف کی اور کہا کہ ویلڈنگ کا جو سامان اس کے پاس سے نکلا ہے
وہ کہیں سے بھی مل سکتا ہے۔ لہٰذا وہ ویلڈر چھوڑ دیا گیا۔ اس واقعہ سے اس شخص پر اتنا اثر ہوا
کہ اس نے قبلہ کے قدموں پر آ کر سر جھکا دیا اور بعد میں خود ہی وہ سارا سامان لا کر دے
دیا۔ ایک دفعہ لیکچراروں کے درمیان جھگڑا ہوا۔ قبلہ نے چشم پوشی کی۔ یہ صاحب قبلہ کے
پاس سخت غصہ کے عالم میں پہنچے کہ اگر قبلہ نے ان کا ساتھ نہ دیا تو لڑائی ہوگی۔ قبلہ نے تسلی
دینا چاہی تو کہا میں کوئی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔ پھر قبلہ نے کہا روٹی تو کھا لو
انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر کہا اچھا خوشبو تو سونگھ لے بیوقوف۔ اور ایک شیشی سنگھا
دی۔ دو چار منٹ میں غصہ ٹھنڈا پڑ گیا اور ان صاحب نے روٹی کھا لی۔ آخر ایک ہی برادری
میں تو یہ جھگڑا ہوا تھا۔ سب ایک ہی مقصد کے لئے تو یہاں کام کر رہے تھے۔ قبلہ کے رہائش
کی جگہ بنگالی کوٹھی تھی جو بھولہ گاؤں کے قریب تھی۔ اس کوٹھی میں ہر قسم کے لوگ رہ رہے
تھے۔ یہ بھی پتہ نہ چلتا تھا کہ کون کون رہتا ہے۔ کہاں کھانا پکتا ہے اور اخراجات کہاں سے آتے
ہیں۔ وہاں رہنے والوں کی تعداد کبھی گنی بھی نہ جا سکی۔ البتہ اتنا ضرور تھا کہ وہاں سے کوئی بھی
کبھی بھوکا اٹھ کر نہیں گیا۔ یہ کوٹھی بجائے خود ایک مجمعی فلاحی قیام گاہ تھی۔ اسی کوٹھی میں قبلہ کے
ساتھ کچھ عرصے ممتاز قریشی مرحوم اور شمیم صاحب کے خاندان بھی رہے۔ یہاں افضل صاحب
داؤد صاحب، خواجہ بھائی، پاشا بھائی، منان درانی، احمد محی الدین اور بہت سے دوسرے لوگ

مختلف زمانوں میں قبلہ کے پاس ٹھہرتے رہے ۔ ملاقاتیوں میں ڈاکٹر ایم ۔ ایم ۔ احمد، ڈاکٹر صفی اکثر آتے ۔ یہاں اکثر مسلمانوں، ہندوؤں اور پارسیوں کو بھی قبلہ کی خدمت میں آتے دیکھا خصوصی طور سے ایڈل جی باٹلی والا قبلہ کے پاس آتے تھے ۔ یہ بھی قبلہ کے نزدیک ترین دوست معلوم ہوتے تھے اور گھنٹوں ہومیو پیتھی اور تصوف کے مسائل پر قبلہ سے گفتگو کرتے ۔ گھر اور کالج کے لئے قرضہ کی اکثر ضرورت پڑجاتی تو غالباً ایڈل جی ہی پیشکش کرتے ۔ یا اُس وقت فوری رقم کی ضرورت ہوتی جب ضرورت مند طلباء کی مدد کے لئے یا یونیورسٹی کے ڈیوز ادا کرنے کے لئے یا تو ضمانت دی جاتی یا نقد رقم سے مہیا کی جاتی ۔ اکثر و بیشتر یہ ضمانت کی رقم قبلہ کو خود ہی ادا کرنا پڑتی قبلہ کے لباس اور طرز رہائش میں بالکل سادگی تھی ۔ معمولی کپڑے، ڈھیلے ڈھالے قسم کے استعمال ہوتے جو ورکشاپ کے کام میں بھی آتے ۔ شاذونادر ہی سوٹ کسی فنکشن کے لئے پہنتے ۔ ساری زندگی صبح سے شام تک ایک انہماک کار میں گزرتی ۔ باہر سے دیکھنے والی آنکھیں تو ظاہری وجود کے کاروبار سے زائد کیا دیکھتیں ۔ اندر کیا حال تھا کسے معلوم تھا کس جذبہ کے تحت، کس نظریے کے تحت، کس مقصد کے تحت یہ تمام زندگی گزر رہی تھی اس کو معلوم کرنے کی کسے فرصت تھی ۔ کالج کے کام ۔ لوگوں کی دادرسی ۔ مختلف قسم کے لوگوں سے ملاقاتیں ۔ تصوف کی مجلسیں ہی کیا کم تھیں کہ خاکسار تحریک میں بھی معرکاتی لیکچرار اور طالب علموں کے مصروف کار رہتے ۔ اس تحریک کا مقصد اللہ کی حکومت قائم کرنا اور اس کا پروگرام، منظم خدمتِ خلق کرنا تھا ۔ تنظیم کے لئے پریڈ بیلچہ، کیمپ، آس پاس کے علاقہ میں فلاحی کام، مجبور و ضرورتمندوں کی امداد ۔ بنگال کے قحط میں امدادی کام، پھر تقسیم ملک کے زمانہ میں ہنگاموں اور قتل و غارت کے زمانے میں یونیورسٹی اور شہر کی حفاظت کے انتظامات، کرنا وغیرہ تھا ۔ قبلہ درانی صاحب، سالار سے بھی اوپر خاکسار تحریک کی ہائی کمان کے ممبر تھے ۔ لیکن جو کام عام ممبر کرتے یہ بھی ان کے ساتھ شریک ہو کر ان

کاموں میں لگے رہتے۔ ایک جانب کالج کی ترقی کے سلسلہ کے کام جاری تھے دوسری جانب
خاکسار تحریک کے سلسلہ میں روزافزوں ذمہ داریاں جس میں یونیورسٹی کے بہت سے طلبا
اور پروفیسر سچاجذبہ لے کر شریک کار تھے۔ تقسیم ملک کے وقت جب مسلمان آبادی اور
یونیورسٹی پر جنگ سنگھ کے حملوں کا یقینی خطرہ تھا توراتوں کو حفاظتی پارٹیاں گشت کرتیں۔
پروفیسر تمیم صاحب کے ذمہ انتظاماتِ حفاظت سپرد تھے۔ بندوقوں اور دوسرے ہتھیاروں
سے لوگ مسلح رہتے۔ قبلہ نے اس وقت بھی یہ فرمایا تھا کہ میری بندوق سے کوئی نہیں مرے گا
میرا نشانہ یہ نہیں کہ اچھا نہیں لیکن میری بندوق کا چھرا کسی کے گھٹنوں سے اوپر نہیں جائے
گا۔ اس وقت علی گڑھ کے حالات اتنے خراب تھے کہ لوگ اپنی ہمتیں قائم رکھنے کے لئے تکبیر کے
نعرے لگاتے۔ گلیوں اور سڑکوں پر گشت کرتے۔ عورتوں اور بچوں کو ایک حفاظت کی جگہ میں
رات کو جمع رکھتے اور خود پہرہ دیتے۔ ہر ایک کو اپنی جان کا خطرہ تھا۔ قبلہ نے کہا تھا کہ ڈرو مت
کچھ نہیں ہوگا۔ جو قوم یا فرد جو چاہتا ہے وہ ملتا ہے۔ اگر مسلمان ڈرتے رہے موت سے، تو
یہی ملے گی جس کا خیال کرتے ہیں۔

قبلہ درانی صاحب کو تو سخت بیمار ہو جانے کی وجہ سے علی گڑھ چھوڑ کر اپنے وطن جنوبی
ہند جانا پڑا اور ادھر بہت سے لوگ ہنگاموں کے ڈر سے پاکستان چلے آئے۔ قبلہ درانی
صاحب کی ریڑھ کی ہڈی میں جو چوٹ لگی تھی اس پر دوبار اور دہلی کے سفر میں تانگوں کے حادثوں
میں چوٹیں آئیں۔ ان چوٹوں کو اور کمر کی ہڈی کے زخم کا اور خراب ہو جانا، لوگوں کی نظروں سے
چھپائے رکھا۔ مگر کب تک۔ ۱۹۴۷ء تک جو جسم میں توانائی تھی وہ کم ہو چکی تھی مگر شدتِ کار کی
جو دُھن تھی اس میں ظاہر میں کسی طرح کمی نہ آنے دی۔ اس وقت جو جسم کی حالت تھی وہ کسی اور
کی ہوتی تو پلنگ سے نہ اٹھ سکتا اور رکھیاں بھنکتیں مگر یہاں جیسے کوئی اور پوشیدہ قوت اس جسم

کو سنبھالے پھرتی تھی۔ قبلہ کے لئے گویا طبعی تندرستی اور صحت معنی ہی نہیں رکھتی تھی۔ آنکھوں میں روشنی، زندگی کی علامت بنی رہی۔ اتنی قوت ارادی صوفیا میں کم ہی دیکھنے میں آئی ہے اور یہی ارشاد ایک جید بزرگ صوفی نذیر احمد کاشمیری کا تھا جن کی صحبتوں میں قبلہ اکثر بیٹھتے۔ علاج معالجہ نہ ہونے کی وجہ سے قبلہ کی کمر کی ہڈی کے تین مُہرے گل گئے۔ بابا تاج الدینؒ نے بھی ناگپور میں تین ٹکے ہی مارے تھے وہ تین ٹکے اور یہ تین مُہرے ایک ہی داستان میں منسلک ہو گئے۔ اس حالت میں بھی کالج میں میز پر لیٹے لیٹے دوسروں کو ہدایات دیتے رہے اور کالج کا کام برابر جاری رہا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین مرحوم نے قبلہ کا یہ جنونِ خدمت دیکھ کر خود ہی قبلہ کو مجبور کیا کہ آرام کرنے اپنے وطن جائیں اور ان کی روانگی کے انتظامات خود کر دیئے پھر جب حضور بابا قادر اولیاءؒ کے دربار سے فیض یاب اور صحت یاب ہو کر دوبارہ نومبر ۴۹ء میں قبلہ علی گڑھ پہنچے تو ہندوؤں نے پوری میڈیکل بورڈ کرائی جس میں جمناسٹک شامل تھی۔ بابا قادر اولیاء نے پہلے سے فرما دیا تھا کہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ چنانچہ جب قبلہ سے مختلف قسم کی ورزشیں ڈاکٹر نے کرائیں تو قبلہ ایک مدہوشی کے عالم میں اپنے سامنے ایک پُتلے کو دیکھ رہے تھے اور جیسے جیسے وہ پُتلا حرکت کرتا تھا ویسے ہی یہ کرتے۔ اس طرح یہ ٹوٹی ریڑھ کی ہڈی والا جسم بھی میڈیکل ٹسٹ پاس کر گیا۔ یوں طلبا نے بھی ڈاکٹر کو الٹی میٹم دے دیا تھا کہ اگر اس نے قبلہ کے لئے رکاوٹ ڈالی تو اس کی خیر نہیں۔ مگر ڈاکٹر بھی اس راہ میں کیا رکاوٹ بن سکتا جو بہ فیضانِ شیخ، مقرر ہو چکی تھی۔

قبلہ کے ساتھ یہ چند سال گزارنے کی اسپرٹ تھی جو پاکستان آنے کے بعد بھی غلام کبریا صاحب نے لاہور میں ملی ٹیکنیکل ادارہ قائم کیا۔ یہاں مفت ٹیکنیکل تعلیم کا انتظام تھا اور یہاں سے ٹیلیگراف ڈیپارٹمنٹ کے چھ ڈویژنل انجینئر اور سینکڑوں لائن مین واپڈا اور بنگال میں کام کرنے کے لئے فارغ التحصیل ہوئے۔ کبریا صاحب کے ذہن میں وہ علی گڑھ کا جذبہ تھا کہ

جو چیز قبلہ نے علی گڑھ میں کی وہ میں یہاں کیوں نہ کروں۔ حال ہی میں ان صاحب نے قبلہ سے
موزوں یا سادہ ٹیکنالوجی کی اسکیم کی اجازت لی ہے۔ قبلہ کے ساتھ زندگی کا ماحصل انہوں نے
بھی پایا ہے کہ انسان کو ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھنا چاہئے۔ بلکہ جو بھی سامان اور وسائل موجود
ہوں ان کو استعمال کر کے زندگی کو فروغ دینا چاہئے۔ ہمیں مہدی کے انتظار میں کیا بیٹھنا
ہے آخر اپنی زندگیوں میں بھی تو کچھ کرنا چاہئے۔ بجائے روتے بیٹھنے کے آپس میں مل کر سوجھ
بوجھ سے اسی ہنر کو استعمال کرنا چاہئے جو آتا ہے۔ زندگی ساری کی ساری ایک ہی توحید
میں ہے۔ کیا انفرادی، کیا اجتماعی، کیا فقیری، کیا انجینیری۔ کیا خاکساری، کیا پالیٹکس۔
انسان چاہے تو گھورے پر سے بھی موتی چن سکتا ہے۔ معمولی انسان سے عظیم جمعیت
بنا سکتا ہے۔ کباڑ کے سامان سے نہ صرف مشینیں ایجاد کر سکتا ہے بلکہ موجدوں کی بھی ایجاد
کر سکتا ہے۔ تائید غیبی یہی ہے کہ انسان ان صلاحیتوں سے کام لے جو اس کے غیب میں
ہیں۔ نہ شکوہ شکایات کی گنجائش ہے نہ کسی کی برائی اور تنقید کی۔ نہ دوسروں کا سہارا ڈھونڈنا
ہے نہ منفی خیالات دل میں لانا ہیں۔ جب "ہے" تو "نہ" کی گنجائش کہاں۔

یوں ایک متفکرانہ نظر سے دیکھا جائے تو صاف معلوم ہوگا کہ زندگی میں لگن ہو،
اٹھان ہو، مقصد کا تعین ہو، تب ہی صحیح معنوں میں حیات، حیاتِ انسانی کہلائی جا سکتی
ہے۔ خلوص، محبت، بے لوث خدمت کے جتنے بھی لمحے انسان کو میسر آجائیں وہی زندگی
کا سرمایہ ہیں، وہی نعمتِ ابدی ہیں۔ جمعی فلاحی جمعیت کے انداز میں عمل پیرائی جہاں فطری
شوقِ نمود اور ازلی بے چینی کو ایک رُخ عطا کرتی ہے وہاں اندر کی آگ کو بھی سکون بخشتی
ہے۔ اس طرح ایک طرف انفرادی وجود کی ہر ناپسندیدہ منفی صفت کی کمی بھی ہو رہی ہوتی
ہے اور دوسری طرف باطنی حقیقتوں کو بھی حی و قیوم کی راہ ملتی ہے۔ وجود تو یہی مٹی کا

ہوتی ہے مگر باطنی صفاتِ حمیدہ رحمت کے مثبت انداز میں کاروبارِ جہاں میں عمل پذیر ہو کر ظاہری وجود کا بھی حسن بن جاتی ہیں۔ گندم از گندم بروید جو زجو۔ یوں انسان صرف زبانی ورد وظائف سے اپنے گناہوں کا استغفار کیا کرسکتا ہے۔ لغزشوں اور غلطیوں کا کفارہ اچھے اقدامات کرکے ہی ادا کیا جاسکتا ہے یا دوسروں کو یہ عملی راہ دکھائی جاسکتی ہے۔ مثلاً کسی کا مال غصب کیا تو غریبوں کی دادرسی کرکے ہی اس کی ادائیگی ہوسکتی ہے۔ کسی کو مارا پیٹا تو اب مظلوموں کی پشت پناہی کرکے ہی انہیں ظلم کے پنجوں سے چھڑانا ہوتا ہے یا نفسانفسی میں زندگی گزاری ہے تو بے لوث خدمت میں ہمہ تن مصروف ہی رہ کر اپنے کو بھول جانا ہوتا ہے اس طرح ہر فرد کو زمین کی بات زمین کی سطح پر اور آسمانوں کی بات آسمانوں کی سطح پر نبھانی ہوتی ہے عقائد میں ایک وحدت ہو، اکائی ہو، توحیدی انداز ہو تو اعمال میں دوئی کہاں ہوسکتی ہے ملحہ، جسم، ذہن، عقل، خواہش، نفس وغیرہ کی ظلمات کا استغفار، زمین کی سطح کی بات ہے جو ردعمل ہے۔ اور آسمانوں والی بات، لطافتوں سے ہمکناری ہے۔ یہاں تسبیح والا استغفار ہے جو مقامِ سبحانیت میں رسائی کے بعد ہی کوئی معنی رکھ سکتا ہے۔ پھر اس سے کہیں آگے استغفار وجود ہے۔ جو کلی طور پر اپنے وجود کے حجابوں سے مغفرت اور آزادی ہے۔ یہی عبدیت کا مقام ہے۔

اس منزل تک پہنچنے سے پہلے وہ طویل اور لمبا سفر طے کرنا ہوتا ہے جس میں ایک بیقرار روح۔ اپنے اصل کی تلاش میں کوچہ کوچہ۔ قریہ قریہ گھومتی ہے۔ ایک نہ بجھنے والی علم و معرفت کی پیاس اسے ایک منزل سے دوسری منزل تک لئے پھرتی ہے۔ یہ تنہائیوں کا سفر صبر آزما بھی ہوتا ہے اور دروح فرسا بھی۔ بابا تاج کے وصال کے بعد تئیس سال تک قبلہ کو یہ تنہا سفر کرنا پڑا۔ اپنے جسم و جاں کی تجربگاہ میں یہ حقیقت معلوم کرنی تھی کہ حقیقت کیا ہے، حق کیا

ہے ۔ حق تک رسائی کے لئے لوگوں کو کیا کیا جتن کرنے پڑتے ہیں آخر یہ تو اب تک صاف نظر آ رہا تھا کہ قدرت کی عطا دہ غیبی صلاحیتیں جہاں جسم و عقل کی سطح پر کارفرما ہیں، وہاں مقام قلب و روح پر ان کی کہیں زیادہ عمل پیرائی ہے ۔ یہ لطافتوں اور مجردات کی دنیا، ساری خلقت کو ایک ہی نفسِ واحدہ کی صورت میں پیش کر رہی تھی ۔ باطن کے چراغ روشن تھے ۔ مجاہدوں اور ریاضتوں کے طریقے بھی اختیار کر کے دیکھے ۔ نفس کُشی اور اپنے جسم پر طرح طرح کی سختیاں کرنے کا ہندو یوگیوں کا طریقہ بھی آزمایا ۔ وہ یوگیوں کا عرصہ تک ایک ٹانگ پر کھڑے رہنا یا ایک ہاتھ اٹھا کر اسے خشک کر ڈالنا ۔ حبسِ دم کر کے عمریں بڑھا لینا یا دھوپ اور موسم کی سختیوں میں اپنے جسم کو ایک بھٹی میں سے گزارنا ۔ یا مٹھیوں کو اتنا سخت بھینچ کر عرصہ تک بیٹھ جانا کہ ناخن بڑھ بڑھ کر ہتھیلیوں کے پار نکل جائیں مگر ان شعبدہ بازیوں کا یہی انجام نظر آیا کہ یہ سب غیر فطری طریقہ ہے ۔ اس سے شاید وہ لطافت تو حاصل ہو جاتی ہے کہ سیرِ ارض کر لیں ۔ ہوا میں اڑ کر دکھا دیں ۔ مگر ان کی حقیقت سوائے نفس کی طاقتیں حاصل کر لینے کے اور کیا تھا ۔ نہ ان طریقوں میں حقیقت کی جھلک مل سکی ۔ نہ کوئی دائمی اقدار جو مرنے کے بعد بھی قائم رہتیں ۔ یا جن سے حیاتِ روح حاصل ہوتی ۔ یہ تو سب کچھ جسم و جان اور اس زندگی کے دھندے تھے ۔ یہ زندگی ختم ہوئی اور ابدی موت ۔ نہ ان کی روحوں کا کچھ پتہ نہ ان کے مزارات یا چلہ کشی کی جگہوں سے بعد میں آنے والوں کو کوئی فیضان مل سکا ۔

اس تپسیا اور سخت کوشش میں سے گزرنے کے بعد بالآخر گوتم بدھ نے بھی یہی نتیجہ نکالا کہ یہ سب فروعی باتیں ہیں ۔ موت و زیست کے چکروں، آواگون سے نجات اور مُکتی حاصل کرنے کے لئے ایک پاکباز زندگی، عاجزی، مسکینی اور توکل میں

گزارنے کے لبعد انسان کو نروان ملتا ہے ۔ اُس نے شاید حقیقت کی جھلک بھی پالی ۔ روحِ اعظم کی سطح تک بھی رسائی ہوئی ۔ مگر جس بیقرار روح کو مردہ سکون کی جگہ ایک عشق کی وارفتگی ایک بے قراری ، ایک فروغِ کن کی سرشاری نصیب ہو ، وہ مُکتی اور نجات کی تو کیا پرواہ کرتا یا اس فکر میں کیا رہتا کہ آتما ، پرماتما سے مل جائے یعنی رُوح ، حق سے مل جائے ۔ جن زندہ روحوں میں حیّ وقیوم کے انوار تابانی دینے لگیں وہ سکوُن یا نروان یا وصالِ حق میں کہاں اپنے کو گمُ کردینے یا ضم کردینے کا تصوّر لائیں ۔ اُن کو ان تمام ساکن منازل سے گزر جانا ہے ۔ انہیں تو ہر منزل کی لا کرنی ہے ۔ نفس کی لا ، قلب کی لا ، روح کی لا یہاں تک کہ توحید فی الترک ، توحید اور بالآخر ترکِ ترک ۔ البتہ ان فناؤں کے لبعد بقا ہے ۔ لا اِلٰہ کے لبعد الا اللہ میں بقا اور محمد الرسول اللہ میں قیام ۔

خیر یہ منازل تو ابھی لبعد کی باتیں تھیں ۔ اس اٹھتی جوانی کے زمانہ میں تو قبلہ کو وہ سارے تجربات اور مشاہدے کرنا تھے جن سے گزر جانا آسان بات نہیں ہوا کرتی ۔ کوئی کسی جگہ تجلّی دیکھ کر اسی میں عمر گزار دیتا ہے ، کوئی انعامات واکرامات حاصل ہونے پر ان ہی میں گھر جاتا ہے ۔ کوئی مختلف قوتوں کو حاصل کر کے اُن ہی کو اپنی منزل سمجھ بیٹھتا ہے ۔ یوں بھی فقراء یا ہندو لیوگی کسی کو اپنے قریب اتنا کہاں لاتے ہیں کہ ان کے اندر کوئی گھس کر جھانک سکے ۔ ہندو طریقہ تصوف کو قریب سے دیکھنے اور آزمانے کی اس لئے ضرورت تھی کہ معاملِ امر میں ان کے دخل کی حد معلوم کی جاتی ؟ اور یہ بھی معلوم کیا جاتا کہ یہ لوگ بھی عالمِ مثال میں دسترس رکھ کر کس طرح کاروبارِ عالم کو ایک رُخ دیتے ہیں ۔ آخر ہمالہ کی پہاڑیوں پر دریاؤں اور سمندروں کے کنارے گھنے جنگلوں ، تاریک غاروں میں جا کر یہ لوگ کیوں بیٹھ جاتے ہیں ؟ فرد اور قوم کی سطح پر یہ لوگ عمل پیرا ہیں کس طرح ۔ اور اپنے اسلامی تصوف کی

کس سطح سے ان لوگوں کے اثرات کو زائل کیا جا سکتا ہے؟

ہندو مذہب کے چیلوں کو یوں بھی مسلمان کا سایہ اپنی مقدس جگہوں، عبادتوں اور ریاضتوں کے مقامات پر دیکھنا کب گوارا ہوتا ہے۔ ان کے بعض مندروں میں تو داخل ہونے کی اتنی سخت پابندی ہے کہ اگر کوئی مسلمان غلطی سے بھی ادھر قدم رکھ دے تو قتل کر دیا جائے قبلہ جہاں عام جگہوں پر گئے وہاں ان جگہوں کو دیکھنے اور ان کا جائزہ لینے کا شوق تو اتنا تھا کہ جان جوکھوں میں ڈال کر جانا بھی نہ چھوڑا۔ بڑے بڑے مہنتوں اور رشیوں سے دور دراز مقامات میں ملاقاتیں کیں۔ اسی شوق میں ایک دفعہ اُن کی شرائط کے تحت شدھی ہونے کا ڈرامہ بھی کھیلا۔ مگر ارنا چلم (جنوبی ہند) کا وہ مندر ضرور دیکھا جس میں داخلہ سوائے ہندوؤں کے ممنوع ہے۔

الغرض قبلہ نے اس قوم کی عمل پیرائی فراستِ عقل کی سطح پر بھی دیکھی، اور پرکھی، نفس کُشی کی سطح کا عروج بھی آزمایا۔ ان کی روحانی طاقتوں اور تصرفات کو بھی جانچا اور اُن کی خشک توحید کا بھی علم و عرفان حاصل کیا۔ تفصیلات کو پسِ پُشت چھوڑ کر دو ایک واقعات کا ذکر کر دینا خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ اس سے ایک ہلکی سی جھلک اس قوم کے فکر و عمل کی شاید مل سکے گی۔ فراستِ عقل اور ذہنِ رسا کی لامحدود وسعتوں کے تماشے یہ لوگ بہت سے دکھا لیتے ہیں۔ مثلاً جنوبی ہند میں ایک شخص سو لوگوں سے مختلف کھیلوں کی بازیاں لگا کر مقابلہ کرتا تھا۔ کہیں شطرنج کی کئی کئی بازیاں لگی ہیں کہیں لوڈو۔ ڈرافٹ اور اسی قسم کے دوسرے کھیلوں کی۔ اسی طرح ایسے بھی دیکھے جو ایسے ایسے جادو، ٹونے ٹوٹکے کر کے دکھاتے ہیں جن سے عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اسی قسم کے ایک شخص نے جس نے کالی کو پوجا سے یہ شکتی (قوت) حاصل کی تھی قبلہ پر اپنے عمل کا کرتب دکھانا چاہا۔ قبلہ سامنے بیٹھ گئے۔ اُس شخص نے بہت

کچھ پڑھا مگر اثر نہ ہوا تو اس نے قدموں میں سر ڈال دیا۔ اور منت سماجت کی کہ مجھے اسی حال میں رہنے دیں۔ میں ازلی بدبخت ہوں۔ اس کا نام علی بابا تھا اور سادات سے تھا۔ یہ شخص بابا تاج الدینؒ کے دربار میں بھی عرصہ تک رہ کر روحانیت میں اپنی دسترس نہ پا کر، اسی گمراہی میں پڑ گیا تھا اور کالا جادو سیکھا تھا۔ قبلہ کی یہ نوعمری کا زمانہ تھا مگر چونکہ بابا تاجؒ کی پشت پناہی حاصل تھی اس لئے اس کے شر سے محفوظ رہے اور وہ خود قدموں میں آ گرا۔ اسی طرح کئی شعبدے باز سادھوؤں سے سابقہ ہوا مگر اس تمام خرافات سے کیا حاصل جسے لوگوں نے روحانیت کا نام دے رکھا تھا۔ ان راہ کھوٹی کرنے والوں سے دامن بچا کر گزر جانا ہی شرفِ انسانیت تھا۔ گو ان لوگوں میں قبلہ نے ایسے لوگ بھی دیکھے جو تنہائیوں میں یا ہمالہ کی پہاڑی پر بیٹھے ہیں۔ عمریں بھی بڑھا لی ہیں۔ شانت بھی ہیں۔ ایک قسم کا سکون بھی حاصل کئے ہیں۔ ان ہی میں ایک راونا مہارشی تھے جو صرف خصوصی دنوں میں اپنے غار سے باہر آ کر بیٹھتے۔ کسی سے بات نہ کرتے کوئی سوال کرتا تو اس کا جواب پرچہ پر لکھ کر دیتے۔ قبلہ نے اُن سے دریافت کیا کہ آخر اس نفس کشی، اس تارک الدنیا ہونے سے کیا حاصل۔ آخر آپ دنیا کے لئے کیا عمل کر رہے ہیں تو اس نے جواب دیا تھا کہ ہمارا دائرہ عمل دل کی سطح سے ہے یہ نہیں کہ ہم کسی سے بات کریں۔ بس ہم شانتی کی لہریں زمانہ میں نشر کرتے ہیں تو شانتی رہتی ہے۔ ایسے ہم دو چار ہی اگر ہو جائیں اور یہ کریں تو دنیا میں جنگیں نہ ہوں اسی طرح ہم کسی قوم کے لیڈر کے ذہن میں اپنے خیالات نشر کر کے اُس قوم کی راہِ عمل مقرر کر سکتے ہیں۔ اس رشی سے قبلہ کو اپنی آئندہ زندگی کے لئے، اس راہ میں کچھ دسترس حاصل کر لینے کے بعد اپنے لئے بھی راہِ عمل نظر آئی۔ قبلہ کو معلوم تھا کہ نورِ محمدی سے یہ لوگ محروم ہیں اسی لئے ایسوں کا دائرہ عمل محدود ہے۔ خشک توحید اور زمانے سے ایکائی سی انہیں ضرور حاصل ہے۔ مگر

رحمتِ محمدی، نسبتِ محمدی سے یہ لوگ محروم ہیں۔ رحمتی وسعت کلّ شیئی، والی بات ہے اس کے رابطے کے بعد، رحمت کے نشر سے، مسلمان قوم کے کام بن سکتے ہیں۔ کُن کے فیضان سے، عالم امر سے کار فرمائی کرنے سے یہ لوگ محروم ہیں مگر مسلمان کو یہ امر نصیب ہے۔ پہنچے تو صاحبِ امر کے مقام تک۔ پھر بھی کوشش والی بات، کہ چند ایک مل کر یہ شانتی اور سکون کی لہریں اپنے اندر اپنا کر زمانہ میں نشر کریں، قبلہ کو ایسی بھائی کہ عالم امر پہ بھی جمعیت بندی اور ایک توحیدِ فکر مسلمان فقراء میں قائم کرانے میں اس امت کے آئندہ فروغ کی راہ دیکھی۔

اس لئے یہ ظاہر یہ ہندوؤں، فقیروں، سادھوؤں، رشیوں کی صحبتوں میں وقت گزارنا، ایک بھٹک جانا تھا۔ نہ اپنی راہ کھوٹی کرنا تھا۔ نہ اندھیروں میں راہ ٹٹول کر چلنا تھا۔ نہ روحانیت کی قوتیں حاصل کرنا تھا بلکہ اس کے پیچھے بھی وہی قومی درد تھا جس میں اس بھٹکی قوم کو ایک راہِ عمل، ایک نصب العین کی نشاندہی کرانا تھی۔ دین نہ کتابوں میں تھا نہ چند ارکان کی ظاہری پابندی کر لینے میں۔ حقیقت کچھ اور تھی۔ اس حقیقت کا نہ صرف عرفان کرنا تھا یا اسے اپنے میں سمو کر بیٹھ جانا تھا بلکہ خود بھی اس منزل پہ پہنچ کر اس کے نشر کا ذریعہ بننا تھا۔ اب ایک نئی راہ کی نشاندہی قلب و دماغ کے کسی گوشے میں قبلہ نے ڈال کر آگے کی منزل کی طرف قدم بڑھائے۔ یہ راہ سوائے اس کے کیا ہو سکتی تھی کہ جمعیت بندی، توحیدِ فکر۔ ہر سطح پر قوم کو نصیب ہو۔ جسمانی سطح پر، ذہنی سطح پر عوام کو اور قلب و روح کی سطح پر، امر کی سطح پر بھی وہی توحیدِ فکر فقراء میں، اور ان ارواحِ مقدسہ میں جو لپس پردہ عالم بالا سے بھی اس امت کے انفرادی اور اجتماعی کاموں میں عمل پیرا ہیں۔ اب قبلہ نے اسی نظریے اور اسی خیال کو لے کر اپنی آئندہ زندگی میں کوشش کرنے کی ٹھانی۔ منزل ابھی بہت دور

تھی ابھی تو اپنے فقر کی ابتدائی منازل ہی بابا تاجؒ کی شفقت اور پشت پناہی میں گزری تھیں۔ آگے کی فکر اب جو لگی وہ بس یہی تھی کہ حقیقت کو سمونا اور اس کو نشر کرنا اور اس کے بعد فقراء اور ارواح مقدسہ میں توحیدِ فکر قائم کرا کے امت کو فروغ کی راہ پر ڈالنا ظاہر ہے کہ ابھی تو پہلی ہی منزل در پیش تھی یعنی حق کو سمونا۔ بغیر راہبر کے یہ منزل بھی کیسے پار ہوتی۔ اسی لئے فقیر فقراء سے ملاقاتوں کا شوق اور بھی بڑھ گیا کہ راہ روانِ جادۂ حق کے ذریعہ ہی حق کی راہ ملنا آسان تھا۔ مگر ساتھ ہی یہ بھی طے تھا کہ نہ کہیں قیام کرنا ہے نہ تھوڑے سے ہی کو حاصل کر کے ان مقامات کے لوگوں میں اُلجھ کر دہیں کا ہو رہنا ہے۔ بلکہ وہی منزلِ معراج امتی امتی۔ حیاتِ امت۔ فروغِ امت

چلتا ہوں دو قدم ہر اک راہ رو کے ساتھ
پہچانتا نہیں ہوں ابھی راہبر کو میں

علی گڑھ کے قیام کے دوران قبلہ نے ایسے تعلیم یافتہ طبقہ سے ہم مجلسی اور رابطہ رکھا جو فراست و دانائی کے علاوہ حُسنِ اخلاق کا نمونہ تھے۔ ان صاحبِ دانش لوگوں میں نہ عقل کی بخیہ گری تھی نہ فراست کی عشوہ گری۔ اُن کی زندگیاں سادہ تھیں۔ اُن کے دل جذبۂ خدمتِ قوم سے لبریز تھے۔ ان میں سے ہر ایک مخصوص مکتب علم و فکر سے تعلق رکھتا تھا۔ یوں تو قبلہ کی وائس چانسلر ڈاکٹر سر ضیاء الدین سے لے کر سارے ہی پروفیسروں سے اچھی راہ و رسم تھی مگر جو لوگ قریب سے قریب تر ہوتے گئے۔ ان میں ڈاکٹر ایم۔ ایم۔ احمد۔ ڈاکٹر مغنی۔ ڈاکٹر ذکی الدین، پروفیسر تمیم، پروفیسر کرار حسین اور اختر حمید صاحب قابلِ ذکر ہیں۔ قوم کو ایک نصب العین کی روشنی میں، فروغ کی راہ پر گامزن کرانا دانشوروں کا حصہ ہوا کرتا ہے۔ ڈاکٹر احمد فلسفہ کے ماہر۔ ڈاکٹر مُغنی سائیکولوجی۔

ڈاکٹر ذکی فزکس ۔ پروفیسر شمیم کیمسٹری ۔ پروفیسر کرّار حسین اقتصادیات اور اختر حمید صاحب معاشیات میں یدِطولیٰ رکھتے تھے ۔ علم وعقل کی ظاہری سطح سے دیکھا جائے تو سب کے سب ایک ہی جسم کے اعضاء، ایک ہی توحیدِ فکر میں زندگیاں گزارنے والے نظر آتے تھے ۔ یہ سب ایک ہی جذبہ سے سرشار تھے کہ نئی نسل کو تعلیم وہدایت کی وہ روشنی عطا کی جائے جو مستقبل میں قوم کے مختلف زندگانی کے پہلوؤں کو مستحکم کرنے کی ضمانت بنے ۔ ان لوگوں کا یہ خلوص ان کی نجی زندگیوں میں بھی ان کی انفرادی آب وتاب کی ضامن بن گئی اور ان کی صحبت اور تعلیم سے جن لوگوں نے فیضان اٹھایا وہ خود ان کا سا تاثر، ان کی سی عقل ودانش، ان کا سا عقل وتدبر ان کی سی قلب وروح کی صلاحیتوں سے مستفید ہوئے ۔ اس طرح وہ لوگ بھی ان کے مقناطیسی حلقۂ اثر میں آکر، دین ودنیا کو توازن میں لئے زندگیاں گزارنے اور اس روشنیٔ باطن کو نشر کرنے میں دوسروں کے لئے نمونہ بنے اور صاحبانِ عقل ودانش نے یہ جان لیا کہ اپنی ذہنی، جسمانی، قلبی، روحانی صلاحیتوں کو بروئے کار لاکر ہی حقِ زندگی اور شکرانۂ بندگی ادا ہو سکتا ہے ۔ اس سے آگے حق کا عرفان یا حقیقت تک رسائی البتہ ہر فرد کے لئے اس کی انفرادی یکتائیت ہی پر منحصر ہے ۔ اور ہر فرد اپنے ذاتی تجربہ کی بنا پر ہی یقین کی سطح تک پہنچ سکتا ہے ۔ حق بندے کے گمان کے مطابق ہی ہے ۔ جیسا سوچو گے، حق ویسا ہی ہے ۔ حاضر سمجھتے ہو تو حاضر ہے ھوالظاہر ھوالباطن، سمجھتے ہو تو ایسا ہی ہے ۔ ھوالاول ھوالاخر سمجھتے ہو تو ایسا ہی ہے ۔ اللہ نورالسمٰوات سمجھتے ہو تو ویسا ہی ہے ۔ رحمٰن، رحیم، حی، قیوم، قدوس الغرض ۹۹ ۔ اسمائے ذاتی کی جھلکیوں میں سے جو بھی اپنے مقدر، اپنے اندر ودیعت شدہ صلاحیتوں کی روشنی میں اپنے پر تجلی دے جائیں ۔ یہ سب کے سب وہ تھے جو محض علمی عقیدہ کی بنا پر کسی چیز کو مان لینے کی بجائے تفکروں کے قائل تھے ۔ ایک سائنسی اور تحقیقی نکتۂ نگاہ

سے ہر شے کو پرکھنے اور ذاتی تجربہ اور مشاہدہ کی بنا پر کسی نتیجہ پر پہنچنے کو افضل سمجھتے تھے۔
البتہ عام عقل و دانش کی حدود سے پرے وہ چھٹی حس، نورِ عقل، القا کو بھی ایک مقام
اپنی زندگیوں میں دے کر ربِّ زِدنی علماً و فہماً کی وجودی تصویر بن گئے تھے۔ کیونکہ
بغیر فہم کی حد تک پہنچے انہوں نے ہمیشہ علم کو تشنہ ہی پایا۔ ان لوگوں کی مجلسوں میں اکثر دقیق
مسائل پر ہی گفتگو رہتی۔ اس طرح ان کا ذہنِ رسا ایک دوسرے کی منجھائی اور صفائی کا
ذریعہ بنتا رہا۔ گویا صاف شفاف موتی ایک دوسرے سے گھس گھس کر، روز نت نئی آب و تاب
نکال رہے تھے۔ ان صحبتوں کے درمیان جہاں ان میں سے ہر ایک نے اپنی اپنی راہ تعین کر لی
وہاں قبلہ نے بھی علم و دانش کے محدود حدوں سے پرے القا، نورِ عقل، علمِ لدنی کی راہیں تلاش
کرنا شروع دیں اور اپنے ذاتی عروج سے کہیں زیادہ جمعی فلاح، جمعی فروغ کی اہمیت کو سمجھا۔
فرد کو فنا تھی، جمیعت کو بقا۔ اسی نصب العین، اسی جمیعت کے فروغ کے لئے، ہر انسان کے
اُن باطنی سرچشموں کو کشادہ کرنا تھا، جو قدرت نے اُسے ودیعت کئے ہیں۔ گویا فروغِ ظاہری کے
لئے ارتقاءِ باطن کو ضروری سمجھا۔

علی گڑھ کے قیام کے دوران فقیر فقراء کی صحبتوں میں اکثر قبلہ کی راتیں گزرتیں۔ ان میں
سے خصوصی طور سے قابلِ ذکر وہ وارثی فقیر تھے جنہیں اکثر علی گڑھ والوں نے یونیورسٹی جانے والی
سڑک پر آتے جاتے دیکھا ہوگا۔ کپڑے زعفرانی۔ لانبے زلفوں والے بال۔ خوبصورت سفیدی
مائل داڑھی، ننگے پیر، سُبک رفتار۔ یہ فقیر صاحب اکثر حضرت وارث علی شاہ کے قصے سناتے
بیدم شاہ اور عنبر شاہ کا کلام پڑھتے۔ ان وارثی لوگوں کی محبت، عجز، سادگی دیکھ کر قبلہ کو رشک
آتا۔ دنیا میں رہتے ہوئے دنیا سے کنارہ کشی۔ جیسے کیچڑ میں پاؤں ہوتے ہوئے بھی کیچڑ پاؤں پر
نہ لگے۔ یہی کچھ تو حضرت وارث علی شاہ صاحب نے ابھی اکثر دکھایا تھا کہ کیچڑ میں سے گزر کر

آئے ہیں، سفید چاندنی پر آکر بیٹھ گئے اور چاندنی پر پیروں کے نشان نہ پڑے۔ ان ظاہری نشانیوں کے پیچھے قبلہ نے وہ باطنی نشانیاں بھی پکڑ لیں اور اپنا لیں جو لبسِ پردہ حقیقت میں تھیں جو حقیقی باطنی پاکیزگی حاصل کر چکا ہو اس پر یہ دنیاوی آلودگیاں کوئی اثر نہیں کر سکتیں۔ پھر اس حُسنِ باطن والے سلسلہ کے صاحبِ سلسلہ وارث علی شاہ صاحب کا حُسنِ باطن دیکھنے کا شوق اور بڑھا۔ بشارت میں قبلہ نے دیکھا کہ ایک نہایت مرصّع، نورانی چلمن ہے۔ جس کی خوبصورتی اور حُسن دیکھ کر ہی انسان اتنا مسحور ہو کہ چلمن کے اندر کیا جھانکنے کی تاب۔ جس کی چلمن اتنی خوبصورت ہو وہ لیلیٰ کتنی خوبصورت ہو گی۔ اندر جھانکا تو وہ نور کا سراپا دیکھا کہ آج بھی اس کے تصور سے، روح میں ایک ہیجان بپا ہو جاتا ہے۔ بے حجابانہ دیدار کی تاب لانا بھی آسان بات نہیں۔ نورِ محمدؐ، گیسوئے محمدؐ، خوشبوئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ کعبہ کا کعبہ رُخِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

علی گڑھ میں کشمیری بابا کے ساتھ اکثر محفل رہتی۔ فقیری، قوّالی، معرفت کی باتیں خود بیتے احوالوں کی داستانیں۔ ان کشمیری بابا کے بہت سے معتقد بھی تھے۔ اور بہت سے فدائی بھی۔ ان بابا کو ان کے مرشد نے بشارت میں حکم دیا کہ کشمیر جا کر بیٹھیں۔ انہوں نے بار بار بشارتوں کی پرواہ نہ کی اور طُرفہ تماشہ یہ کیا کہ شادی کرنے روانہ ہو گئے۔ واپس آئے تو حکم عدولی کی یہ سزا ملی کہ خدا معلوم کیا ہوا کہ ان کے مریدوں اور معتقدوں نے مل کر اتنا پیٹا کہ ٹانگیں بھی توڑ دیں۔ اب یہ برسوں سے کسمپرسی کے عالم میں پڑے رہتے۔ قبلہ کو ترس آتا بابا قادر اولیاء کے یہاں دیجانگرم حاضر ہوئے تو بہت منت سماجت سے کشمیری بابا کی سفارش کی۔ بابا جان نے آنکھیں بند کر لیں پھر کھولیں تو نہایت قہر آلود انداز میں فرمایا۔ دیکھو جی عبید اللہ! تم کسی کے معاملہ میں دخل اندازی مت کیا کرو۔ ایک در سے ٹھکرایا تو سارے دروں

سے ٹھکرایا جاتا ہے۔

علی گڑھ میں قبلہ خصوصی عقیدت کے ساتھ مولانا سلیمان اشرف کے پاس بھی حاضر ہوا کرتے۔ قبلہ کا فرمانا ہے کہ مولانا دن میں کٹر مولوی اور رات کو مست فقیر ہوتے تھے۔ قبلہ سے ان کی ملاقات اکثر تنہائی میں رات کے وقت ہی ہوتی۔ اس وقت مولانا ایک مستی کے عالم میں ہوتے تھے۔ مثنوی کے شعر پڑھتے، گاتے، جھومتے، رقص کرتے۔ حالت ہی کچھ عجب ہوتی تھی۔ اسی لئے مولانا کا یہ انداز قبلہ کے رگ و جان میں سماگیا۔ اندر سے خسرو جیسا سوز اور باہر سے ہوشمندی عقلمندی۔ مولانا کو بھی قبلہ سے خصوصی دلچسپی تھی۔ اکثر غالب یا مثنوی کے کوئی شعر سُنانے کو کہتے۔ خود شعر پڑھتے۔ سر دُھنتے۔ عمامہ اتار ڈالتے۔ کھڑے ہو کر رقص کرنے لگتے۔ علی گڑھ میں بہت ہی شاذ و نادر لوگوں کو مولانا کی اس خصوصی کیفیت سے شناسائی ہوگی۔ مولانا کا یہ انداز کہ دن دنیا کا، رات یار کی، قبلہ کی زندگی کا بھی سرمایہ بن گیا۔ دن میں مولانا عوام کے آگے ایک ماہرِ فن عالم متقی، پارسا، شرع و آئین کی پابندی کا مجسمہ بن کر پیش ہوتے۔ دن کا کوئی وقت ایسا نہ ہوتا جو درس و تدریس عبادت و ریاضت میں صرف نہ ہوتا ہو۔ کبھی محفل میلاد ہوتی تو مولانا خود تقریر فرماتے۔ علم و عرفان، عشق و محبت کا ایک دریا بہا دیتے۔ پھر جب سلام ہوتا۔ قدم مبارک، مُوئے مبارک کے تبرکات باہر نکالے جاتے تو حاضرین شاہد ہیں کہ محفل پر انوار کی بارش ہوتی ملائکہ کا نزول ہوتا۔ سرکار کی سواری تشریف لاتی۔

اسی زمانہ میں صوفی نذیر احمد سے قبلہ کی ملاقاتیں رہتیں۔ صوفی صاحب۔ ایمان کا پہاڑ ہیں۔ جہاں سنگھیوں کا مجمع ہو یا کرپان نیزے اور تلوار کھولے سکھوں کا۔ صوفی صاحب کو جب بھی جوشِ ایمان آتا ان لوگوں کے جلسوں میں بے خطر چلے جاتے۔ لوگ اس غیر معروف

اور کھلے مسلمان شخص کو روکتے تو صوفی صاحب پاسبانوں کو ہٹاتے، دندناتے، اسٹیج پر آدھمکتے کہ مجھے بھی کچھ کہنا ہے۔ اگر کوئی موقع نہ دیتا تو خود کھڑے ہوجاتے اور وہ وہ صلوٰتیں سناتے کہ وہ دنگ رہ جاتے۔ اُن ہی کی کتابوں کے حوالے سے انہیں قائل معقول کرتے۔ شرمندہ کرتے اور چلے آتے۔ رات کو سوتے تو دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ ایک نُور کا کھمبا، سینہ سے اُبھرا ہے جو چھت سے گزر کر آسمان تک گیا ہے۔ کھانا کھاتے تو ایسے شوق اور انہماک سے جیسے ایک ایک نوالہ محبوب اپنے ہاتھوں سے کھلا رہا ہے۔ یہ ہیں صوفی صاحب، تسکرانۂ بندگی کی چلتی پھرتی تصویر۔ استغفارِ وجد کی تفسیر۔ ایمانِ محکم کی کھُلی شمشیر۔ کلمۂ لا اِلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی نورانی تنویر۔

قبلہ کو اکثر دہلی قلندر عبدالسلام کے یہاں حاضری دینے کا شوق ہوتا۔ قلندر صاحب نجیب الطرفین سادات میں سے تھے۔ علومِ دینی، درسِ نظامی، قرآن، تفسیر، حدیث، فقہ کے ماہر۔ ایک بحرالعلوم اور ساتھ ہی گنج العلوم۔ معرفت کا خزانہ۔ فقیر۔ قلندر۔ چار موصاف اور حضرت بو علی قلندرؒ سے نسبت رکھنے والے، وہ گرجتی آواز۔ وہ بے مہابا تقریر ایک دریائے رواں کی طرح گھنٹوں بولتے۔ علم و معرفت و حقیقت کے دفتر کے دفتر بیان فرماتے۔ قبلہ بھی اس گنج العلوم سے سیراب ہونے اکثر قلندر صاحب سے ملاقات کرنے شفقت سے پیش آتے۔ بہت کچھ دینا چاہتے تھے۔ ایک دفعہ بسم اللہ کی تفسیر فرمانی شروع کی تو ۲، گھنٹے یہ تفسیر ختم نہ ہوئی۔ ریل سے جانے لگے تو ساتھ قبلہ پلیٹ فارم پر بھاگتے رہے اور یہ تفسیر جاری تھی۔ پھر ڈھائی سال تک لا الہ کی تعلیم دیتے رہے۔ قبلہ نے عرض کی کہ کوئی ایسا شخص دکھا دیجئے جس نے اپنی زندگی میں کلمۂ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پورا کر لیا ہو۔ اس پر قلندر صاحب کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور خاموش ہو

گئے۔ حضرت عطاؒ نے بھی کہا تھا کہ زندگی میں لا الہ بھی کس کی پوری ہوئی ہے۔ قبلہ کا اس زمانہ میں بابا قادر اولیاؒ سے تعلق قائم ہو چکا تھا۔ اس لئے اب بابا جان کے پاس جاتے ہوئے شرم آتی تھی کہ یہ دوسری جگہ سے کیسے انعامات و اکرامات اور تعلیم کے طالب ہوئے۔ پھر ہمت کر کے بابا جان کے پاس پہنچے۔ بابا جان نے خود ہی فرمایا کہ کوئل، بھولا سا جانور ہے مگر اپنے انڈے کوّے کے گھونسلے میں رکھ دیتا ہے۔ کوّا اپنے سمجھ کر بچے نکالتا ہے اور پالتا ہے۔ پھر جب بچوں کے پر آجاتے ہیں تو کوئل ایک آواز دیتی ہے اور بچے اڑ کر ماں کے پاس چلے جاتے ہیں

تقسیمِ ہند کے وقت علی گڑھ میں ہندو مسلم فسادات کا خطرہ زور پکڑ رہا تھا۔ راتوں کو جاگا جاتا۔ خاکسار تحریک والے اور دوسرے لوگ علی گڑھ والوں اور یونیورسٹی کو بچانے کی تدابیر کرتے۔ خطرہ بڑھتا جا رہا تھا کہ جن سنگھی آس پاس کے شہروں اور گاؤں میں لوگوں کو تیار کرنے میں لگے ہیں کہ ایک لشکر سا بنا کر علی گڑھ پہ حملہ آور ہوں قبلہ چند ساتھیوں کو لے کر بچتے بچاتے قلندر صاحب کے پاس دہلی پہنچے۔ اور عرض کی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ مسلمانوں کا قتل عام ہو رہا ہے اور آپ چُپ بیٹھے ہیں۔ قلندر صاحب نے فرمایا کہ ہیں کتنے مسلمان۔ تو قبلہ نے عرض کی کہ اعمال کیسے ہی ہوں مگر آخران عورتوں، بچوں، بوڑھوں، جوانوں کی یہی تو خطا ہے کہ کلمہ پڑھتے ہیں محمدؐ کے نام لیوا ہیں۔ اس پر قلندر صاحب کا چہرہ سُرخ ہو گیا۔ فرمایا اچھا جاؤ لوگوں کو کہہ دو کہ ہر چوک پر کھڑے ہو کر بہ آوازِ بلند ھواللہ اَحَد اللہ الصمد پڑھیں واپس علی گڑھ پہنچے۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا۔ اور دو ایک دن میں خبر لگی کہ وہ جن سنگھی جو دوسرے گاؤں اور شہروں سے لشکر لے کر چلے تھے اور علی گڑھ سے دور خیمہ زن تھے ان میں آپس میں پھوٹ پڑ گئی اور نوبت یہ آئی کہ ایک دوسرے کا سر توڑ ڈالا۔ اس طرح وہ ہاتھیوں کا لشکر خود ہی برباد ہو گیا۔

باب ۵ ڈگر پنگھٹ کی

روح کا وہ شعورِ ازلی۔ وہ آدمؑ کی مٹی کا گوندھا جانا تمام انسانی جسموں کی وہ بنیاد اولین۔ پھر روح کا اس جسم میں پھونکا جانا۔ امرِ ربی کا اجراء اس جسدِ انسانی سے۔ آدم کے صُلب میں ہر ذی وجود کا مرکز و مخرجِ اولیں۔ کروڑوں سال کے ارتقائے جسمانی کا شعور۔ روح کی وہ منازلِ ارتقاء۔ پھر سلسلہ در سلسلہ وہ انبیائے سابقہ کی زندگیوں میں ارتقائے روحانی کی منازل کی کڑیاں اور بالآخر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ مبارک میں اس ارتقاء کی تکمیل۔ ایک ہی سلسلہ وار ارتقائی داستان کی منازل ہی تو تھیں جن کا روحانی شعور ہر شعورِ ازلی رکھنے والی روح کو اس زندگی میں بھی میسّر آتا تھا۔ حیاتِ انسانی کے ارتقاء کے مطابق وہ انبیاء کا ورود، صحائفِ آسمانی کا نزول جس کی تکمیل اور تصدیق، قرآن کریم کے ذریعہ ہوئی۔ قرآن وہ آخری پیغامِ احسان، انسانیت پر۔ اسلام وہ دین فطرت، عین فطرتِ انسانی کے مطابق۔ ہدایت متقی لوگوں کے لئے۔ ایک شرعِ زندگی، ایک طریقتِ بندگی۔ پھر وہ نبیوں کی داستانیں۔ مرکزِ خطاب، تمام عالمِ انسانیت اور تکمیل پیام کا وجودی پیکر، تمام عالمِ انسانیت وہ بزرگوں کی صحبتیں۔ فقراء کی محفلیں، مذہبی مجالس، بزرگانِ دین کے قصے۔ انبیائے کرام کی داستانیں بچپن کی زندگی میں بھی ایک ذی شعور ہستی کے لئے وہ جاذبیت کیسے نہ رکھتیں کہ جیسے یہ سب داستانیں اُسی سے کہی جا رہی ہیں۔ اُسی کی داستان بیان ہو رہی ہے۔ اُسی کو یہ نورِ ہدایت عطا ہو رہا ہے۔ جزو کو کُل کا شعور دے کر۔ قطرہ کو سمندر کا شعور دے کر طرح طرح سے یہ بتایا جا رہا تھا کہ جملہ موجودات حق کی تصویر ہے۔ ہمیشہ یہ تصویر رہی اور ہمیشہ

رہے گی ۔ نہ کبھی نامکمل تھی نہ ہے۔ ایک نمودِ کن جاری ہے ۔ مقصدِ آفرینش اسی سے معمور ہے ۔ اس کُن کے شعور کو ارتقاء کہہ لیں ۔ اس کائنات کو کھلی کتاب کہہ لیں ۔ اس جسمِ انسانی کو اُم الکتاب کہہ لیں ۔ پڑھ اپنے رب کے نام سے ۔ پڑھ کر تفکّر کر لیا ، لطف تو آیا ۔ مگر اپنے جسم کی تجربہ گاہ میں عمل کر کے بھی تو دیکھ لیں کہ اُن داستانوں کا اپنے سے تعلق بھی تو قائم ہو ۔ پڑھنا کیا ، ہو کر دیکھیں ۔ تھوڑا بہت عمل کر کے دیکھیں کہ آخر یہ خیالی باتوں یا صرف عقلی تعلیم تک کی بات نہ رہ جائے ۔ حکمت کی باتیں کیا صرف کتابوں یا دماغوں میں محفوظ ہوں یا صرف عقل کے طاق اور ذہن کی الماری میں دھری رہیں ۔ یا اس کی جگہ اپنی عملی زندگی میں وہ ذاتی تجربے کئے جائیں کہ روزمرہ زندگی میں ان کی عمل پیرائی ہونے لگے اور قلب پر نازل ہوں ۔

چنانچہ قبلہ دُرّانی صاحب نے بچپن اور لڑکپن میں عملی طور پر مختلف طور سے اپنی زندگی پر تجربہ کر کے دیکھا کہ غریبی ، افلاس ، ناداری ، بھوک ، بیماری ، بدنامی ، ٹھکرایا جانا ظلم کی سختیاں جھیلنا ، تنہائی کی اذیت برداشت کرنا وغیرہ کیا ہوتا ہے جب تک خود پر سے یہ حالتیں نہ گزریں دوسروں کا دردِ دل کیسے اپنایا جا سکتا ہے ۔ یہ دور بڑا طویل تھا اور بڑا صبر آزما بھی رشتہ دار ، عزیز ، ہم جماعت ساتھی ، ہاسٹل کے ساتھی ، بڑے بھائی سب کے سب یہ حالتیں دیکھ کر غم و افسوس کرتے ۔ ذہن کی خرابی گردانتے ۔ فقراء کی صحبتوں میں رہ کر بہک جانا تصوّر کرتے ۔ نہ اس حالت سے قبلہ کو روک سکتے تھے ۔ نہ اس حالت میں ان کا درد بٹا سکتے تھے ۔ اپنی طرف سے بہت کچھ دلجوئی کرنے کی کوشش کرتے لیکن اس حالت سے قبلہ کو نکال لینے کا راستہ بھی نہ پاتے ۔

داستانیں اس زمانے کی سینکڑوں ہیں جو نہ قبلہ سے دریافت کرنے کی ہمت ہے نہ سپردِ قلم کرنے کی اس جگہ گنجائش ہے ۔ مختصراً یوں سمجھ لیں کہ ہر قسم کی ابتلاء میں سے خود گزر کر

دیکھنے کا شوق ایسا سمایا تھا کہ اس آگ کو ٹھنڈا ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ وہ دکھی انسانیت کا درد جس کے عذاب سے بچنے کے لئے کم ہمت لوگ پہاڑوں، تنہائیوں، جنگلوں میں جا بیٹھ کر اللہ اللہ کرتے زندگیاں گزار دیتے ہیں۔ اسلام تو مصائب کا مقابلہ کرنے اور ان پر فتح حاصل کرنے کا سبق دیتا ہے۔ ہمدردیٔ انسانیت کا سبق دیتا ہے۔ تو اس راہ پر چلنے سے منہ موڑ لینا کیا بات ہوئی۔

چنانچہ کئی کئی دن بھوکے رہ کر دیکھا۔ پیاس کی شدتیں بھی آزمائیں۔ موسموں کی۔ سختیاں، دھوپ، برسات، جاڑا، گزار کر اس جسم کو ایک تربیت دی۔

غریبوں کے دُکھ درد کو، مالی امداد حسب مقدرت دے کر کم کرنے کی کوشش کی بھوکوں کو کھانا کھلانا سب سے مرغوب مشغلہ گردانا۔ دنیا کے ٹھکرائے ہوؤں کو اپنے کلیجہ سے لگا کر تسلی دینا۔ دوسروں کے کام آنا اپنی زندگی کا مقصد گردانا۔ قبلہ کے ایک علی گڑھ کے روم میٹ اللہ بخش کمالی صاحب حال ہی میں ایک صاحب کو ملے تو قبلہ کی بابت کہا کہ غریبوں کی دیکھ بھال کا جذبہ قبلہ میں طالب علمی کے زمانے میں بھی تھا۔ میں سینیئر ہونے کی وجہ سے انہیں حساب پڑھاتا تھا۔ ایک دن وہ ایسے کمرے سے غائب ہوئے کہ رات کو بھی نہ آئے۔ دوسرے دن بڑے اصرار پر بتایا کہ ان سردی کی راتوں میں صرف کرتے پجامے میں یوں نکل گیا تھا کہ دیکھوں یہ جو علی گڑھ کے کٹ پلے کے نیچے غریب غربا کھلے میں یا معمولی سائبانوں میں یہ سردیاں گزارتے ہیں ان کی کیا حالت ہے۔ چنانچہ میں نے اپنے کو صرف اخبار سے ڈھانکے رکھا اور کھلی جگہ میں رات گزار دی۔ اس کے بعد اب مجھے معلوم ہوا کہ سردی کی اذیت کیا ہے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ چوبیس گھنٹہ میں ان غریبوں کو ایک منٹ بھی آرام نہیں ملتا۔

اسی طرح ایک اور ساتھی نے بتایا کہ درانی صاحب کے ساتھ دوستوں نے دو ایک بار ایسا بھی کیا کہ رات کو جب وہ ہم لوگوں سے مل کر واپس جاتے تو ان کی سائیکل سے ہوا نکال دیتے اور وہ بغیر کسی سے کچھ کہے خاموشی سے اپنی سائیکل ہاتھ کے سہارے چلاتے چل دیتے۔ دوسرے روز بھی کچھ نہ کہتے۔ تو انہیں خود اس حرکت سے شرم آئی۔

اسی لڑکپن اور جوانی کے زمانے میں جہاں قبلہ نے بزرگانِ دین یا مشاہیرِ عالم کی زندگیوں کے کچھ واقعات سے تاثر لیا وہاں ان پر عملی پیرایہ میں کبھی کبھی اپنی ذات پر تجربہ کر کے بھی دیکھا۔ پیغمبروں کے حالات پڑھے یا سنے تو ان سے نسبت قائم کرنے کے لئے اپنی سوچ کے مطابق کچھ کر کے بھی دیکھنا چاہا جیسے کہ آخر وہ جو حضرت یحییٰ نے خویش واقارب سے قطع تعلق کیا۔ کیا بات تھی۔ جب یہ کر کے دیکھا تو کرتے کرتے سارا عالم ہی اپنا خاندان ہو گیا۔ الخلق عیال اللہ کی تصویر۔ کس چیز کو اپنا کہیں۔ سب کچھ ہی سب کی۔ خلقت کا دکھ درد اپنا دکھ درد بن گیا۔ ان کی دلجوئی، اپنا شیوہ ہو گیا۔ اپنی زندگی سب ہی کی زندگی ہو گئی۔ ایک ہی رشتہ میں سب منسلک ہو گئے۔

صبرِ ایوبی کو دیکھنا چاہا تو وہ زخم، ناسور، بیماری میں، غیر آباد جگہوں، گھوڑے پر لیٹ کر دیکھا۔ وہ صبر کی لذت، کیسی شکایت کیسا شکوہ۔ پوری زندگی صبر کی جیتی جاگتی تصویر بن گئی۔ باطن کے چراغ ان زخموں کے ساتھ روشن ہو گئے۔ وہ روح کی ازلی تنہائیاں کیسی۔ خدا اور بندہ ساتھ ہی تو تھے۔ باہر والے اس کیفیت کو کیسے پاتے کہ جب بھی کسی کو بیماری کی کرب و اذیت میں دیکھا تو اس کا غم کچھ ایسا اپنایا کہ اپنے پر بھی وہی حالت طاری ہو جاتی۔ بیمار کے ساتھ ساتھ خود بھی کم از کم ذہنی طور پر اس تکلیف میں سے گزر رہے ہوتے۔ اور پھر جب شوق بڑھا تو فقراء کی صحبتوں میں بیٹھ بیٹھ کر یہ عمل بھی سیکھ لیا

کہ کسی بیمار کی بیماری کس طرح اپنائی جاتی ہے اور کس طرح اسے اپنے جسم میں جذب کر کے، بیماری کو اپنے اوپر لے کر، اس مریض کی شفاء کا سبب بنا جاسکتا ہے اب معلوم ہوا کہ انبیاء کا اپنی ذات پر سختیاں جھیلنا اسی لئے تو ہوتا تھا کہ عالم انسانی کے اعمال کی کچھ اس طرح مکافات ہو جائے یہ عالی ظرفی، عالی ہمتی کی باتیں، تخیل میں بھی خود کر کے دیکھی جائیں تو رونگٹے کھڑے ہوتے ہیں۔
یہ تو عشاق کی باتیں ہیں کہ یار کے قہر کا بھی وہ اپنے ہی کو حقدار سمجھتے ہیں۔ یہی لوگ جانتے ہیں کہ سرمد نے کس جذبہ کے تحت کہا تھا ؎

یا تن بہ رضائے دوست می باید داد
یا قطعِ نظر زیار می باید کرد

قصہ مختصر صبر ایوبی کا رنگ کچھ قبلہ پر ایسا چھایا کہ اسی منزل میں بڑے بڑے عشق کے دعویدار فقراء سے میدان جیت لینے کی راہ دیکھی۔ اور جسم کا یہ حال ہوا کہ ایک بیماریوں کا جنجال کوئی ٹی۔بی، ایسی نہ تھی جو قبلہ کو نہ ہوئی ہو۔ گلانڈز کی ٹی بی، پھیپھڑوں کی ٹی بی، آنتوں کی ٹی بی ہڈیوں کی ٹی بی۔ آج بھی جسم کو دیکھیں تو گردن کے اردگرد گلانڈز کے آپریشن کے نشان۔ دائیں شانے کی ہڈی گل گل کر بہت زمانے سے ختم ہو چکی تھی۔ اب صرف رگوں ریشوں پٹھوں سے دایاں ہاتھ لٹکائے پھرتے ہیں۔ ریڑھ کی ہڈی کے تین مُہرے پہلے ہی گل چکے تھے۔ ان پر مہینوں پلاسٹر جسم کے پنجر کے گرد بندھا رہا پھر جب یہ کاٹا گیا تو اس کے بعد برسوں، سخت چمڑے کی ایک قبضہ دار کاٹھی، اس جسم کو سہارا دینے کے لئے پہنی جاتی رہی۔ اور اوپر سے قمیض۔ سینے کے دائیں جانب نیچے کی دو پسلیاں ایک رستے ہوئے ناسور سے تمام جوانی میں متاثر رہیں۔ اب تین چار سال سے وہ پوری ہڈیاں گل کر، سینہ کی وہ ہڈی بھی گل چکی ہے جو درمیان میں ان ہڈیوں اور سینے کے پنجر کو جوڑے رکھتی ہیں۔ اب سینہ کی ہڈیوں کے

لگے ہوئے پنجر کو جوڑے رکھنے کے لئے ان سینہ کی ہڈیوں کو ایک خود ساختہ فریم اور کاٹھی کے ذریعہ پیڈ و بیلٹ وغیرہ اور تسموں کے ذریعہ باندھ رکھا ہے اور اوپر سے قمیض زیب تن کر لی جاتی ہے۔ بہت کم لوگوں کو یہ معلوم ہے کہ تقریباً بیس سال سے یہ جسم کا پنجر اسی طرح بندھا ہوا زندگی گزار رہی جا رہی ہے۔ دنیا کے کام بھی کئے جا رہے ہیں۔ اسی حالت میں پرنسپلی کے بھی کئی برس گزارے۔ محفلوں میں بھی شرکت کی۔ ورکشاپ کے کام بھی ہوئے۔ اپنے ہاتھوں سے اوزاروں کے استعمال بھی ہوتے رہے۔ روزانہ گھومنا پھرنا جانا بھی رہا۔ بیماروں کی دوا دارو بھی کی گئی۔ دادرسوں کی داد اور فریاد بھی سُنی گئی۔ سفر بھی کئے گئے۔ بزرگانِ دین سے ملاقاتوں کا سلسلہ بھی جاری رہا اور ایک عالمی سفر میں جہاں گشتی بھی کی گئی۔

ب ن کے اور حصے دیکھیں تو دائیں ہاتھ کی انگلیاں ایک ایکسیڈنٹ میں ٹوٹیں۔ ڈاکٹر نے غلط جوڑ دیں وہ اسی طرح برسوں سے ہیں۔ گذشتہ میں ہاتھوں سے کام کرتے وقت کرسی پر گر جانے سے بائیں بازو کی اوپر کی ہڈی میں ڈبل فریکچر ہوا۔ یہی کیا جیسا کہ عرض کیا جا چکا ہے کہ ہر قسم کی بیماری اس جسم پر سے گزری ہے اور بیماریاں ہی کیا، کئی بار موت سے بھی اپنی زندگی میں دوچار ہو چکے ہیں۔ سانس ختم۔ قلب کی حرکت بند۔ کلکتہ میں امریکن ڈاکٹر نے دیکھا تین چار منٹ بالکل جسم مردہ۔ جب جان واپس آگئی تو وہ خود حیران۔ پشاور کی زندگی میں کم از کم پانچ بار اعزا اقربا نے دیکھا کہ چکر سا آیا، گر پڑے۔ سانس، نبض، دل کی حرکت بند۔ پھر دو ڈھائی منٹ بعد سانس واپس۔ تو سوائے عاجزی کے، اور عقل اس کا کیا حل پیش کرے۔ بس یہی کہا جا سکتا ہے کہ کوئی اور ہی قوت زندگی کا سہارا بنی ہوئی ہے اب اس جسم کے پنجرے میں روح مقید نہیں بلکہ سوار ہے اسی کے حکم پر یہ جسم کا ٹوٹا پھوٹا گھوڑا چل رہا ہے۔ کسی نہ کسی طرح یہ جسم کا پنجر اپنے وقت کی منازل طے کر رہا ہے۔ جسم و جان کو بندگی

قید سے کبھی کی آزادی مل چکی ہے اور لطف یہ کہ برسوں سے جو لوگ قریب سے دیکھ رہے ہیں ساتھ ہی لگے ہیں۔ ان تک نے کبھی یہ نہ دیکھا کہ سخت سے سخت تکلیف میں بھی چہرے پر مسکراہٹ یا آنکھیں اسی طرح روشن اور چمکدار نہ ہوں جو ایک صحت مند انسان کی ہوتی ہیں۔ ہونٹوں پر وہی مسکراہٹ نہ ہو۔ جس کو دیکھ کر غمزدہ سے غمزدہ انسان اپنے غم کا مداوا پا لیتا ہے۔ کبھی جو، ایسی کیفیات، تڑپا دینے والی کیفیات کے بعد، کوئی ساتھی دریافت کرتا ہے کہ قبلہ یہ جو ادھر روناد ھونا مچ گیا تھا اور آپ بالکل ختم تھے تو اس وقت آپ کی کیا حالت تھی تو مسکرا کر شعر پڑھ دیتے ہیں ؂

تمہیں کیا بتاؤں میں ہمنشیں ہمیں ملتے ہیں جو مزا ملا

نہ ملا مسیح و خضر کو بھی حیاتِ عمرِ دراز میں

یہ شعر قبلہ نے طالب علمی کے زمانہ میں پڑھا تھا اور کچھ ان کی زندگی میں ایسا چپکا کہ اس کی تہ تک خود ہی پہنچ کر دیکھا۔

صبرِ ایوبی کی اس داستان سے کہیں شدید وہ ذہنی اور قلبی اذیتیں ہیں جن سے قبلہ کو اپنی زندگی میں دوچار ہونا پڑا ہے۔ ان کی تفصیل بجائے خود ایک داستان ہے۔ وہی بات کہ سمندر کا کون سا کنارہ۔ کون سی گہرائی۔ تب ہی تو بابا جان نے دیکھ کر کہا تھا۔ صبری ندی۔ اوہ کتنی گہری، قبلہ کی زندگی میں۔ لعن طعن، بدنامی، حق تلفی، تہمت، بہتان، دشنام راستے میں رکاوٹوں کے طومار۔ کیا کیا بیان کیا جائے۔ برس ہا برس کی زندگی ان دل شکن اور صبر آزما واقعات سے بھری پڑی ہے۔ دیکھنے میں یہی آیا کہ قبلہ کے چہرہ پر خراب سے خراب بات کی وجہ سے بھی کبھی، تشکن نہ آئی۔ لوگوں نے مفت دوا کی تقسیم اور خدمت کو بھی شہرت حاصل کرنے کا ڈھنگ بتایا۔ تہمتیں اور بہتان گھڑے۔ مگر قبلہ نے ہمیشہ خندہ پیشانی سے

مُسکرا کر سب کچھ برداشت کیا ۔ لوگوں سے وہ برتاؤ رکھا کہ جن پر اپنا اختیار بھی تھا، جن کو گستاخی کی سزا بھی دی جا سکتی تھی ان کے آگے بھی اپنے کو ہی خطاوار گردانا ۔ ہر انسان کی عزتِ نفس کو احترامِ آدمیت کے مقام سے ہی نوازا ۔ اس مقام کی شریعت کی عملی تفسیر کتنے مردانِ خدا ہوں گے جو اپنی زندگیوں میں کر سکے ہوں گے ۔

اس فقیری میں گالیاں بھی کھانی ہیں اور دعائیں بھی دینی ہیں ۔ قبلہ کو بھی، فی سبیل اللہ برس ہا برس کی خدمت کا یہی صلہ ملا کہ دو ایک نے نہیں بلکہ کئی ایک اصحاب نے لوگوں کے چھوٹے چھوٹے مجمعوں میں، بازار کے چوک میں، بسوں میں، وقت بے وقت، وجہ بلاوجہ، قبلہ کی اس خدمتِ خلق کے خلاف جیسے لگاتار محاذ سا قائم کر لیا ۔ بر سرِ عام انہیں بُرا بھلا کہا ۔ تہمتیں لگائیں ۔ پھر جب یہی لوگ کسی بیماری یا تکلیف میں گرفتار ہو کر ۔ دوسری جگہوں سے ناامید ہو کر قبلہ کے سامنے پہنچے تو قبلہ نے اس دردِ دل سے ان کا علاج کیا یا تشفی دی کہ ان کی زبانیں بھی بند ہو گئیں ۔ ایک صاحبِ اثر نے قبلہ کے مرشد کی سوانح حیات کی پہلی جلد خود ہی چھپوانے کا ذمہ لیا اور چھاپنے والے صاحب نے اُن سے یہ شرط براہ راست طے کی کہ دو تین سو کاپیاں دے کر وہ بقیہ فروخت کر کے اپنے اخراجات کی وصولی کا تقاضہ براہ راست قبلہ سے کیا ۔ قبلہ نے اپنی تنخواہ سے رقم بچا بچا کر یہ قرضہ خود ہی قسط وار ادا کیا ۔ اور دوسروں کو بالکل خبر نہ ہونے دی ۔ نہ اُن صاحب کو خبر کی جنہوں نے یہ انتظام کیا تھا ۔ مگر رقم کی ادائگی کے دوران میں وہ چھاپہ خانہ والے صاحب ۔ اب نہ جب قبلہ کے پاس آجاتے ۔ ادائگی کا تقاضہ کرتے ۔ بُرا بھلا کہتے یہاں تک کہ گالیاں تک دینے لگتے اور قبلہ نیچی گردن کئے یہ سب کچھ سُنتے ۔ اور منت سماجت کر کے کچھ اور وقفہ مانگ لیتے ۔ اس طرح ایک مدت کے بعد ہی کہیں یہ قرضہ ادا ہو سکا ۔ مگر واہ رے شانِ فقیری ۔ واہ رے صبرِ ایوبی ۔ کہ بجائے

قہرِ درویش کے، مہرِ درویش سے ہی ان چھاپہ خانے والے صاحب کو نوازا۔ ان پر دنیا کا ایسا مُنہ کھلا کہ لکھ پتی ہو گئے۔ الحاج بھی کہلائے۔ اس طرح گویا فقیر ایک کا ستر گنا کیا ستر ہزار گُنا دے کر بھی اپنے کو مسکین اور عاجز ہی رکھتا ہے۔ پھر جب کسی نے اس کے مرشد کی سوانح حیات چھاپی ہو تو کیسی بددعا۔ اُن کے لئے تو الٹی دعا کرتا ہے۔ مگر یہ دنیا کا سودا بس دنیا تک ہی ہے۔ آخرت میں تو سوائے محبت، وفا، خلوص، عاجزی کے دوسرا سکہ نہیں چلتا۔ امت کے بوجھ، گنہگاروں کے بوجھ، اپنی گٹھڑی میں باندھ کر آخرت کا رختِ سفر تیار کیا جاتا ہے اور اس دنیا سے روانگی کے وقت یہی گٹھڑی اپنے کاندھوں پر اٹھائے، محبوب کی درگاہ میں سُرخرو ہو جاتا ہے۔

یہ اور اسی قسم کی ہزاروں داستانیں فقیر کی زندگی کا ماحصل ہیں۔ غیروں اور دنیا داروں کا، فقیر کے ساتھ سلوک ہی کیا بیان کرنا۔ وہ تک جو اپنے کہلاتے ہیں۔ جن سے مادی جسمانی رشتہ بھی ہوتا ہے۔ یا جو عقیدتمندی کا اظہار کرتے ہوئے فقیر کے ارد گرد لگے رہتے ہیں اسے اپنی دنیاوی اور عقبیٰ کی مشکلات کے حل کا ذریعہ گردانتے ہیں۔ وہ بھی فقیر کے ساتھ تقریباً اسی قسم کا سلوک روا رکھتے ہیں۔ کچھ نہیں تو شکوہ شکایت۔ کنارہ کشی۔ تضیع اوقات کرانے کا ذمہ دار گردانتے ہیں۔ فقیر کو یہ سب کچھ صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرنا ہوتا ہے۔

صبرِ ایوبی کو جہاں قبلہ نے جسم و ذہن و نفس کی سطح پر اپنایا ہے اور اس صبر کو اپنی جسمانی زندگی کی مشعلِ راہ بنایا ہے۔ وہاں قلب کی سطح پر نسبتِ عیسوی کی مشق کی ہے۔ حضرت عیسیٰ کا محبت پیام، مظلوم انسانیت پر احسان۔ رحم و کرم و عفو و درگزر کی عام خوشخبری۔ غریبوں سے محبت و ہمدردی۔ صبر و توکل اور عاجزی کی معصوم تصویر بنے، حق کا پیام محبت، خلق تک پہنچانا۔ شدتِ عشقِ الٰہی کے جذبہ میں مخلوقِ الٰہی کی مسیحائی کرنا۔ یہ مسیحائی جہاں

ہومیو پیتھک طرزِ علاج کے پردے میں کی جا رہی ہے وہاں درد دل سے محبت کے انداز میں کسی کا دکھ اپنا کر اُس مجبور پر ہاتھ رکھ دینا اپنا اثر کئے بغیر نہیں رہتا۔ وہ صداقت سے کسی بیمار کسی پریشان حال سے قلبی رابطہ قائم کر لینا اس کی شفاء تسلی اور سکون حاصل کر لینے کا ذریعہ بنتا ہے۔ محبت کے جذبہ کی اس بے پناہ قوت کو اپنا کر لاعلاج مرضوں کا علاج بھی ہوا ہے اور ٹوٹے دکھی دلوں کی داد رسی بھی ہوئی ہے۔ قلب کی سطح، دل کی چاہ ہے اوپر کی سطح ہے جہاں خلوص اور صداقت، دعا کی مقبولیت کی ضامن ہوتی ہے۔ قلب کی سطح دل کی چاہ ہے دل میں یار بسا ہے۔ نظروں میں یار سمایا ہے تو جو چاہا وہ یار ہی نے چاہا۔ اپنی "میں" کا یہاں دخل نہیں۔ یار ہی کی جلوہ فرمائی ہے اس لئے یہ ہو نہیں سکتا کہ جو کچھ اس شدت میں چاہا وہ پورا نہ ہو۔ بیماروں کی مسیحائی نہ ہو۔ بس ایک دل پل جانے والی بات ہے۔

عاشق کی دنیا دل کی دنیا ہے۔ خود ایک شمع بسوزاں اور لب پر تو ہی تو۔ یہ دل کی آگ کچھ ان حقیقی معنوں میں ظہور پذیر ہوتی ہے کہ ماحول اس کی تائید کرتا ہے۔ قبلہ کا بھی اس زمانہ میں یہ حال تھا کہ جسم سے بھنے گوشت کی بو آتی۔ یہی آگے چل کر مشکِ لیسین میں بدل کر حیات روحانی کی ضمانت بنتی ہے اور ماحول پر یوں اثر انداز ہوتی ہے کہ کسی کی عاجزی، کسی کی تکلیف نے دل ہلا یا اور مسیحائی ہوئی۔ یہ کچھ لازم و ملزوم سی شے ہے۔ دل کی دنیا، عاجزی کی دنیا ہے۔ اپنے لئے کچھ نہیں۔ سب کچھ یار کے لئے۔ سب کچھ یار کے نام پر۔ سب کچھ یار کی طرف سے عشق نے اپنا تخیل، اپنا سب کچھ بھسم کر ڈالا ہوتا ہے یار کی کار فرمائی کے علاوہ اور کچھ نہ دل میں سماتا ہے، نہ آنکھوں میں، نہ خیالات میں۔ بغیر عشق میں فنا ہوئے اس مقام کی ہوا بھی نہیں لگتی۔ یہ محبت کا جذبہ ایک بے لوث سی بات ہے۔ بے خودی کی سی بات ہے کہ یہاں جذامی بھی اتنا ہی حسین لگتا ہے جتنا کوئی خوبرو۔ یہاں عاجزی کی آنکھیں، خلوص و محبت کے جذبے کو

ایک مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہیں ۔ یہاں ٹوٹتے ہوئے دل کے روزن، روئے یار کی آئینہ داری کرتے ہیں ۔

عیسوی نسبت سے اسی اندازِ مسیحائی کی جھلک کا نتیجہ تھا کہ جب قبلہ درّانی صاحب بابا قادر اولیاءؒ کے حضور حاضر ہوئے تو ایک دن جوش میں باباجان نے فرمایا "تیرے ہاتھ میں ہے فنا بقا ۔ ملائک، دنیا ہاتھ باندھے کھڑے ہوں گے ۔ اسی مسیحائی کا طفیل ہے کہ آج پشاور میں قبلہ درّانی صاحب ایک ماہر معالج شمار کئے جاتے ہیں ۔ تمام علاجوں سے ناامید ہونے کے بعد اب تک سینکڑوں اشخاص مہلک بیماریوں سے شفایابی حاصل کر چکے ہیں ۔

اس سے قبل ایک وہ بھی زمانہ تھا جب موسوی اندازِ پابندِ شریعت ہونے کا رنگ چڑھا تو نہ نماز قضا نہ تہجد ۔ راتوں عبادت، تسبیح، اذکار میں گزر ہوتی ۔ ممنوعات سے پرہیز برتا جاتا وہ عصائے موسوی، وہ جادوگروں، پڑھنے والوں کے سامنے توکل برخدا، صف آرا ہو جانا، خود بھی کر کے دیکھا ۔ خود بھی فرماتے ہیں کسی کا ہاتھ کمر پر ہو تو نہ شکست کھا سکتا ہے، نہ پیچھے ہٹ سکتا ہے ۔ تاریکیاں خود ہی چھٹنے لگتی ہیں ۔ وہ یدِ بیضا، وہ علمِ لدنی اور خضرِ راہ ۔ وہ عقل کو عاجز کر دینے والی، مرضیٔ الہٰی، مشیتِ ایزدی کے مطابق عمل پیرائی ہر ایک کے لئے مقرر ہے ۔ دیکھنے والی آنکھ یدِ بیضا کا اعجاز دیکھے کہ جس کام میں ہاتھ ڈال دیا کامیابی سے نوازے گئے ۔ ایک شدتِ انہماکِ کار ۔ ایک خود اعتمادی، خدا اعتمادی میں ثابت قدم ہو کر عمل پیرا ہو جانا، موسوی نسبت کی بات ہے ۔ اپنی عقل، اپنے ہاتھ سے جو کام کیا اور شدتِ انہماک سے کیا اس میں اُس نورِ عقل کی ہدایت بھی پائی جو قوی ارادہ رکھنے والے جلیل القدر لوگوں کے مقدر میں ہوتی ہے ۔

پھر وہ نسبتِ یوسفی ۔ احسن القصص اپنی زندگی کی وارداتوں میں بھی تو دیکھنا تھی

جب تک ان واقعات سے نہ گزرا جائے ۔ پاکدامنی یوسف کی عظیم مثال کی تصدیق اور اس کی عظمت کیسے روح و جان میں اترے ۔ چنانچہ قبلہ نے بھی اپنی زندگی میں دو چار بار ایسے واقعات اپنے اوپر سے گزارے جہاں اچھے اچھوں کے پاؤں ڈگمگا جاتے ہیں ۔ پانی میں رہ کر دامن تر نہ ہو، کہدینا آسان ہے کرنا مشکل ۔ عشقِ ازلی، جسم و جان میں پیوست ہو، جوانی کا عالم اپنی اٹھان پر ہو تو یہ عشق، مادی جسم کے لگاؤ تک کی بات رہ جاتی ہے ۔ گو یہ تڑپ حقیقت میں روح کی اپنے اصل سے ملنے کی تڑپ ہے ۔ اسی عالم میں انسان کے ظرف کا پتہ چلتا ہے ۔ کم مایہ انسان جسمانی زندگی کے دریا میں غرق ہو کر اپنی راہ کھوٹی کر ڈالتا ہے ۔ اور مردِ میدان، نسبتِ یوسفی کے سہارے نہ صرف ماہِ کنعان بنتا ہے بلکہ عالمِ انسانیت کے لئے بھی اس کے خوابوں کی تعبیر بن جاتا ہے ۔ جب تک جانِ من، جانِ عالم نہ ہو، جب تک یوسفِ بے کارواں بنا کاروبارِ جہاں کے زنداں میں گرفتار نہ ہو انسانیت کے مقدّر کے خوابوں کی تعبیر کیونکر دے ۔

پھر ان کا ذکر جو محبوب رب العالمین ہیں ۔ انبیاء کے سرتاج، افضل البشر، ختم المرسلین ۔ رحمتِ عالم، خُلقِ عظیم اخلاق کا مجسمہ ۔ محبت کے پیکر ۔ شفیع المذنبین ۔ وسیلۂ دو جہاں ۔ عاجزی، مسکینی، توکّل کی زندہ تصویر ۔ وہ کالی کملی ۔ غارِ حرا، معراج، امتی امتی بالمومنینَ رؤف الرحیم ۔ وہ انسانیت کو امن، آشتی، سلامتی، اخوت، صلہ رحمی کا سبق دینے والے ۔ وہ جن کے لئے قبلہ اکثر حالی کا شعر پڑھتے ہیں اور جو آج بھی ان کی زندگی کا سرمایہ ہے ؎

وہ بجلی کا کڑکا تھا یا صوتِ ہادی
عرب کی زمیں جس نے ساری ہلا دی

لہٰذا ذاتِ مبارک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نقشہ جو قبلہ کے حساس دل پر جا

اس نے ایسے نقشِ حیات ابھار دیئے جو اپنی بھی زندگی کا سرمایہ بن کر رہ گئے۔ حضور اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کو صرف تکریم، تخیل یا آئیڈیل کے پہلو تک تو بہت سوں نے اپنایا مگر اپنی نجی زندگی میں وہ پوری کی پوری قابلِ عمل تصویر بھی تو جانا تھی جو اسلام میں پورے پورے داخل ہونے کے لئے قرار دی گئی تھی۔ اسلام میں داخل ہونے کے لئے وہ جمیعت بندی، صلح پسندی، رحمدلی، انسانی ہمدردی، مساوات، خدمت، ایثار، قربانی، توکل، عجز، انکسار، صبر، شکر، دیانت، امانت، سخاوت، شجاعت اور تمام اعلیٰ اقدار پر کار فرما رہ کر روزمرہ زندگی گزارنا تھی۔ قبیلہ نے بہت سے مصلحین اور قائدین کی سوانح حیات پڑھی تھی مگر اس افضل نمونے کی تابناکی کے آگے تو سارے کے سارے چھوٹے نگینے سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ وہ صحابہ کرام کی مثالی جماعت، انسانی تاریخ کی وہ گراں بہا داستانیں تو تاتاریخ عالم میں اپنی نظیر نہ رکھتی تھیں۔ یہ درخشاں گروہِ مومنین تو فروغ عالم انسانی کے لئے ایک کھلی کتاب کے طور پر پیش ہوا تھا۔ اب کہیں انسان صحیح معنوں میں خلیفۃ اللہ کہلانے کا مصداق بنا۔ دین دنیا کو توازن میں لئے ربوبیت کا مظہر ہو کر پیش ہوا۔ اب کہیں کاروانِ انسانیت کو اپنی راہ ملی۔ پنگھٹ کی ڈگر ملی۔

پنگھٹ تک تو پہنچنا اپنے اپنے مقدر کی بات ہے۔ یہ ڈگر بھی بہت کٹھن ہے اس راہ میں کانٹے بھی ہیں۔ طعن و تشنیع بھی ہے۔ وطن بھی چھوڑنا ہے پیٹ پر پتھر بھی باندھنا ہیں۔ تنگی و عسرت میں زندگی بھی بسر کرنا ہے۔ فاقہ پر فاقہ۔ بستر فرش۔ ایک ٹاٹ کا بوریا پتھر، سنگ باری۔ جگ ہنسائی۔ ظلم، بیداد، شعب ابی طالب۔ یہ ایسی ایسی ساری حیات طیبہ کی سینکڑوں مثالیں اس پنگھٹ کی راہ کی نشانیاں ہیں۔ پن گھٹ کی راہ کربلا کا میدان ہے۔ اپنی اور اپنوں کی قربانی پیش کرتی ہے۔ کیسا شکوہ کیسی بد دعا۔ ان میں سے اسی

رحمت للعالمین کردار کی بلند مقامی دکھا کر گزر جانا ہے۔ یہاں تو اپنے رفقاء، اپنے عزیزوں لختِ جگر نورِ نظر کی شہادت کے بھی امام حسینؓ اور امام زین العابدین والا کردار ادا کرنا ہے امت کی عاقبت خراب ہو جانے کے خیال سے آخری دم تک معافی کی پیشکش، اتمام حجت، نبیؐ کریمؐ کی جانب رجوع کرانے کی کوشش اور تمام واقعہ کے بعد بھی نعتِ رسول مقبولؐ۔ کیسی خدا سے شکایت۔ یہاں تو خلقت کو خالق کی نظر سے دیکھنا ہے۔ ظالم کے ساتھ بھی وہی احترام آدمیت کی سنت برتنا ہے۔ وہ سمندر کا سا ٹھہراؤ کہ لاکھ پتھر پھینکیں۔ ڈنڈے ماریں مگر سینہ پر ضرب کاری کے بعد پھر اسی فطری سکون آجاتا ہے۔

قبلہ کے لئے یہ اسوۂ حسنہ زندگی کی کائنات بن گیا۔ روزمرہ زندگی میں اسلام کا وہ سبق حقیقت بنی۔ فطرت سے ہم آہنگی، رابطۂ ملت، خدمت خلق، فروغِ ملت ایک لائحہ عمل کے طور پر پیش ہوا۔ اور اسلام کے نصب العین فروغ نے ایک تازیانہ کا کام دیا۔ اب قبلہ کو معلوم ہوا کہ کیا دنیا کیا دین مسلمان کی زندگی تو کچھ ایسی ہوتی ہے کہ جیسے چراغ۔ کہ جہاں روشنی گئی تاریکی خود بخود دور ہوئی۔ نورِ محمدیؐ کے انوار کی بارش میں کلمہ کیا پڑھا، کلمہ ہو جانے کی بات نظر آئی۔ مجنوں بھی لیلیٰ کا کلمہ پڑھتا تھا۔ وجود میں لیلیٰ ہی لبس گئی۔ یہاں تو دائم اقدار والی لیلیٰ کو اپنانا تھا۔ پھر فنا کہاں۔ زندگی کے سرچشمے سے رابطہ کی بات تھی۔ سب سے بڑی سنت امت کا درد۔ معراج تک میں اپنی فکر نہیں بلکہ امتی امتی۔ اس لئے یہی سنت قبلہ کی زندگی کا ماحصل بن گئی۔ سب کچھ امت کے لئے۔ پھر جب بزرگانِ دین کے فیضان سے باطن کی راہ کھلی تو معلوم ہوا کہ حضور اکرمؐ کے پیغام کا احسان تو عالم امر عالم محبوبیت سے تعلق رکھتا ہے۔ رحمتِ محمدیؐ وسعتْ کُلَّ شَیْءٍ ہے۔ اسی شمس حقیقت کے انوار کی تابانی کی عکاسی ہر مومن کو اس کائنات میں کرنی ہے۔ روح امرِ ربی ہے اور رحمتوں کے انوار میں، مقامِ روح

پر نسبتِ محمدی کے طفیل مومن کی عمل پیرائی ہے ۔ اسی کے طفیل قبلہ کی زندگی میں جہاں ہر روز ایک نئی قلندرانہ آن بان ہے کُلَّ یَوْمٍ ھُوَ فِی شَان ہے ۔ وہاں یہ بھی بیّن طور پر نظر آتا ہے کہ جسم کی سطح پر نسبتِ ایوبی کو اپنایا ہے ۔

قلب کی سطح پر نسبت عیسوی کو اور روح کی سطح پر نسبتِ محمدیؐ کو ۔ اس کے علاوہ تصوّف کی وہ آٹھوں خصلتیں جو آٹھ پیغمبروں پر مبنی ہیں اپنی تابانی علیحدہ دکھا رہی ہیں یعنی سخاِ ابراہیمؑ ۔ رضاِ اسمٰعیلؑ ۔ صبرِ ایوبؑ ۔ خاموشیِ ذکریاؑ ۔ کنبہ بھی غیر ۔ کسی سے توقع نہ رکھنا یحییٰؑ کا عام لباس موسیٰؑ کی قلندرانہ زندگی عیسیٰؑ کی فقر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان منازل سے بے راہرو کا گزر جانا ناممکن العمل سی بات ہوتی ہے ۔ یوں دوربین لگا کر منزل کو دور سے دیکھ لینا اور بات ہوتی ہے ۔ پہنچنا اور بات ہے ۔ پن گھٹ تک پہنچتے پہنچتے وہ کروڑوں سال کی منازلِ ارتقائے انبیاء بھی تو طے کرنا ہوتی ہیں جن کے طے کرنے کے لئے عالمِ انسانیت کو لاکھوں سال لگے ۔ یہ حضور بابا قادر اولیاء کا فیضان تھا کہ جب قبلہ درّانی صاحب ایک شکستہ جسم لے کر دیدار کی غرض سے پہنچے تو باباجان نے نہ صرف جسم کو حیاتِ نو عطا فرمائی ۔ بلکہ حیاتِ روح کی منازل بھی مقامِ آدم علیہ السلام سے لے کر مقامِ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تک اپنی شفقت کے سایوں میں طے کرا دیں ۔ روحانی ارتقار کی یہ کہانی خود قبلہ نے اپنی کتاب وردا ای سادھو میں بیان فرمائی ہے ۔ یہ کیفِ کُن کی واردات ہے اور اسی کیف میں کچھ اس حقیقت کی فہم ہو سکتی ہے ۔ دیکھا جائے تو ساری دنیاوی تگ و دو اور کوشش ، ساری کامیابیوں کا راز ، اپنے باطن کے خزینوں کا کھلنا ہے ۔ من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ ۔ جس نے اپنے کو پہچانا اپنے رب کو پہچانا ۔ اگر صرف جسمانی ، دماغی ، اخلاقی اور ظاہر کی سطح کو ہی منزل گردانا ، تب بھی اس کی حدیں لامحدود اور اگر اپنی حقیقی ، اپنے باطن کی جانب رجوع ہوا ۔ تب ہی کہیں حقیقت شناسی

کی راہ کھلی۔ کیونکہ ظاہر تو صرف عکس اور ظل ہے حقیقت کا اپنا باطن ہی حق کا آئینہ ہے۔ حق یا حقیقت وہی ہے جس پر اعتماد کُلّی ہو۔ ایمان ہو۔ بھروسہ ہو۔ اس تک پہنچ ، ایقان کی سطح ہے جو ایمان سے بھی گہری بات ہے۔ کسی چیز پر ایمان رکھنے میں یا اس کو جاننے میں بھی ایک قسم کی دوری اور دوئی رہ جاتی ہے مگر ایقان خود ان تجربات سے گزر جانے میں حاصل ہوتا ہے۔

ایمان اگر محبوب کی محبت کا نام ہے تو ایقان ، محبوب سے ایکائی حاصل ہوجانے کی بات ہے۔ ایسی توحید کہ اپنے میں اور محبوب میں کوئی دوئی نہ رہ جائے۔ یہ توحید کا مقام ، صدیق کے نصیب کی بات ہے۔ کیونکہ اس کی صداقت کی سطح ، قلبِ روح سے بھی بڑے منبع وجود میں ہوتی ہے یہ کیفیت بغیر عشق کی صداقت اور شدت کے حاصل نہیں ہوتی۔ ایک طالب ہی اپنے جسم ، ذہن نسل ، علم ، شہرت ، اقتدار ، دولت ، عیش و آرام وغیرہ سب بندشوں سے نکل کر ان سخت زنجیروں کو توڑ سکتا ہے۔ طلب حقیقت یا طلبِ محبوب میں یہ رکاوٹیں اس کی راہ کھوٹی نہیں کرتیں۔ یوں وہ اپنی "لا" کر لیتا ہے۔ ان سطحی لذتوں سے بچ کر وہ انتشارِ شخصیت سے بچ جاتا ہے۔ اپنی "میں" کے ان سینکڑوں بتوں کو توڑ کر وہ شرک سے بچ جاتا ہے۔ اور ایک ہی محبوب کے قدموں میں اپنے کو لا ڈالتا ہے۔ آرزوئیں۔ تمنائیں ، لذاتِ جسمانی ، غصہ ، خواہش غرور اس کی صداقتِ طلب میں حاصل نہیں ہوتے۔ وہ اس طرح جیتے جی دنیا سے مر چکا ہوتا ہے اور محبوب میں اسے نئی حیات عطا ہوتی ہے۔ یہ ایمان کی روشنی ہے۔ بقائے جاوید ہے۔ جسم کی اس موت کے بعد ، اسی دنیاوی زندگی میں اسے بقا کی منزل مل جاتی ہے۔ یہ روح کی حیات ہے۔ روح کی جڑوں تک کی بات ہے۔ بصیرتِ روح کی بات ہے۔ بصیرتِ روح کے بعد ہی اپنی محبت اور ایمان کی سطح بلند ہو کر ایقان کی سطح بن جاتی ہے۔ خود اپنے وجود کے اندر اسے حسنِ لم یزل کی تجلی ملتی ہے تو کیفیتِ انبساط میں وہ خود پھٹ پڑتا ہے انا لیلیٰ انا الحق کہہ

اٹھتا ہے۔ یہ مقامِ جبروت ہے۔ شیخ کے احسان سے، نسبتِ محمدی عطا ہونے کے بعد وہ قہاریتِ حسنِ بے مثال کا خود آئینہ دار بنتا ہے۔ یہ خشیتِ حسن، یہ جباریت بس ہمکنار ہونے کی سی بات ہے اور جب وہ رحمت کو اپنے لئے، اپنے سے کہیں زیادہ بیتاب پاتا ہے تو ایک مجنونانہ جذب کی حالت اس پر طاری ہوتی ہے۔ بغیر جذب کے ان لذتوں سے شناسائی یوں بھی ناممکن ہے۔ وِدرای سادھو کتاب میں اسی رُوح کے انبساطِ کُن کی جھلکیاں کچھ ان گہرائیوں سے پیش کی گئی ہیں کہ ایک طالبِ حقیقت پہ گہرا اثر کئے بغیر نہیں رہ سکتیں۔ اور کچھ اس صداقت میں کہ جیسے کہ یہ منازلِ ارتقائے باطن خود اس پر سے گزر رہی ہیں۔

جن خوش قسمتوں کے مقدر میں اس دنیاوی زندگی میں ہی روح کا شعور حاصل ہو جانا مقدر ہے۔ ان کو بصیرتِ روح حاصل ہو جانے کے بعد ہی شیخ کے کرم اور احسان کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ تب ہی انہیں معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بچہ ماں کے پیٹ میں اپنے ارتقائے جسمانی کی تمام منازل طے کرتا ہے۔ اسی طرح شفقتِ شیخ میں یہ ارتقائے روحانی ممکن ہے۔ پھر ایک دفعہ یہ پیدائشِ روحانی یا پیدائشِ باطن ہو جانے کے بعد روح کی جوانی کا زمانہ آتا ہے۔ وہ محبوب کا ساتھ۔ وہ وصال کی لذت۔ وہ کیفِ انبساط کہ دل چاہے کہ اس کی خوشبو سات طبق نیچے اور چودہ طبق اوپر صدیقوں کی جماعت میں پھیل جائے اسی خوشبو کو لئے وہ قریہ قریہ کوچہ کوچہ صدیقوں کی تلاش میں پھرتا ہے۔ یہ تنہا سفر، یہ خدمتِ خلق کا جذبہ، یہ حقیقتِ حق کو نشر کرنے کی بیتابی۔ مگر یہاں تک پہنچنے کے لئے گویا خون کے دریا میں قدم رکھنا ہے۔ سر ہتھیلی پر رکھ کر منزلِ مقصود کی طرف چل پڑنا ہے۔ اس راہ میں جنگل بھی ہیں، کانٹے بھی، درندے بھی، جھاڑ جھنکار، غار، تاریکیاں بھی ہیں۔ دھوکوں اور فریبوں کے جال بھی، لعن طعن، پتھر، گالیاں بھی ہیں، انعام و اکرام میں غافل ہو جانا

بھی ہے اور تمام وہ منازلِ دشوار جن سے تمام انبیائے سابقہ کو گزرنا پڑا تھا۔ ارتقائے روحانی میں ہر نبی کا مقام ایک منزل، ایک نشانِ راہ ہے۔ ان کی خصوصیتوں کے خصوصی واقعات کے آخر کچھ تو کڑوے گھونٹ اس متلاشیٔ حق کو بھی پینا ہیں کیونکہ اسے ایقان کی سطح پر گامزن ہوکر حق کی راہ میں بادیہ پیمائی کے لئے نکل کھڑا ہونا ہے اور بحرِ حق کو پار کرنے کی آرزو رکھنا ہے۔ یہ اگر شریعت کی راہ اختیار کرتا تو اس سمندر سے گزرنے کے لئے کشتی تو مل جاتی۔ طریقت کی راہ اختیار کرتا تو بادبان بھی مل جاتے اور موافق ہواؤں کے سہارے اس سفر پر گامزن ہوجاتا۔ مگر اس متلاشیٔ حق نے تو حقیقت کی راہ اختیار کی ہے۔ عقل و فہم کی قیود کو توڑ کر اس بحرِ حقیقت میں لنگر انداز ہوگیا ہے۔ ؎

شریعت کشتی دارد، طریقت بادبانِ او
حقیقت لنگر آں دارد زِ راہِ فکر دشوار است

بس اسی شدتِ قلندرانہ میں اس کے عشق کی صداقت کے طفیل وہ دستِ کرم اسے نصیب ہے جو یہ سفر پورا کراتا ہے۔ یہ سفر عرفان کی حد تک ہوتا تو طریقت کے جہاز میں سفر کرا کر علم عطا کرا دیا جاتا۔ دیکھ لیتا۔ جان لیتا، اطمینان ہوجاتا۔ سیرِ انفس بھی ہوتی اور سیرِ آفاق بھی۔ مگر خود ہو کر جاننا اور بات ہے۔ اب قدم قدم پر دستِ کرم کی ضرورت ہے پھر بھی تو سب کچھ اپنے ہی زورِ باطن پر منحصر ہے۔ مچھلی کی طرح طالب بحرِ حقیقت بنے ہیں تو اپنی ریڑھ کی ہڈی کے بل بوتے ہی پر یہ سفر طے ہو سکتا ہے۔ مگر جس نے کشتی توڑ دی، بادبان پھاڑ کر پھینک دیئے، سارے سہارے چھوڑ دیئے وہ ریڑھ کی ہڈی کا بھی کیا سہارا لے۔ بسم اللہ مجریھا و مرسٰھا ان ربی لغفور الرحیم۔ جذبۂ عشق میں محبوب سے یکتائیت اپنے باطنی وجود میں ہے۔ اپنے ہی اندر غوطہ لگا کر منزلِ آدم تک پہنچے۔

حضرت آدمؑ ظہورِ اول ۔ بے ماں باپ ظہور میں آئے ۔ آپ کے وجود کا منبع اور مخرج وہی ذاتِ باری ہے ۔ وہ حوّاؑ کا ساتھ وہ شجرِ ممنوعہ ، وہ جنت سے اخراج ۔ جدائی وہ تنہائی ۔ وہ گریہ ۔ وہ پہلی توبہ ۔ یہ توبہ کی لذت زندگی میں ایک بار ہی ملتی ہے ۔ توبہ کیا ہے شدت سے پھر رحمت کی طرح رجوع ہوتا ہے ۔ وجود اور نفس کے مقام سے رجوع الی اللہ ہے ۔ نفس امّارہ سے رہائی ہے ۔ یہ باطنِ وجود کی توبہ ہے ۔ حقیقتِ آدم تک رسائی کی بات ہے ۔ اس مقام پر روح کی توبہ ایک بار ہو گئی تو دروازہ کھُل گیا ۔ یہ پہلا آسمان ہے ۔ مقامِ نفس ہے ۔

اب قلب و روح کی ارتقائی منازل شروع ہوتی ہیں ۔ ان ہی میں وہ طوفانِ نوحؑ اپنے تنور کا اُبل پڑنا ہے ۔ عشق کا ظہور ہے ۔ عاشق کا باطن پھٹ جاتا ہے ۔ بیج پھٹ کر کلمہ نکلنا ۔ الا اللہ کی نمود ۔ لوّامہ سے نجات اسی لئے آدمِ ثانی کہلائے ۔ اس کے بعد کی منازل سے گزرتے ہوئے حضرت یحییٰؑ کی طرح خویش و اقارب سے قطع تعلق ۔ حضرت ایوبؑ کی طرح جذام میں مبتلا ہو کر صبر کو ہاتھ سے نہ جانے دینا ۔ حضرت اسمٰعیلؑ کی طرح چھری گلے پر پھرتی ہو تو بھی رضا اختیار کرنا ۔ پھر خلعتِ ابراہیمی ۔ تعینات کے بتوں کو توڑنا ۔ حقیقتِ ذات کی تلاش ، جستجو ، تڑپ ۔ نسبتِ براہیمی عشق کی آگ کا گلزار ہونا ہے ۔ یہ دوسرا آسمان ہے نفسِ مطمئنہ کا مقام ہے ۔

مگر وہ تجلّی کی تڑپ ، حضرت موسیٰؑ کا مقام ۔ دین دنیا دونوں جوتیاں اتار کر حق کی طرف رجوع ۔ ستر ہزار پردوں میں تجلّی ۔ پھر بھی بیہوش ۔ وہ شوقِ کلام اس کلام کی نسبتِ روح سے جبرئیل نور کی صورت میں آئے ۔ قلب پر انوار و تجلیات وارد ہوئے ۔ معجزۂ یدِ بیضا ، عصا عطا ہوئے ۔ کلیم اللہ ہوئے ۔ یہ تیسرا آسمان ہے ۔ مقامِ قلب ہے ۔

اس کے بعد مقامِ عیسوی تک پہنچائے گئے۔ خود ہی کلمۃ الحق ہوئے۔ قلندرانہ زندگی عشق ہی عشق، توُ ہی توُ۔ روحِ انفرادی، روحِ اعظم میں جا ملی، مقامِ روح پر اٹھا لئے گئے انا روحی پکار اٹھے۔ روح اللہ کہلائے۔ جبرئیل بھی قمری کی صورت میں آئے یہ چوتھا آسمان ہے یہاں سے روح کے مدارج شروع ہوئے۔

روحِ اعظم کے مقام پر عشق کو پھیلاؤ نصیب ہوا۔ سرِ خفی کے مدارج طے ہوئے۔ نسبتِ یوسفی عطا ہوئی۔ بشارتوں کی کھڑکی کھلی۔ چاہِ زندانِ حُسنِ باطن، ماہ کنعان بن کر چمک اٹھا۔ شہودِ غیب نصیب ہوا۔ یہ پانچواں آسمان ہے۔

اب باطن وجود کے غیب میں پھیلنا شروع ہوا۔ نسبتِ یونس سے مقامِ اخفا، بحرِ حقیقت کی منزلیں۔ مچھلی نے نگل لیا۔ ہادی کے قبضہ میں اپنا کُل وجود۔ اپنی بے بضاعتی کا احساس ہوا۔ باطنِ وجود سے دوسری توبہ جاری ہوئی۔ طالب خود آیۂ کریمہ بن گیا۔ روح کو قُربِ ذات کی شدت کی طلب ملی۔ مچھلی نے اُگل دیا۔ ہادی سے جُدا ہوئے۔ بحرِ حقیقت میں رحمتوں کے سایے میں تنہا سفر۔ یہ چھٹا آسمان ہے۔ یہاں تک رسائی جبرئیل کے ذریعہ نفس عیسٰی دمِ عشق کے ذریعہ روح الامین کو پہنچا۔

فتح الغیب، ساتویں آسمان کا باطن کھُلا۔ ربوبیت حق کے سہارے ھُوؔ تک رسائی ہوئی۔ مقام سدرۃ المنتہیٰ۔ جبرئیل بھی آگے جانے سے عاجز۔

پھر وُہ عالمِ ذاتِ لامتناہی۔ یہاں سے حضور پُر نور محمد الرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام شروع ہوا۔ اور اس کی انتہا، ع

ہمہ پیغمبراں در جستجو تُند
خدا داند کہ تُو درچہ مقامی

یہ مقامِ محمود بالذات وصفات ہے۔ ذاتِ حقیقی کا بہ صفاتِ حقیقی ظہور ہے۔ معراج اور معراج سے واپسی۔ اظہارِ حقیقت کے لئے دُنیا میں واپسی۔ عبدہٗ ورسولہٗ کا مقام ہے۔ خلق سے بھی رابطہ ہے۔ اُدھر اللہ سے واصل اِدھر مخلوق میں شامل۔ جبرئیل بھی اب مکمل انسان کی صورت میں آئے۔ کعبہ تعینِ ذات کی نشانی مقرر ہوئی ہر ماسوائے ذات سے نکل کر ذات کا دروازہ کھُلا۔ شکرانۂ بندگی، شکرانۂ وجود طاری ہوا۔ اس کے بعد وجود بھی حجاب استغفارِ وجود۔ یہ تیسری توبہ ہے۔ اِدھر سے عاجزی اُدھر سے درود و سلام۔ کائنات میں رفعنا لک ذکرک ۔ ؎

بہت کٹھن ہے ڈگر پن گھٹ کی
کیسے بھر لاؤں مدھوا کی گگری

○

پنگھٹ صبرِ ایوبیؑ کا مقام ہے کہ مال و دولت۔ عزیز واقارب، جسم، گوشت پوست سب نذر کر دینے کے بعد بھی حمدِ باری تعالیٰ جاری ہوتی ہے۔ "اللہ کا تھا، اسی نے لے لیا، سب تعریف اُس قادرِ مطلق کے لئے ہے" پنگھٹ کربلا کا مقام ہے۔ یہاں اپنے عزیزوں، رفقا سیت، دست و پا بریدہ ہو کر نبالگے کا اِلٰہ بنا جاتا ہے۔ یہاں یاس کا پہاڑ ٹوٹ پڑنے کے بعد بھی امام زین العابدین کی طرح نعتِ محبوب قلب و روح سے جاری ہوتی ہے۔ پنگھٹ وہ خون کا دریا ہے جس کی بابت حضرت لعل شہباز قلندرؒ نے فرمایا ؎

چو آتش جملہ خوں دیدم بتر سیدم ازیں دریا

پنگھٹ وہ مقام ہے جس کی بابت حضور پیرانِ پیرؒ نے فرمایا ؎

شکر اللہ کہ نہ مُردیم و رسیدیم بہ دوست

یہ وہ صبر ہے جس کے شُکر کی لذت لی جاتی ہے ۔ کیسا شکوہ، کیسی شکایت یہاں تو اپنے کو ہی اس آزمائش کا حقدار سمجھا جاتا ہے ۔ یہ سب کاروانِ فقر اسی پنگھٹ کی جانب رواں دواں ہے جہاں ساقیٔ کوثر کے ہاتھوں تشنہ لبی کی سیرابی ہوتی ہے ۔ جو اس راہ میں سائے اور پانی کی تلاش میں رُک گیا وہ رہ گیا اور جس نے خون کا دریا پار کیا وہ پنگھٹ تک پہنچا ؎

یہ تمۂ وجہ اللہ یہ فقرِ ہو اللہ
ہوئی سُرخرو بندگی اللہ اللہ

باب ۶ قادر نگر (روزیام نگر) جنوبی ہند

علی گڑھ کے قیام کے دوران جو ریڑھ کی ہڈیاں گلیں اور پلاسٹر جسم سے باندھ دیا گیا تو ۱۹۴۸ء میں وطن واپس جانا پڑا۔ ۱۹۲۶ء میں بابا تاج الدینؒ پردہ فرما چکے تھے۔ پورے تیئیس سال اس جدائی میں قبلہ کے گزرے تھے اور اب حالت یہ تھی کہ جیسے اپنی بھی دنیا سے روانگی کا زمانہ قریب آ رہا ہو۔ اپنے اعزا سے سنا تھا کہ وزیا نگرم میں بابا تاج الدینؒ کے ایک خلیفہ بزرگ بابا قادر اولیاءؒ ہیں۔ دل نے پکارا کہ دنیا سے رخصت ہوتے ہو، چلو ایک اچھے بزرگ کی شکل دیکھ کر رخصت ہوں۔ جسم پلاسٹر میں بندھا اسٹریچر پر ڈال کر قادر نگر، وزیا نگرم پہنچائے گئے۔ شام کا وقت تھا۔ صحن میں اسٹریچر رکھا تھا۔ بابا قادر اولیاءؒ تشریف لائے۔ پہلی نظر دیکھ کر ارشاد ہوا ایک مسافر بڑے شاندار جہاز پر جا رہا تھا اس جہاز کو آخر غروب ہونا ہی تھا وہ غروب ہو گیا۔ یہ بیمار مسافر ایک تختہ پر، بھوکا پیاسا موجوں کے تھپیڑے کھاتا رہا۔ پھر ایک اور جہاز نے اسے آ کر اٹھا لیا۔" قبلہ نے بعد میں اس بات پر غور کیا تو خیال آیا کہ تاج باباؒ سے جدا ہوئے ٹھیک تیئیس سال گزرے تھے۔

پھر قبلہ سے خصوصی مخاطب ہو کر فرمایا۔ انسان اشرف المخلوقات کہلاتا ہے۔ ٹی بی کے چھوٹے چھوٹے کیڑے اس اشرف کو کیسے کھا جاتے ہیں (قبلہ کو کئی قسم کی ٹی بی پہلے ہو چکی تھی)۔ پھر بابا جان نے فرمایا" دیکھو بڑا کیڑا سب چھوٹے کیڑوں کو کھا جاتا ہے یہ بڑا کیڑا غمِ عشق ہوتا ہے۔ اس طرح غمِ عشق کے سہارے، حیاتِ نو کی بشارت دینے کے بعد بابا جان نے بڑے پیار سے فرمایا" رات ہو رہی ہے۔ ادھر ہی سستا لو، کل دیکھا

جائے گا ۔ اس طرح ایک ایک دن کر کے بڑی شفقت سے روکتے رہے اور اس محبت
و رحمت کے دامن میں اس جسمِ نحیف کے پورے نو ماہ اودھر گزرے نہ علاج نہ معالجہ
بس آتے جاتے ایک محبت کی بات ایک شفقت کی نگاہ ۔ پھر اسی قیام کے دوران تقریباً
چھ ماہ بعد ایک دن بابا جان نے بڑے بھولے پن سے پوچھا کہ یہ پلاسٹر سا کیا ہے جی ۔ پھر
آری منگوا کر یہ پلاسٹر کٹوا دیا گیا اور بعد میں عزیزوں نے اس کی جگہ موٹے چمڑے کی ایک
مضبوط کاٹھی سی قبضہ دار بنوادی تاکہ ریڑھ کی ہڈی اور جسم کو سہارا دیئے رہے ۔ اس کاٹھی
کے اوپر سے قمیص پہن لی جاتی ۔ (یہ کاٹھی قبلہ نے تقریباً سات سال تک استعمال کی اور اس
وقت بھی استعمال ہوتی تھی جب پشاور میں ۱۹۵۴ء میں انجینئرنگ کالج کی ملازمت اختیار
کی) ۔ رفتہ رفتہ بابا جان نے اپنی معیت میں قبلہ کو بٹھانا شروع کرادیا اور پھر کھڑا کر کے
ٹہلانا ۔ پھر وہ بھی دن آئے کہ بابا جان جب جنگل کی سیر کو نکلتے تو قبلہ درانی صاحب کو بھی ساتھ
لے جاتے ۔ اس زمانہ میں قبلہ پر ایک جذب کا سا عالم طاری رہتا ۔ ان جنگل کی سیروں اور
پہاڑوں کی منزلوں میں ، روح کی منازل طے کرائی جاتیں جذب کے عالم میں سیر کی حقیقت
کا انکشاف ہوتا رہتا ۔ بشارتوں میں یا جھلکیوں میں اس روحانی سیر اور منازل ارتقاء کی داستان
تو لمبی ہے ۔ مختصراً یہ کہ جمادی حالت ، نباتی حالت اور حیوانی حالت سے روح کا ارتقاء ہو کر
پھر کہیں انسان کی حالت نصیب ہوتی ہے ۔ اس کا ذکر مولانا رومؒ نے بھی اپنی مثنوی میں کیا
ہے ۔ کہ جمادی سے مرا تو نباتی ہوا ۔ نباتی سے مرا تو حیوان ہوا ، اور انسان بنا تو اب فرشتوں
کے بال و پر بھی نوچ لوں گا کیونکہ میری منزل الیہ راجعون ہے ۔ قبلہ نے اپنے کو پہلے مرغ
پھر بکری ، پھر سانبھر ، پھر عقاب کی کیفیت میں دیکھا ۔ دو ایک دفعہ یہ بھی ہوا کہ لیٹے ہیں
تو ساتھ ہی ایک خوبصورت گائے کا چہرہ ہے ۔ رسول اللہؐ کے چند ساتھیوں کو بھی گائے کہا

گیا ہے۔ یہ لوگ کرشن کے مقام کے ہوتے ہیں۔ پھر وہ بھی دن آیا جب اپنے مقابل اپنا جیسا ہی ایک اور دیکھا۔ یہ تمیز کرنا بھی مشکل تھا کہ کون کون ہے۔ منزلِ آدم پر پہنچ کر پھر ارتقائے روحانی کی وہ منازل بھی طے ہوئیں جس میں آدمؑ سے لے کر نبی کریمؐ کے مقام تک پہنچنے کے لئے تمام انبیاء کی منازل سے گزرنا ہوتا ہے۔ ارتقائے روحانی کی ان منازل کا حال قبلہ درانی صاحب نے اپنی کتاب وِدرا ای سادھو میں استعارات اور کنایوں میں بیان کیا ہے اس کا ایک مختصر سا حال حیاتِ قادر میں بھی ارتقائے باطن کے مضمون میں درج ہے۔ کتابی صورت میں آنے سے قبل یہ چھوٹے چھوٹے پرزوں پر تحریر تھی جن کو حسن اختر صاحب نے علی گڑھ میں یکجا کرنے کی کوشش کی۔ پھر قبلہ نے ایک دولت مست میں ڈکٹیٹ کرادی۔ وِدرا ای سادھو کا تلگو ترجمہ کلکتہ والے ڈاکٹر راؤ نے کیا۔ یہ ترجمہ ڈاکٹر راؤ نے قبلہ کو اس وقت سنایا جب ۵۸ء میں وہ پاکستان سے بابا قادر اولیاءؒ کے دربار پہنچے تھے۔ ڈاکٹر راؤ نے خیال ظاہر کیا تھا کہ یہ بھی ایک الہامی کتاب ہے۔ چالیس صفحوں میں روح کی ساری واردات لکھ دی ہے۔ دربار کے متعلق اس کا کہنا تھا کہ یہ خاص شہنشاہی اور دین کا وقت ہوتا ہے جوش ہوتا ہے اور رحمت بے تاب ہوتی ہے۔ بابا جان کا ارشاد ڈاکٹر راؤ نے سنایا کہ جو لوگ لائن میں حاضری دینے آتے ہیں ان کے لئے فیض اور جو اُدھر سیدھی طرف ہوتے ہیں وہ عزت کے لئے۔

قادر نگر، وِجیانگرم، جنوبی ہند کے اس قیام کے دوران جو کافی طویل تھا، قبلہ کے فقر کو چار چاند لگے۔ بابا تاج الدینؒ کے وصال کے بعد جو تنہا سفر ہو رہا تھا یا ایک ڈوبے ہوئے جہاز کا مسافر، سمندر میں ایک تختہ پر تھپیڑے کھا رہا تھا اس کو ایک اور بڑے بحری جہاز نے اٹھا کر سوار کر لیا اور روحانی ارتقاء، بحرِ حقیقت کا سفر پھر سے شروع ہوا۔

کتاب ودرا ای سادھوا ور حیاتِ قادر میں اس کی جھلکیاں مکمل انداز میں موجود ہیں۔ قادر نگر دربار میں فیض کے جو ظاہر میں نقشے چل رہے تھے ان کی کچھ جھلک جشن کے ایام کے بیان میں قبلہ نے پیش کی ہے۔ جشن کے ایام میں بے پناہ ہجوم خلقت کا ہوتا ہے۔ ان میں بیشتر وہ لوگ ہوتے ہیں جنہوں نے ایک بار حضور کو دیکھا تھا اور پھر اسی دن سے حلقہ بگوش ہو گئے تھے۔ کیسی پیری، کیسی مریدی۔ عشق میں نہ ذات پات نہ ایمان دھرم کا فرق۔ ہر جشن گزشتہ جشن کی تصویر۔ وجودِ کائنات میں ایک اچھوتا خوش نما منظر۔ آماجگاہِ خلائق۔ اس لئے کہ تمام کائنات کے دل کا مرکز خلق میں جلوہ افروز ہوتا ہے۔ صبح صادق سے ہی لوگ یادِ الٰہی میں مشغول۔ دربار میں حمد و تسبیح قرآن خوانی۔ یہ حریمِ ناز میں قرآن پڑھنا، دراصل حریمِ دل میں ہی صدا دینے والی بات ہے۔ باہر شہنائی کی سُریلی آواز۔ بینڈ پر یا شفیع الوریٰ سلامٌ علیک۔ باباجان کی تشریف آوری۔ بوئے حبیب سے رُوح معطر۔ جلوۂ محمدی کی رونمائی آئینہ دار دلوں میں اپنے اپنے نصیب کے مطابق ہو جاتی ہے۔

باباجان کے تخت پر قبلہ رُخ جلوہ افروز ہونے کے بعد قطار در قطار خلقت کا ہجوم پھول، ہار، عطر کی آڑ لے کر اپنے جان و دل نثار کرنے شروع کر دیتا ہے۔ دیدار سے جیسے ایک عرصہ کی دبی ہوئی آرزو پوری ہوتی ہے۔ قوالی، آرتی، بھجن، ناچ، بینڈ، شہنائی سب کچھ ساتھ ساتھ ہوتا رہتا ہے۔ یہ ہوتی ہے حق کی شان کہ یہ سب کچھ محبت کا ایک ہی ساز، ایک ہی لے، ایک ہی سُر معلوم ہوتا ہے۔ اس لئے کہ ان سب کے پیچھے دل ہوتا ہے۔ ایک ہی رُخ، رجوع الی اللہ۔ قبلہ نے باباجان کے کرم سے بارہا بھی یہ دیکھا کہ بہت سے ایسے لوگوں کی بھی حاضری ہوتی جاتی ہے جو وہاں جسمانی طور پر موجود نہیں۔ ارواح، ملائک، اجنّا سب ہی ان دنیاوی لوگوں کی قطار کے ساتھ دوسرے طبق میں گزرتے جاتے ہیں۔ گویا

جہان کے نقشے چلنے کے ساتھ ساتھ کائنات کا بھی نقشہ کھلتا جاتا ہے۔ خصوصی حاضریوں کے دوران باباجان قبلہ نے فرمایا اس کو دکھا بھی دیا۔ فرمایا مالک کے کارن ہیں۔ ساری مخلوق اور ملائک سر جھکاتے ہیں۔ لوگ ہی نہیں، روحیں اور ساری مخلوق چکر لگاتی ہے۔ ہمیں کسی وقت فرصت نہیں۔ ہر ایک کو حاضری دینی ہوتی ہے۔ مگر بوجہ ضعیفی ہیں بھی اس بدن پر پڑتا ہے۔ مٹی کے تپلے کو نہیں چھوڑتے۔ مٹی کا ڈھیر بھی ہوگیا تب بھی یہی کریں گے۔ پڑھے لکھے لوگ سمجھ کر زیادہ آئیں گے۔ یہ ویرانہ نگرم بھی ایک آباد شہر ہو جائے گا۔ مٹے (قادر نگر) سے سڑک بھی پکی بن جائے گی۔ اس کے دونوں طرف مکان اور دکانیں ہوں گی۔ بابا کی شان ہے ہر طرف سے لوگ آئیں گے۔ مٹی کے ڈھیر کو بھی نہ چھوڑیں گے۔ ہم چودہ سال کی عمر سے اب ساٹھ سال کی عمر تک یہاں بیٹھے ہیں۔ کبھی کوئی نامراد واپس نہیں گیا۔ جو آیا بامراد رہا۔ ہمیں کیا سننے کی ضرورت ہے۔ خدا نے ہمیں طاقت دی ہے۔ خدا بھی اکثر بندے کے روپ میں آجاتا ہے یہ حق الحق کی شان ہے ہم سب لکھا مٹا دیتے ہیں۔ کہتے ہیں یوں نہیں یوں ہو، تو ایسا ہی ہو جاتا ہے۔ قبر میں اگر ہمارا نام لے دیں تو ملائک دور ہو جاتے ہیں۔ پیران پیر کا شعر ہے ؎

گر نکیر آید و پرسد کہ بگو ربّ تو کیست

گویم آنکس کہ ربود ایں دل دیوانۂ ما

بظاہر یہ الفاظ خود ستائی کی سی بات معلوم ہوتے ہیں مگر جس نے خود آگہی کی ستی دیکھی ہو وہ اس حقیقتِ کلام سے آشنا ہو سکتا ہے۔ ان الفاظ پر ایمان اور ان کی قدر وہی قلوب کر سکتے ہیں۔ جنہیں کسی حق الحق کی شان والے کے سامنے حاضری نصیب ہوئی ہو قادر نگر دربار کے قیام کے دوران کرم کا احساس اس طرح ہوتا ہے کہ ہر چیز ہوتی جاتی ہے اور ہر صورت بظاہر اتفاقیہ طور پر ظہور میں آتی ہے۔ ہر قسم کی دشواری خود بخود آسانی کی صورت

میں تبدیل ہوتی جاتی ہے۔ اور قادر نگر کی سرزمین پر بابا کے سایہ کا نہ صرف اطمینان بلکہ یقین ہر کسی کو وسوسوں، وہموں اور موت وحیات کے بندھنوں سے نجات دلاتا ہے۔ قادر نگر کے قیام کے دوران ایک سحر کی سی کیفیت بیشتر حصہ قیام میں قبلہ پر گزرتی رہی۔ قبلہ کا فرمانا ہے کہ ایک کیف کی دنیا میں قیام رہا اور یقین اپنے مالک کی خود مختاری پر اور بڑھتا گیا کیونکہ بابا جان کا فرمانا ہے۔ میری بکریوں کے لئے جب ملک الموت آتا ہے تو چالیس قدم دور کھڑا رہ کر میری اجازت چاہتا ہے تب کہیں میری بکری لے جا سکتا ہے۔ قادر نگر میں رہنے کے بعد تو ہر شخص موت سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ کوئی مر بھی جائے تو رنج نہیں کرتے بلکہ مطمئن ہوتے ہیں کہ یہاں کی مٹی مل گئی۔ بہت سے لوگوں کے ساتھ تو یہ ہوا ہے کہ انہیں موت سے پہلے ہی یہاں سے روانہ کر دیا گیا ہے۔ کسی کسی کو ہی یہ مٹی نصیب ہوئی ہے۔ انجام کا ہر ایک کو اتنا یقین ہوتا ہے کہ بغیر بابا کے حکم کے یہاں کچھ نہیں ہوتا اور مطمئن نظر آتے ہیں۔ قادر نگر میں چند دن کا قیام ہی توکّل کا ٹھوس ستون بن جاتا ہے۔ کیسی آرزو، کیسی تمنائیں۔ علیم وخبیر شفیق ورحیم کے سامنے یہ سب غیر ضروری باتیں ہوتی ہیں اور پھر جو دل سراپا انہماک ہوں وہاں آرزوؤں اور تمناؤں کی گنجائش کہاں۔

جشن کے دوران کچھ وقفہ کے لئے بابا جان دربار کے ساتھ ہی حجرۂ مبارک میں تشریف لے جاتے ہیں اور ایک تخت پر لگے ہوئے مُصلّے پر قبلہ رُخ بیٹھتے ہیں۔ اس وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حق خود حریمِ ناز میں جلوہ افروز ہے اور وہاں ارواح کو حاضری دینا مقصود ہوتی ہے۔ چند بار قبلہ کی خوش نصیبی تھی کہ اندر بلا لئے گئے۔ قبلہ کا فرمانا ہے کہ وہاں وتُعِزُّ منْ تشاء وتُذِلُّ من تشاء کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ دربار کی شان کس انداز میں بیان کی جائے۔ دنیا نے شان، درمیان عبد ومعبود، درمیان طالب ومطلوب کب

دیکھی ہوگی۔ خود باباجان نے کسی سے دریافت کیا۔ یہ فقیری دربار ہے کہ امیری۔ کیا دوسری جگہوں میں ایسا ہوتا ہے۔ یہ مالک کی شان ہے۔ دوپہر لنگر سے غریبوں کو کھانا کھلایا جاتا ہے۔ بھوکے کا پیٹ بھرانا باباجان کو تمام باتوں سے زیادہ پسند ہے اس لئے کہ بھوکے کا پیٹ بھر جانا عین دعا کے مترادف ہے۔ اس کے لئے کسی الفاظ کی گنجائش نہیں۔ الفاظ تو انسان غلط بول سکتا ہے مگر بھرے ہوئے پیٹ کی گواہی سب سے بڑی گواہی ہے لنگرخانہ کیا ہے۔ ربوبیت کی شان کا مظہر۔ ایک دیگ پکاؤ یا دس دیگ۔ کھانے والے بھی موجود ہو جاتے ہیں یہ فکر نہیں ہوتی کہ کون کھائے گا اور کھانا کم ہو تب بھی سب کو کافی۔ ایک دفعہ لکڑی گیلی تھی۔ باباجان سے عرض کیا گیا۔ فرمایا پانی ڈال دو۔ ایمان والوں نے ایسا ہی کیا اور آگ پٹرول کی طرح بھڑک اٹھی۔ اسی طرح ایک دفعہ گھی کم تھا تو فرمایا مٹی کا تیل موجود ہے وہ ڈال دو۔ قربان جائیں فدائیوں کے ایمان کے کہ انہوں نے بغیر وہم و شک کے ایسا ہی کیا اور ذائقہ دار پلاؤ مٹی کے تیل سے ہی پکالیا۔ خوش نصیب ہیں وہ جنہیں اس لنگرخانے سے تبرک ملے۔ یہ اپنے جوشِ ایمان پر منحصر ہوتا ہے کہ انعام واکرام سے کتنا فیض کوئی حاصل کرے۔ قبلہ کا فرمانا ہے کہ جس نے بہ طیب قلب اس لنگرخانے سے کھایا وہ ولی ہوا۔ انسان تو انسان۔ ایسا نظر آتا ہے کہ اجنّا اور ارواح بھی اس لنگرخانے سے تبرک حاصل کرنے اس جشن کے دن آتے ہیں۔ خوش نصیب تر ہیں وہ خادم جو لنگر پکانے کی محنت بھی کرتے ہیں اور لوگوں کا برا بھلا بھی صبر سے سن لیتے ہیں۔ لیکن زیادتی کرنے والوں کی پکڑ بھی خود بخود ہو جاتی ہے۔ لنگرخانہ کی صرف ایک ہی خادمہ کا ذکر کر دینا کافی ہے۔ جب قادر نگر سے دوران کے انتقال کا وقت آیا تو فرماتی تھیں "ہٹو۔ باباجان تشریف لائے ہیں۔ خوشبوئیں آرہی ہیں۔ مجھے اچھے کپڑے پہنائے جارہے ہیں۔

دربار کا نقشہ ایک دنیا کا نقشہ سمجھ لیں۔ ہر قسم کے لوگ امیر غریب۔ چھوٹے بڑے سب ایک ہی دُھن میں مشغول۔ دل کی طہارت، یادِ الٰہی۔ دکھاوے کی سب چیزیں بیکار۔ مساواتِ مسکینی اور توکل کا سبق انسان کو ملتا ہے۔ جو کام سپرد ہے اس کو انہماک سے کرتے رہنا ہی عبادت ہے۔ یہاں سب اونچ نیچ انسان کے ظاہر باطن کی ہموار کردی جاتی ہے۔ دربار کی حدود میں اللہ اللہ کرتے رہنا اور سینہ کو منور رکھنا ہی باطن کے سنوارنے کا ذریعہ بنتا ہے۔ ایمان محبت کا نام ہے۔ ایمان کی لذت وہی قلب جان سکتے ہیں جن کو محبت کسی منظہر کی طرف رجوع ہونے پر مجبور کرتی ہے۔ ایسی معصومیت میں وہ اپنی صداقتِ قلب کے خود گواہ ہوتے ہیں اور سب سے سچی شہادت سوائے اپنے اندرون قلب کے اور کون دے سکتا ہے۔ اشھد ان لا الٰہ الا اللہ زبان سے کیا کہنا۔ جب تک کہ رواں رواں گواہی نہ دے اور دل کی گواہی کب رد ہو سکتی ہے۔

اسی ذکر کی شدت میں تیسری آنکھ جو نقشے ساتھ ساتھ دیکھ رہی تھی ان کو بیان میں لانا بھی دشوار ہے۔ ذاتِ لامتناہی محیط ہے زمان مکان کی حدیں ٹوٹ چکی ہیں۔ ازل ابد کی حدوں میں عشق و حُسن کی داستان دہرائی جا رہی ہے۔ محبوب کی رضا حاصل کر کے جلوس منظہرِ حق کی طرف واپس آ رہا ہے۔ یہ شام کا وقت ہے۔ صبح کو یہ جلوس محبوبؐ کے گھر کی جانب روانہ ہوا تھا اور اب واپسی ہو رہی ہے فضائیں محبت کے نغموں سے پُر ہیں گروہ در گروہ مخلوق نظر آ رہی ہے۔ گانے، ڈھول، کرتب، جھنڈے، آتشبازی، گولے غرض سب کچھ اس لطافتوں کی سطح پر بھی ہو رہا ہے۔ مادی سطح کو بھی اس لطافتوں کی سطح نے ڈھانک رکھا ہے۔ مادی اور لطافتوں کی سطح کا سارے کا سارا منظر ایک ہی توحیدی یکتائیت میں ہے۔ وہ دور سے سفید ہاتھی بھی نظر آ رہا ہے۔ سنہری عماری میں

تین بزرگ ایک ہی قطار میں بیٹھے ہیں ۔ یہ ابدال ہیں ۔ سیدھے ہاتھ میں چاندی کے گلاس لئے ہیں اور بائیں ہاتھ سے ان گلاسوں کو ڈھانک رکھا ہے ۔ جلوس صاحب وقت دولہا کے گھر پہنچا ۔ سفید ہاتھی گھٹنوں کے بل جھکا سونڈ اٹھاکر نہایت احترام سے دولہا کو سلام کیا ۔ کرتب بازوں نے زبردست جوش میں آکر کرتب دکھانے شروع کئے ۔ ڈھول اور شدت سے بجے ۔ دولہا کو نذریں شروع ہوئیں ۔ پھول ہی پھول ۔ اتنا ڈھیر کہ ہاتھی بھی ڈھک جائے ۔ رنگ برنگ کپڑے ۔ موسم بے موسم کے پھل ۔ سبزیاں ۔ اناج ۔ مصالحے چھکڑوں پر لدے ہوئے نیاز کے جانور ۔ خلقت کھائے ۔ سیراب ہو ۔ کھیل تماشے ۔ آتش بازی، ڈھول نقارے ، نیزوں تلواروں کے کرتب سب کچھ دولہا کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کے لئے ہو رہے ہیں ۔ قطب ، ابدال ، اوتاد ، آمرین حق ، ارواحِ مقدسہ دولہا کے آگے اپنی اپنی نیازمندی پیش کرتے ہوئے گزر رہے ہیں ۔ دولہا صاحبِ وقت ان کھیل تماشوں ، نیازمندیوں کو بھی لطف اندوز ہو کر نہار رہا ہے اور ساتھ ساتھ کسی گہری سوچ میں مستغرق ہے ۔ نگاہیں کہیں دور ، آسمانوں میں ، وسعتوں میں سمائی ہوئی ۔ اپنا وجود ساری کائنات کا دل بنا ہوا ۔ سب کچھ اپنے میں سمیٹے ہوئے ، ایک مستئ ہشیار کی حالت میں ۔ یہ آگہی کی مستی ہے ۔ جسم ، قلب ، روح ، صفات ، ذات سب سطحوں پر محیط ہے ۔ اب رات کا وقت ہو چکا ہے اور آہستہ آہستہ ڈھول ، گانے ، ساز سب بند ہوتے چلے گئے ۔ قبلہ کے لئے ایک بڑی خوشیوں کا دن گزرا ، مگر ساتھ ہی ایک اداسی سی اپنے اندر چھاگئی ۔ جس آنکھ نے دوسرے عالم میں یہ سب کچھ دیکھا اس کو بھی شبِ ہجر کے غلافوں نے پھر سے ڈھانک لیا ۔ مگر وہ دربار کے ایک کونے میں رفعی فقیروں کا دف پر ذکرِ جلی شروع ہوا ۔ ان کی چمکدار آنکھیں ۔ لانبے لانبے بکھرے بال دف پر ، بدن کو شدت سے گھمانا

زنجیروں کی کھڑک ۔ مستی میں شدت آنا ۔ لا الاہ پر لانبے بالوں کا جھٹکے سے ہلنا الا اللہ پر آنکھوں میں مشعل جیسی چمک آجانا ۔ سننے والے کے دل پر ہر حرف کی دھاپ پر خنجر کی سی چوٹ لگنا ۔ اس ذکرِ جلی کی شدت میں لا الاہ الا اللہ کے ایک ایک حرف کا دل میں ہتھوڑے کی ضرب کی طرح لگنا ۔ جیسے دل کچلا جا رہا ہو ۔ جلا جا رہا ہو ۔ گھبرا کر نکلنا چاہا تو بھی ناممکن ۔ جیسے اس ذکر نے احاطہ کر لیا ہو ۔ روح نے اس ذکر کی وسعتوں میں اپنی وسعت کو پا لیا ہو ۔ اُدھر ان فقیروں کی تھاپ تیز ہوئی ۔ ذکر تیز ہوا اور ادھر یہ حالت قبلہ کی ہوئی کہ سانس کے لئے تڑپنے لگے ۔ رونا چاہا تو آنسو خشک ۔ زبان اور گلے میں وہ خشکی کہ الاماں جیسے زندہ جسم ، پورا کا پورا آگ میں پھینک دیا گیا ہو ۔ جسم جھلس رہا ہو ۔ گوشت بھن رہا ہو ۔ ہڈیاں تڑخ رہی ہوں ۔ رگ ، ریشہ ، آنتیں غرض سب کچھ جلتی ہوئی لکڑیوں کی طرح ہو گیا ہو ۔ اس آگ کی شدت کو کیسے بیان کیا جائے ۔ یہ فنا کی آگ ہے ۔ بغیر کرم کے یہ نصیب کہاں ہوتی ہے اور بابا جان کا کرم ہی تھا کہ قبلہ اس شدتِ آتشِ شوق میں بیہوش ہو گئے ۔ صبح آنکھ کھلی تو میٹھی میٹھی سہانی ، شہنائی کی آواز ایسی آ رہی تھی کہ جیسے عدم کے سرے سے نئی زندگی نے جنم لیا ہو ۔ جسم گویا ایک کھوکھلی بانسری کی طرح ہو چکا تھا ۔ سانس بھی نئی اور جیسے نئی روح بدن میں پھونک دی گئی ہو ۔ یہ لا الٰہ کی فنا کے بعد الا اللہ کا ظہور ہے ۔ اسی لئے فقیر کلمہ پڑھتا نہیں بلکہ ہو جاتا ہے لا الٰہ کی فنا کی آگ سے گزر کر دیکھیں تب ہی لا الٰہ کی فہم اور عرفان ہوتا ہے ۔ اسی حالت میں کوئی حق کا فرستادہ قبلہ کے لئے شربت کا گلاس لایا ۔ اور دعوت کے لئے بلا کر لے چلا ۔ راستے میں قبلہ نے دیکھا کہ برگد کے نیچے سفید ہاتھی کھڑا ہے ۔ اس کی مخمور آنکھوں میں ایسی کشش تھی کہ اس کی طرف کھنچے چلے گئے ۔ یہ آنکھیں جیسے محبت والی عورت کی آنسو

بھری آنکھیں ۔ غزال کی شرمیلی آنکھیں ۔ نرگس کے پھول کی آنسو بھری آنکھیں ۔ ان آنکھوں کی شراب کیا بیان کی جائے ۔ اس میں غم ہے لیکن رنج نہیں ۔ اس میں یاد ہے لیکن افسوس نہیں ۔ اس میں امید ہے لیکن محل بنانے کے خواب نہیں ۔ اس میں سکون ہے لیکن نیند نہیں ۔ اس میں عقلمندی ہے جو ذہانت سے اوپر کی بات ہے اس میں سمجھ بوجھ ہے جو دلیلوں سے بلند سطح کی چیز ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سفید ہاتھی ۔ روحانی سواری کو دولہا کے لئے چھوڑ دیا گیا ہے کہ جب کبھی اپنی جائے قیام سے باہر جائے تو اس پر سواری کرے یہ روح ، اور روح کی سواری لطافتوں کی دنیا کی باتیں ہیں ۔ نبی کریمؐ نے بھی لطافتوں کی دنیا میں تین چیزیں پسند فرمائی تھیں ۔ عورت گویا عکسِ رخسار ، جمالِ ذات ۔ نماز گویا دیدار ، معراج مازاغ البصر ، آنکھوں کی ٹھنڈک اور خوشبو گویا روح کی سواری ۔ عالمِ بالا سے عالمِ وجود کی طرف رابطہ ۔ اسی لئے نیازوں اور مزارات وغیرہ پر خوشبوؤں کا رواج ہے مگر جسم کی قید میں ہوتے ہوئے روحانی سفر کسی دوسری سطح کی بات ہے ۔ جسم میں جب تک لطافتِ روح نہ آجائے ، معراج میں کیسے ساتھ دے ۔ ایک جگہ سے دوسری جگہ کیسے پہنچے ۔ اپنی ہی روحانی سواری پر اس سفرِ عروج پر روانہ ہوا جاتا ہے ۔ جیسے بُراق ، برق رفتار پر لمحوں میں سیرِ آفاق ہوئی اسی طرح دوسری روحانی سواریوں کی اپنے اپنے مقام کی بات ہے ۔ ہاتھی کا یقین اور بھروسے والا قدم ۔ ارتقاء کی منزل چال ۔ جھاڑ جھنکار کو راستے سے ہٹاتا ہوا ، زمینِ وجود پر شاہانہ سفر یہ سب کچھ تو ایک معمولی سی جھلکی ہی ہے اس نظارہ کی جو روح کی کھڑکی کھلنے کی صورت میں قبلہ کو نظر آرہا تھا ۔ یوں تو قادر نگر اور وہاں کے ایام سب کے سب ایک پُر خلوص اور بامعنی زندگی کا نمونہ پیش کر رہے تھے جیسے مادی سطح پر روزمرہ زندگی ہی کہہ لیں ۔ مگر اس تمام کے پیچھے ایک دل ہزار دل کا نقشہ کار فرما تھا ۔ محبت ہی محبت ، عشق ہی عشق کا ہر طرف چرچا

تھا۔ ہر چیز، اپنا سب کچھ محبوب اور محبوب والوں پر نثار۔ اور اس سے اوراوپر روح کی سطح پر، عالمِ امر کی سطح پر جہاں فرد کے ارتقائے روحانی کی منزلیں کھول دی گئی تھیں وہاں جمیعت اور عالمِ انسانی کے لئے منزلِ یقین کی راہ کشادہ کردی گئی تھی۔ یہ سب کچھ اسی لئے تو تھا کہ بابا قادر اولیاؒ کے ورود سے قادر نگر، مرکزِ قلب کائنات بن گیا تھا۔ نہ یہ تفصیلات زیبِ داستان بنائی جا سکتی ہیں نہ تحریر کے محدود دائرے میں ان وسعتوں کو سمیٹا جا سکتا ہے۔

اس خلافتِ ارضی کا سلسلہ کچھ اسی اندازِ رحمت میں ہے کہ رحمت للعالمینی انوار کی تجلّی جہاں ذرہ ذرہ دے رہا ہے وہاں کوئی وجودِ مظہر الملیت کا انداز لئے، صاحب وقت کی حیثیت سے اس رحمت کے نشر کا ذریعہ بنا ہوتا ہے۔ نورِ محمدی کا سلسلہ جاری و ساری ہے اور یہ امانت اس طرح وجود در وجود منتقل ہوتی رہتی ہے۔ اسی نور کے طفیل، خلقت کا رجوع اُس وجودِ گرامی کی جانب لازمی سا ہوتا ہے۔ جہاں یہ مرکزیت سمٹ کر گویا کائنات کا دل بن جاتی ہے۔ رحمت کے اس مجسمۂ نور کے گرد تمام انوار چکر لگاتے ہیں۔ کیا ارواحِ مقدسہ کیا ملائک۔ کیونکہ نورِ محمدی کی تابانی ایک ہی وحدت الوجود کے انوار میں محیط ہے۔ اس میں نہ کمی بیشی۔ نہ نور کی تقسیم۔ نورٌ علیٰ نور۔

اب روح کی سواری کی بات یہ ہے کہ جیسے جسم کی سواری کے لئے جانور یا مشین جیسے موٹر، ریل، ہوائی جہاز، جسم کو بہت کم حرکت دیئے بغیر، سوار کے تصرّف میں ہی کوئی سفر طے کرا دیتے ہیں۔ اسی طرح روح کی سواری اپنے سوار کے تصرف میں ہوتی ہے۔ روح تو خیال سے بھی الطف درالطف، عالمِ امر کی بات ہے۔ اس لئے آنِ واحد میں کہیں سے کہیں جیسے برق رفتار رف رف۔ اس سیر فی الارض، سیرِ افلاک، سیر النفس، سیرِ آفاق کی لطافتیں سپردِ تحریر کیسے ہوں۔ جیسے جسم نشانی ہے اپنے صانعِ حقیقی کے کمالِ حُسن کی۔ اسی طرح

روح اور روحانی سواری نشانیاں ہیں امرِ ربی کے اجراء کی۔

یہ باتیں عقل کی دسترس میں کیسے آئیں۔ عقل تو غالباً انہیں بعید از قیاس گردانے گی۔ جب ہمیں اپنے قوائے جسمانی، ذہنی اور قلبی تک کا نہ ادراک ہے، نہ تجربہ، نہ عرفان تو قوائے روحانی کی فہم کیسے ہو۔ ہم تو اپنی عقلی ظن و تخمین میں باتیں کرتے ہیں انوار و تجلیات کی صفات و ذات کی حِس کی بھنک بھی اس مٹی کے جسم اور اس کی سطحی عقل سے نہیں پا سکتے۔ ہمارے ذہن شعور، لاشعور کے دائرۂ عمل کا جائزہ ایک ماہر نفسیات ہی کچھ لگا سکتا ہے۔ اسی طرح لاشعور کے لاشعور یا روح تک دسترس کوئی صاحبِ باطن ہی کر سکتا ہے۔ کسی صاحبِ امر کے کرم اور احسان سے جب تک اپنا ارتقائے روحانی جمادات، نباتات، حیوانات کی سطحوں سے عروج کر کے انسانی شکل میں اپنے باطن کو نہ لے آئے اور بلوغت کی منزل پر نہ پہنچے۔ اس وقت تک کیا ادراکِ روح، بصیرت روح، تیسری آنکھ، روحانی سواری، عالمِ مثال، عالمِ امر، نورِ محمدی کا ذکر کیا جائے۔ جب جسم میں لطافتِ روح آجاتی ہے تب ہی کہیں جسم بھی، روح کی تفسیری کاپی بن جاتا ہے اور روح کے مقام پر صاحبانِ تصرف کی بابت تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ ان کی نگاہِ عمیق، ان کا قلب محیط، ان کی روح محیط ہوتی ہے۔ ان فقرائے باطن کے ظاہر کا کیا دیکھنا۔ اس ظاہر کا پردہ لے کر ہی پسِ پردہ باطن میں کام کیے جاتے ہیں۔ یہ رحمت کا وسیلہ ہے جو عالمِ انسانیت پر احسان کی صورت میں ان کے وجود سے ظہور میں آتا ہے کون کون اپنے اپنے زمانہ میں کیا کرے گا۔ اس کا شعور آگے والا زمانہ میں ہوتا ہے۔ یا ان لوگوں کو جن کی باطن میں دسترس ہے اور صاحبِ ایوان ہیں۔ اتنا ضرور ہے کہ ظاہر باطن میں ایسی کھلی نشانی ہزار سال میں ہی کہیں آتی ہے اور اس کے زیر اثر جو پاک روحیں آجاتی ہیں وہ خود نورٌ علیٰ نور ہو جاتی ہیں۔ الفقرُ ہو اللہ۔ یہی وہ فقر ہے جس کے لئے نبی پاکؐ نے

الفقر فخری فرمایا تھا اور ان کی رحمت کے انواروں اور نسبت کے طفیل ان کے فقراء کے ذریعہ یہ دولتِ فقر زمانہ میں نشر ہوتی رہتی ہے اور ہوتی رہے گی۔

قادر نگر کے ان ایام میں قبلہ کی وہ تربیت بھی کی جاتی رہی جس کی ذریعہ ان کے روحانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ ان کے اپنے مقصدِ حیات کا بھی تعین ہوتا گیا۔ یوں تو قبلہ کی سب زندگی محبوب کے لئے، محبوب کی امت کے لئے وقف تھی مگر اب آہستہ آہستہ وہ ذمہ داریاں بھی سونپی جا رہی تھیں جن کا بوجھ انہیں آئندہ زندگی میں اٹھانا تھا۔ یعنی ظاہری زندگی میں ایک مجسمہ اخلاق بن کر خدمت خلق کے لئے اپنے کو وقف کر دینا۔ باطن میں محبت کے رابطہ سے دکھی انسانیت کی دستگیری کرنا اور طالبانِ حق کو، حق کی طرف رجوع کرنا۔ پھر اپنی نسبت کی پشت پناہی میں عالمِ مثال میں بھی وہ کچھ کرنا جو رحمت للعالمین انوار کے نشر کا ذریعہ ہو جائے اور امت کو اپنی راہِ گم گشتہ پھر سے نصیب ہو۔

اسی مقصد کے تحت قبلہ کو باباجان کا ارشاد ہوا کہ شمالی سرحدی علاقہ میں جا کر حق کی خدمت کریں۔ فقیر کو اس حکم سے سرتابی کی نہ مجال ہے نہ یہ اس کی اپنی مرضی پر منحصر ہوتا ہے۔ مقصدِ حیات، فروغ ہے۔ اسلام بھی اسی فطری فروغِ کن کی جانب اپنے پیام سے عالمِ انسانیت کی ہدایت کرتا ہے۔ ہر فقیر کے دل میں امت کا درد ہوتا ہے یہی اس کی سب سے بڑی سنت کی پابندی ہوتی ہے۔ یہی اس کی زندگی کا ماحصل۔ قادر نگر دربار میں قبلہ پر یہ بات عالمِ مثال میں اچھی طرح واضح کرا دی گئی کہ امت کے لئے بہت کچھ ان مثال کے پردوں سے کیا جا چکا ہے۔ اب فتح مبین کا وقت آنے والا ہے۔ قوموں کی زندگی میں چالیس پچاس سال کچھ نہیں ہوتے۔ اسی یقینِ مستحکم کی بنا پر قبلہ نے بھروسے کے ساتھ پشاور میں سکونت اختیار کی کہ مستقبل میں صوبہ سرحد سے ایک عظیم انقلاب اُٹھے گا۔

جو اسلام کی نشاطِ ثانیہ کا علمبردار ہوگا۔ عالمِ مثال میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ ہند و پاک میں دو قومیں ایسی ہیں جو اسلام کی عظمت کا پرچم بلند کریں گے۔ ایک سرحد کے پٹھان اور دوسرے مالا بار کے موپلے۔ پھر قدرت نے ان اقوام کو بھی منتخب کر لیا ہے جو اسلام کی پشت پناہی کا باعث بنیں گی۔ ان نقشوں کے تحت جو عالمِ مثال میں پہلے سے آمرین حق طے کر دیتے ہیں مرضیٔ الٰہی کی کارفرمائی ہوتی ہے۔ چودھویں صدی کے لبدیوں بھی اسلام کی وہ ابتلا کا خاتمہ ختم ہونے والا ہے جو شہادتِ عثمانؓ سے شروع ہوا۔ فقراء کا کام اپنے اپنے زمانے میں یہی ہوتا ہے کہ رحمت کے وسیلوں سے اس شجر امت کی آبیاری کرتے رہیں۔ مقامِ قلب پر یہ کام دل کی چاہ ہے۔ مقامِ روح پر یہ کام مرضیٔ الٰہی کے اجراء سے تعلق رکھتا ہے اور مقامِ رحمت پر رحمت للعالمین وسیلوں سے اس امت کے فروغ کا۔ مسندِ فقر پہ اس طرح فائز ہو کر غم امت کو اپنا لینا مردوں ہی کا کام ہوتا ہے۔ نہ نام نہ نمود، نہ ولائتیں بس قسمت میں آنسو ہی آنسو۔ درد ہی درد۔ سمندر کا سا سینہ۔ پہاڑ جیسی استقامت اور کھوکھلی بانسری جیسا جسم۔ سے

بشنو از نے چوں حکایت می کند

در جدائی ہا شکایت می کند

قادر نگر کے قیام میں جہاں علاج معالجہ، نرم گفتاری، محبت و اخلاق کو خلق سے رابطہ قائم کرنے کا ذریعہ بتایا گیا۔ وہاں یہ بھی تعلیم ملی کہ جیسے اونٹ اپنے نرم ہونٹوں سے کڑوا نیم بھی چر جاتا ہے اور کانٹے بھی، اسی طرح تمام تلخ و تندِ روزگار کو اپنی فطری نرمی کے ذریعہ اپنانا ہے۔ فقیر کی ڈھال مسکینی، عاجزی، توکل۔ فقیر کی دو دھاری تلوار ذکر جو ظاہر کو بھی کاٹتا ہے اور باطن کو بھی۔ اسی اسمِ ذات کو مشعلِ راہ بنا کر چاروں تصوف

کے سلسلوں میں تعلیم دی گئی اور بعد ازاں اجازت بھی ملی کہ حق کی راہ میں لوگوں کو ڈالنے کے لئے جو سلسلہ افراد کی صلاحیتوں کے مطابق ہو وہ بتائیں۔

نقشبندی طریقہ کا ذکر کرتے ہوئے قبلہ کہتے ہیں کہ قادر نگر دربار میں وہ شدت چڑھی کہ اوراد، نماز، نوافل، تہجد میں لگ گئے۔ نقش اللہ مجلّٰی سامنے آتا۔ بعد میں طبیعت نے نہ مانا کہ یہ اللہ ہے، یہ انجام ہے۔ سلام پھیر دیتے۔ کسی نقشبندی نے کہا تم تو بڑے خوش نصیب تھے۔ قبلہ نے کہا جو کچھ بھی ہو یہ تو اللہ نہ تھا۔ حقیقت اس سے آگے کچھ اور بھی ہے۔ یہ تو سب کچھ اپنی تخلیق تھی اس کو سجدہ کیسے کرتا۔ حقیقت کا متلاشی اس میں اُلجھ کے کہاں رہ جاتا۔ چشتیہ رنگ چڑھا تو اسے اپنی فطری صلاحیتوں کے مطابق پایا سب کچھ یار کے نام پر۔ سب کچھ یار کے لئے۔ سب کچھ یار کی طرف سے۔ میں اور تُو کی رگڑ۔ پھر تُو ہی تُو۔ اللہ ہُو۔ اور سہروردیہ میں سے گزرے تو وہ دف کی تھاپ پر ذکر لا اللہ۔ روح کی گہرائیوں تک میں یہ دف کی تھاپ۔ نس نس رگ رگ سے فنا۔ پھر الا اللہ کی لذتِ بقا۔ حیّ وقیوم سے رابطہ کی بات۔ اور قادریہ۔ وہ بندگی کی مستحکم چٹان۔ تقویٰ طہارت باطنی۔ عاجزی مسکینی، محبوب کو راضی کرنے کے لئے ایک ٹوٹا ہوا دل۔ الغرض قادر نگر کی ہی سب کچھ تربیت و تعلیم۔ اپنی آئندہ فقر کی زندگی کا سرمایہ بنی۔ جیسے مشفق باپ نے اپنی اولاد کو سب کچھ دے دیا ہو کہ اب اُن کے اپنے بعد اس نورِ نظر کے ذریعہ حق کے انوار کی تجلّی زمانہ کو ملتی رہے۔ پاکستان آنے کے بعد بابا قادر اولیاء کے حضور پھر سے حاضری دینے کے لئے وجیانگر جنوبی ہند کا پہلا سفر ۱۹۵۸ء میں ہوا۔ قبلہ کی اس زمانہ کی ڈائری سے اقتباسات درج ذیل ہیں:۔

"وجیانگر کے سفر سے پہلے عشق لیلیٰ فلم کے ایک سین میں لیلیٰ خیرات دے رہی تھی۔ سوالیوں

میں مجنوں بھی شامل ہوگیا اور اپنا کاسہ لے کر لیلیٰ کے آگے پہنچا۔ لیلیٰ نے آنکھ اٹھا کر اپنے مجنوں کو دیکھا کاسہ اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ کاسہ ہاتھ سے گر کر چور چور ہوگیا۔ مجنوں! ہاتم۔ تم کو میں کیا دوں۔ میں خود تمہارے لئے ہوں۔ اللہ کا شکر ہے کاسہ میں کیسی کیسی درخواستیں اور کیا کیا تمنائیں بھر کر لئے جا رہا تھا۔ اللہ کا شکر ہے، خالی کاسہ بھی لے جاتا۔ صدقہ تو مل ہی جاتا انعام بھی مل جاتے مگر اللہ کا شکر ہے کہ کاسہ کو خود اپنے ہاتھوں سے پاش کروا کے چلا۔ کیسا لینا، کیسا دینا ؎

دونوں جہان دیکے وہ سمجھا کہ خوش رہا
یاں آپڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں

لاہور اسٹیشن پر لوگ رخصت کرنے آئے تھے۔ ان کے چہروں کی دمک ان کی بوجھل سی آنکھیں جیسے شبنم کے بوجھ سے پھول کی پتی جھک جاتی ہے ہار پھولوں کی خوشبوؤں میں ان کے سینے کی خوشبوئیں شامل تھیں بعض اوقات جدائی محبت کی گہرائیوں میں پہنچا دیتی ہے۔ لاہور سے آگے کا سفرِ ہند، شہزادوں کی طرح کٹا۔ آسمان جو کل تک دھوپ کی شدت دے رہا تھا آج ابر آلود تھا۔ ہلکی ہلکی رحمت کی پھوار۔ راستے کے مسافر دوستوں کی طرح معلوم ہوتے تھے۔ کسٹم اور پولیس تک کے لوگ سراپا خُلق تھے۔ اوہ! محبت بھی کتنی بڑی چیز ہوتی ہے۔ محبت دل میں امڈی ہو تو ماحول تک اس کی تائید کرتا ہے۔

راستے میں ناگپور آیا۔ ۱۳؍ اگست ۵۸ء شنبہ کو ۲۶ محرم تھا۔ عُرس کا دن تھا۔ ٹرینوں کے وقفہ کے دوران تین گھنٹے مل گئے۔ دوبارہ ٹھیک اس وقت پہنچ گیا جب حاضری کے لئے مزار کا دروازہ کھلا سجدۂ نیاز پیش کیا۔ اسٹیشن کی جانب واپسی میں جلوس دیکھا۔ جتھے پر جتھے امڈے آتے تھے۔ گانا ڈھول، سجے ہوئے گھوڑے۔ ہاتھی پر عماری۔ جھنڈے، پھول، چادریں،

نشان، علم۔ ریل میں سوار ہو کر وجیانگر پہنچے تو اسٹیشن پر لینے آئے تھے۔ ایک بڑی سی کار میں درِ محبوب تک رسائی ہوئی۔ باباجان دربار میں تھے۔ ایک سجدۂ شوق پیش کیا۔ چند الفاظ فرمائے۔ باباجان نے قوالی کا اشارہ کیا۔ ایک ڈھولک پر ایک عورت نے سرود الاپا۔ رات کو کھانے پر باباجان نے فرمایا۔ گاندھی نے صحیح مشورہ دیا تھا کہ ناگپور دارالخلافہ ہو وہاں بابا تاج الدینؒ کی حکومت ہے۔ ان کے دامنِ حفاظت میں رہتے۔

صبح چہل قدمی کے وقت احساس ہوا کہ وہ فاصلے جو میلوں کے تھے اب کتنے قریب ہو گئے ہیں۔ ۹ بجے صبح دربار لگا۔ اتنے قریب مگر اتنی دور۔ ابھی تک خصوصی حاضری نہیں ہوئی۔ دل اُچھل رہا ہے آنکھیں پُرنم ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ ہر چیز سے واقف ہیں۔ ابھی تک کتابوں کی جلدیں جو ساتھ لایا تھا پیش نہیں کر سکا۔ ابھی وہ کتابیں مانگی نہیں گئیں۔ دربار سے چلتے وقت باباجان نے فرمایا۔ ہمیں اپنی ہی خبر نہیں ہے۔ کس کس کی خبر رکھیں۔ پھر دوپہر کھانے پہ ارشاد ہوا۔ صبری ندی (قبلہ) اوہ کتنی گہری۔ دو تین تاڑ اور کتنی چوڑی مگر اس وقت پانی نہیں۔ موسم میں اف وہ تو راجمندری کو بھی ڈبو دے گی۔ یہ آگے چل کر گوداوری (باباجان) سے ملتی ہے۔

۱۶ اگست ۱۹۵۸ء:۔ یہ جو اتنی دور سے آئے ہیں۔ کوئی نہ کوئی زبردست مقصد ضرور ہوگا۔ یہ دنیا کے دھندے اور ہیں۔ بس کہہ دیتے ہیں کہ خوش رہیں گے اور فیض مل جاتا ہے۔ مگر یہ کچھ اور ہے۔ حق کا سودا ہے۔ (ندلیوں) ہزرد، تبرکوں (پرشاد) اور میمنوں (مومنین) کے دل دھک دھک کرتے ہوں گے۔ یہ حق کا سودا ہے کوئی ٹکر ٹکر نہیں۔ عجب کاروان ہے۔

ولی الدین کے ذکر کے ساتھ۔ سارے پاکستان میں دو تین فقیر بنیں گے۔ دیکھو

یہ چشتیہ ہی سب کچھ ہے ۔ دل کا ذکر ۔ چرخہ کی طرح دن رات چلتا رہے ۔ رہا دُعا ۔ وہ حکم ہے ۔ ایک پردہ ہے ۔

تمہارا دل ابھی پورا پکا نہیں ہے مگر تم پکّے فقیر بنو گے ۔ بڑے فقیر بنو گے جتنا بڑا تمہارا باپ ہے یہ کُن فیکون ہے ۔ کُن اندھیرا ۔ فیکون اجالا (تین دفعہ فرمایا) ۔ اندھیرے سے اُجالے میں ۔ سارے افسر اور ساری دنیا اور ملائک ہاتھ جوڑے کھڑے ہوں گے ۔ دیکھو سُرخ پر سبز ہوگا (لال قلعہ پر اسلامی جھنڈا) اور ساری اس ساحل کی حکومت یہ جو کچھ ہے گوداوری (باباجان) کے دم تک ہے ۔ یہ خشک ہوئی اور کایا پلٹا ۔ بڑی گڑبڑ ہوگی ۔ لوگ مریں گے ۔ مگر زندگی چلتی رہے گی ۔ یہ اندھرا کے ساحل تک ۔

۱۷ اگست :۔ كُلُّ شَيْءٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتِ ۔ میں کہتا ہوں كُلُّ شَيْءٍ ذَائِقَةُ الاسلام ۔ میں نے لالہ عبدالرحیم نیازی صاحب کی پُرزور سفارش کی ۔ ارشاد ہوا آئیں گے تو پائیں گے ۔ آئیں گے تو ضرور پائیں گے ۔ میں نے عرض کی کہ وہ بہت ضعیف اور معذور ہیں فرمانے لگے اگر قسمت میں ہو تو آئیں گے ۔ میں نے عرض کیا "آخر قسمت کا علاج بھی تو آپ کے ہاتھ میں ہے" ۔ ارشاد ہوا شوق اور طلب ہو تو ضرور آئیں گے اور پائیں گے ۔ نہایت جوش میں تھے اور تھوڑی دیر پورا نام دہرا کر اور آنکھیں بند کرنے کے بعد فرمایا "آئیں گے تو پائیں گے ۔ بے ریاضت کا پھل اور کہیں بھی نہیں مل سکتا ۔

۔ اگست :۔ عبدالحمید کا ذکر کرتے ہوئے ۔ دیکھو عورت کا مایا (گہرائی) دیو بھی نہ پایا دیوا (بزرگ) بھی لٹ پٹ (فدا) ہوتا ہے ۔ مگر خوب یاد رکھو عورت کا مایا دیو بھی نہ پایا ۔ عشق عشق عشق ۔ نہ عشق کو دیکھ سکتے ہیں ۔ نہ سن سکتے ہیں ۔ نہ پکڑ سکتے ہیں ۔ اس کو مضبوط پکڑو ۔

۱۸ اگست :۔ رات کو فرمایا "عشق عشق ۔ یہ ہی سب کچھ ہے ۔ کُن فیکون ۔ اندھیرے

ہے روشنی۔ سب کچھ ہوتا جاتا ہے اور ملائک مُہر لگاتے جاتے ہیں۔

۲۴ر اگست : عموماً جب دربار سے حضور تشریف لے جاتے ہیں تو فرماتے ہیں تھوڑی دیر بیٹھ کر چلے جانا۔ کس قدر معنی ہیں۔ یہ کہ حضوری صرف میری موجودگی میں ہوتی ہے مت سمجھنا۔ آنکھیں مجھے نہ دیکھ رہی ہوں تب بھی میری موجودگی کو محسوس کرو۔ جیسے لوگ نماز سے فارغ ہو کر ایک گہری سانس لیتے ہیں کہ چلو فرض ادا ہوا اب ہم اپنے کام کریں۔ یہ غلط ہے۔ دائم حضوری صرف محبت اور عشق میں میسّر آسکتی ہے۔

۲۶ر اگست : باباجان نے فرمایا "دل وہی دل ہے کہ جس دل میں تری یاد رہے" ایسا دل جب چاہے بند ہو سکتا ہے اور اگر بند بھی ہو جائے تو اس سے کہہ دیں کہ چل تو کلاک کے پنڈولم کی طرح چلنے لگتا ہے۔ تجھ پہ قربان۔ ترے محبوب پہ قربان اے دل۔ (اگزشتہ دس سالوں میں تقریباً" تین چار بار قبلہ پر ایسے دورے پڑے کہ دل ساکت۔ نبض بند۔ سانس بند۔ پھر دو ایک منٹ میں یا ایک بار تو کم از کم تین منٹ بعد واپس)

عُبیداللہ حق کی زبان سے کچھ کچھ الفاظ نکل جاتے ہیں یہ بے ربط معلوم ہوتے ہیں مگر ان کو جوڑ کر، ملا کر، خوب سوچ کر، ایک تسلسل میں لکھا کرو۔ ولی اللہ میں طاقت ہے اللہ کی تیر بھی آدھے راستے سے واپس لاتے ہیں۔ ایک طوفان (جنگ) آرہا ہو تو کہہ دیتے ہیں ہٹ جاؤ (ہاتھ سے اشارہ کر کے)، صرف دل سے کہہ دیتے ہیں اور وہ ہٹ کر دوسری طرف ہو جاتا ہے۔ کوئی دیوار نہیں کچھ نہیں ...... بہت سے ولی اور پیغمبر آئے اور اپنا کام کر کر چلے گئے۔ وہ گمان میں رہتے تھے کہ یہ ہو گا اور وہ ہو گا۔ وعدہ کے ساتھ کون آیا اور کیا کرے گا

۲۷ر اگست : توکل بڑی چیز ہے توکل بر اللہ۔ اللہ کارساز ہے چاہے پندرہ سو میل دور ہو۔ دل سے یاد کرو اور یہاں مُہر لگ جاتی ہے۔

۲۸ اگست :- عنقریب گوداوری چلنے والی ہے پھر دیکھو لال کی سب پھرے گا ضرور اور یقینی سبزی پھیل جائے گی ۔ (یعنی لال قلعہ پر اسلامی جھنڈا ہوگا)

۳۱ اگست :- فرمایا ہر کوئی خدمت کے لئے آتے ہیں ۔ آدمی ہی نہیں ملائک بھی ہزاروں اگر دیکھنا چاہو تو معمولی لباس میں ڈاڑھی جبّہ میں نظر آئیں گے اور پھر غائب ۔ اگر منکر نکیر سے بھی کہہ دیں مت آنا تو نہیں آئیں گے ۔ یہ مٹی کا پُتلا تو یہاں کھڑا ہے مگر ہے کہاں ۔ کس کے دل میں بسا ہے ۔ یہ غیب کی باتیں ہیں ۔ ایمان بدل گیا تو دنیا بدل گئی ۔ پھر کچھ نہیں ۔ ہزار نماز پڑھو، سر پٹکو ۔ اس در سے دُھتکارا ہر در سے دُھتکارا جائے گا ۔

۲ ستمبر ۵۸ء :- اکیسویں شب کھانے پر باباجان نے قبلہ سے فرمایا " یہ زمین بنی یہ فلک بنا ۔ یہ ملک بنا یہ بشر بنا ۔ کوئی بادشاہ و امیر ہے کوئی بے نوا و فقیر ہے ۔ جسے چاہا جیسا بنا دیا ۔ تری شان جلّ جلالہٗ ۔ جسے چاہا مُردہ بنا دیا ، جسے چاہا زندہ اٹھا دیا ۔ ترے ہاتھ میں ہے فنا بقا تری شان جل جلالہٗ ۔ یہ سب لفظِ کُن کا ظہور ہے ۔ روح الامین کو سینچے جاؤ ۔ سانس اندر رزاق (جلی) ۔ سانس باہر اداب ۔ تصوّر بھی صرف رہبر کا ۔ ادھر اُدھر کے تصوّر آئیں تو ہٹا دیں (دَم) جب مجھ میں تو سو جائے اور تجھ میں میں ۔ (کالی توحید) تو پھر تو کون اور میں کون ۔ ملک الموت بھی ایک چرواہے کی شکل میں آتا ہے کہ میری بکری دے دو ۔ دُھتکارو تو چلا جاتا ہے ۔ پچاس ہے سمجھو دس اور ۔ اور پھر دس اور ۔ اور چاہو تو دس سال اور ۔ یہ جتنی سختیاں ہوتی ہیں صرف کہو کہ جوتے سے مارو تو ان کے جوتے تڑاتڑ لگتے ہیں اور جتنی بلائیں اور گردشیں ہیں وہ سو گز ، ہزار گز دور رہتی ہیں ۔ اگر چاہیں کہ جوتوں کو چوہیں تو بھی نہیں آسکتیں ۔

۳ ستمبر ۵۸ء :- بسم اللہ ۔ نئے دور کا پہلا دن ۔ کیا لطف ۔ سرور و مستی ہے

خود بخود می آید ایں رفتارِ دوست ۔ دوپہر کھانے پر باباجان نے فرمایا ۔ سنا ۔ صابری ندی (قبلہ) خوب زور سے چڑھ رہی ہے ۔ ایک گھنٹہ میں تین انچ ۔ گرمیوں میں دیکھا تھا ۔ اُف ایک تاڑ دو تاڑ کا گہرا بہاؤ تھا اور صرف بیچ میں پانی پر کشتیاں بہہ رہی تھیں ۔ یہ گوداوری میں ملتی ہے ۔ مگر راجمندری کو کوئی خطرہ نہیں ۔ ندیوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ کتنی بارش ہوئی

۱۵ر ستمبر
یکم ربیع الاول

بسم اللہ ۔ آج صبح کے دربار میں بہت بھیڑ تھی ۔ حضور کی عجب شاہانہ شان تھی ۔ دوپہر دربارِ خاص میں فرمایا "یہ جنگی جہاز ہے ، یہاں آیا تھا ۔ (مراد قبلہ سے تھی) عبید اللہ پنجگانہ برابر ادا کر رہے ہو نہ ۔ یہ اپنی جگہ اور جو ذکر ہے وہ قائم رہے ایک دفعہ یاد اور فتح ۔

۱۹ر ستمبر ۔ دربارِ عام کے بعد جلوۂ عام میں باباجان نے فرمایا ۔ اور بھی بزرگ آئے اور زندگی میں کچھ کر گئے ۔ مرنے کے بعد بہت کچھ کر رہے ہیں ۔ مگر یہ کبھی تم نے دیکھا یا سنا کہ زندگی میں جو کچھ ہو رہا ہے مرنے کے بعد کیا کیا ہوگا ۔ تا قیامت ۔

! مہندی کے پتے ہاتھوں پر باندھ لیں تو کیا ہوتا ہے ۔ مہندی کو پہلے پانی کے ساتھ خوب خوب رگڑنا ہوتا ہے ۔ پانی ضروری ہے ۔ (ذکر) تھوڑی رگڑ کے بعد پیلا رنگ چڑھتا ہے (اسپردگی) اور رگڑ کر لگاؤ تو سرخ (عشق کی آگ) ۔ اور خوب رگڑو تو سیاہ (توحید) ۔ یہ میں اور تو کا رنگ ہے ۔ یہی ریاضت ہے ۔ پھر شہادت کی انگلی بائیں ہاتھ کی انگلی سے ملا کر فرمایا ۔ میں اور تو ۔ تو مجھ میں ، میں تجھ میں ۔ میری دل میں بسا ہے ۔ ایک ہی ہے ۔ جو میں کہتا رگڑ ۔ دل [illegible] ہو بھی جل جائے جس عالم میں تو رہا ہے ۔ تجھ پہ صدقے تیرے [illegible] [illegible] کو معلوم ہے کوئی فکر نہ کیا جیسے [illegible] [illegible] یا اب ہو یا ایسا ہو جائے گا اور ہو گیا ۔ ایسا نہیں ویسا ہو جا اور ہو گیا ۔

سب کو ایک دن جانا ہے ۔ ہاں کسی کا بھلا کرو تو وہ ساتھ جاتا ہے اور کام آتا ہے ۔ البتہ رنگے ہوئے ہاتھ کا رنگ نہیں چھوٹتا ۔ جو یقین ایمان پکا ہو تو تو میں ہوں اور میں تو ہے ۔ بُغض سے تباہی ہے ۔ فقیری میں ایک مقام ایسا آتا ہے کہ پیر سے حسد اور بُغض پیدا ہو جاتا ہے ۔ یہ بڑی سخت تباہی ہے ۔ صحیح نماز اس تباہی سے بچاتی ہے ۔

۲۰ ستمبر ۔ رات کو ارشاد ہوا :

ترے لفظ کُن کا ظہور تھا تری شان جل جلالہٗ
جسے چاہا جیسا بنا دیا تری شان جل جلالہٗ
جسے چاہا مُردہ بنا دیا جسے چاہا زندہ اٹھا دیا
ترے ہاتھ میں ہے فنا بقا ، تری شان جل جلالہٗ
کوئی بادشاہ امیر ہے ، تو، تو بے نوا فقیر ہے
جسے چاہا جیسا بنا دیا تری شان جل جلالہٗ

جب میں تجھ میں ہو گیا ۔ تو تو کون اور میں کون ۔ کوئی شخص سامنے آیا ۔ بس کہہ دیا جا تیری جیت ۔ قسمت میں نہ بھی ہو تو کہہ دیا جا تیری جیت ۔ بس کچھ اور کرنے کی ضرورت نہیں ۔ چوبیس گھنٹہ نفس و جان کا چرخہ چلتا رہے اور پنجگانہ ادا کرتا رہے ۔ یہ بندگی ہے ۔ سارا ، سب کچھ ایک لفظ کُن ۔ اس کو خوب سمجھو اور لکھو ۔ دنیا کے کام آئے گا ۔ تیرے ہاتھ میں ہے ، فنا بقا ، چاہے ہڈیاں گل گئی ہوں ۔ یہ باتیں اگر لکھ بھی دیں تو بہت کم ہوں گے جو سمجھیں گے یا پکڑیں گے مگر تم خوب سوچ کر لکھنا ۔

۲۴ ستمبر
۱۰ ربیع

ہ ابتدائے آفرینش کی طرح آج سارا آسمان کالے بادلوں سے گھرا ہوا ہے ۔ صرف ایک قطعہ پر عجیب قسم کی روشنی ہے ہر چیز نکھری

ہوئی دکھائی دے رہی ہے۔

اقراء باسم ربی۔ پڑھ اپنے رب کے نام کے ساتھ۔ یہ حکم ہوتا ہے ایک اُمّی کو۔ بسم اللہ
بہ اسم اللہ۔ رب صفات کا مجموعہ ہے۔ اللہ ذات کی نشانی ہے۔ اسم اللہ کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ
نے آدم کو اسماء سکھلا کر فرشتوں پر فوقیت دی۔ اسمِ اعظم کیا ہے۔ کُن فیکون کی چابی کون سی
ہے۔ جبرئیل کون تھے۔ اور اللہ تعالیٰ اور رسولؐ کے درمیان یہ قاصد کون ہے۔ روح الامین
کیوں کہلائے۔ ان کو اگر سمجھے تو یہ برکتِ بسم اللہ کُن فیکون کی چابی مل سکتی ہے۔

۲۶ ستمبر / ۱۲ ربیع :۔ آج امتی دن ہے۔ پیش کرنے کے لئے سوائے اس کے کیا ہے۔ غربت
جہالت، ایمان کی کمی۔ آج ہم اس اُمتِ بدنصیب کے لئے دعا کریں گے
تو اس کے گناہوں کو بخش دے اور اپنی حیاتِ طیبّہ سے اس کو زندگی بخش۔ آج صبح سے ولی الدین
بے اختیار یاد آ رہے ہیں۔ ایک بیمار تھا۔ حکیم کے آگے پیش کرنا تھا۔ یہ سوچا کہ وہ تو کُن فیکون
ہے۔ بیمار کو کیا پیش کریں۔ تین ٹکڑے کئے اور پیش کئے۔ اب ان کی مرضی کوّے چیلوں کو ڈال
دیں یا زندہ کریں۔

حضور نے جو بکری والے مستان کا ذکر کیا تو میں نے سوچا کہ صرف غربت، جہالت
اور کم ایمانی ہی بیماریاں نہیں ہیں۔ اس امت کو جذام کی بیماری ہے۔ پھر بابا جان نے کچھ دیر آنکھیں
بند کرنے کے بعد فرمایا ٹھیک ہو جاتا، خواہ ہڈیاں ہی گل گئی ہوں۔ یہ کُن فیکون ہے۔

۱۴ ربیع :۔ ارشاد ہوا۔ کھانے کے بعد دماغ بے کار ہو جاتا ہے۔ اسی لئے تو پیٹ
پر پتھر باندھتے تھے اور ختم المرسلین کہلائے۔ اور ہم سب ان کے امتی۔ کیا کھانا چاہتے تو ایک
روٹی کا ٹکڑا نہ ملتا۔ مگر ان کو سوچنا تھا۔ دوپہر تھوڑی سی دیر لیٹ جاتا ہوں۔ نماز جب تک
ٹھیک نہ ہو نہیں چھوڑتا۔ جب تک کام پورا نہ ہو پکڑ پکڑتا ہوں۔ جب خیال آیا تو پورا کر کے چھوڑتا ہوں۔

۱۶ ربیع :- ارشاد ہوا ، تم اپنے خیال یا ہٹ پر قیام مت کرو ۔ بلکہ محبت ، عشق دل میں رکھو اور رحمت کے منتظر رہو ۔ رحمت کا روپ وہی ہوگا جو تمہارے لئے بہترین ہو ۔ ممکن ہے تمہارا خیال تمہارے حق میں بہتر نہ ثابت ہو ۔ حق کو تم سے محبت بھی ہے اور عشق بھی ۔ وہی کرے گا جو تمہارے حق میں بہترین ہو ۔

اپنا غذا نت یا ترکیبیں مت کرو ۔ جو بات بتایئں درد دل سے کرو ۔ وہ راستے خود بخود پیدا ہو جایئں گے حق کو جو منظور ہیں ۔

۱۸ ربیع :- بغض یا حسد یا کینہ کا کیڑا ایسا چور ہے کہ بظاہر سر بسجدہ ہوتا ہے مگر یہ کیڑا دل کا گوشت کھاتا رہتا ہے اور تباہی و بربادی کا باعث ہوتا ہے ۔ اس کا واحد علاج عجز و انکساری ہے ۔ چاہے جذامی ہو یا کوئی ہو ، ہر ایک کے آگے خلوص دل سے ہاتھ جوڑنا ہے کہ یہ تیرے ہی روپ ہیں ۔ دوسری بات یہ کہ پیر کا حکم بظاہر بڑا ہی سادہ ہوتا ہے مگر اٹل ہوتا ہے اس میں اگر تاویل پیدا کریں یا بال برابر بھی تجاوز کریں تو عین بربادی ہے ۔ اس کی استقامت نماز سے حاصل ہوتی ہے ۔ کسی حال میں نہ چھوڑے ۔

۱۹ ربیع الاول :- فنا فی الشیخ ، فنا فی الرسول ، فنا فی اللہ ۔ مہندی ہاتھوں میں باندھ لیں تو کیا فائدہ ۔ پانی ملا کر پیستے جاؤ ، پیلا رنگ اور باریک پیسو سرخ اور بالکل باریک پیس ڈالو تو کالا ۔ جو کبھی نہیں چھوٹتا ۔ فنا فی الشیخ بابا تاج الدینؒ تھے ۔ اتنا فنا ہو کہ تو میں ہوں اور میں تو یا تمؐ (محبت بھری نظر سے دیکھا) ۔ پھر ان کے امتی ہیں ۔ نماز ادا کرتے ہیں ۔ پھر اللہ ۔ تو اللہ ہے یا ہی اللہ ۔ مگر یہ چیزیں بغیر ریاضت کے ممکن نہیں ۔ اگلے بزرگؒ تھے مگر دنیا کے ٹکڑے [illegible] ۔ پھر راستے [illegible] سکتے ہیں ۔ اور یہ [illegible] ہے ۔ پھر کیا کوئی جلال تم دیکھتے ہو ۔ جمال ہی جمال ہے ۔ سب کچھ روبرو ہے ۔ کہہ دیا اور ہوگیا

راستہ کھول کر بھی بتائیں تو کسی کی سمجھ میں نہیں آتا ۔ راہبر ہی بتاسکتا ہے ۔ ارشاد ہوا ذکر، فکر کے ساتھ کیا کرو ۔ خیالِ یار کا نام فکر ہے ۔ نہ صرف قلب ہی چلتا رہے بلکہ اس کے ساتھ خیال بھی لگا رہے جب خیال پکا ہو گیا ۔ ہمہ تن متوجہ ہوئے تو تصور جم گیا اور توجہ قائم ہو گئی ۔ ذکر چوبیس گھنٹہ چلتا رہے اگر صحیح ذکر، فکر کے ساتھ صرف آدھ گھنٹہ بھی ہو تو چوبیس کے برابر ہے ۔ اور چوبیس گھنٹہ یوں بھی ہوسکتا ہے کہ دن میں ہر توجہ کے اختتام پر ذکر ہو اور سوتے وقت اسی میں سو جائیں ۔ اسی میں صبح کو اٹھیں ۔ ایک تیسرا طریقہ پاس انفاس والا ہے ۔ یہ ذکر فکر تحت الشعور میں جم جاتے ۔ یہ مٹ نہیں سکتا ۔

۲۰ ربیع ہ ٹھیک چار بجے شہنائی شروع ہوئی ۔ عجب کیفیت ہو گئی پاس لوگ بیٹھے تھے مگر آنسو تھے کہ اُمڈے آ رہے تھے ۔ نہ معلوم یہ غم کے آنسو تھے یا خوشی کے ۔ روح کی سواری شہنائی کے راگ پر ۔ مرڈنگ کی تال ۔ جبرئیل خادمہ، والبراق مرکبہ، والمعراج سفرہ ۔ وسدرۃ المنتہا مقامہ وقاب قوسین ....

یہ صرف روح کی سیر نہ تھی بلکہ سفر تھا ۔ راستے کی کیفیتیں اور لطافتیں تو اپنی جگہ ۔ منزل ہمیشہ منتظر ہیں ۔ پھر دیکھیے وہ دل کا اضطراب جو فزوں تر ہوتا جاتا ہے ۔ اسی کیفیت میں اذان، پھر نماز ۔ اُف نماز کتنی پیاری چیز ہے ۔ کتنا احسان ہے اس مالک کا کہ اتنی آسانی سے بحضورِ کبریا رسائی ہو جاتی ہے ۔ شہنائی کے ترنم پر روح کا ذکر ۔ ڈھولک کے دائیں پر نفس اور بائیں پر قلب کا ذکر بلی وخفی حضوری ۔ شہنائی کے ساتھ روئیں روئیں سے سنتا اور رگ رگ کا بجنا ۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روح ازلی کبھی دور ہے کبھی شہ رگ سے بھی قریب ہو کر اس وجود [illegible] کبھی شیرینی لطافت ہے ۔ کبھی آس او پیاس ہے کبھی دلکش اسعباں آفرینی سے اپنی طرف بلا رہی ہے ۔ ڈھول پر دائیں ہاتھ کی پانچوں انگلیاں

ایسا معلوم ہوتا ہے یہ سر کا سودا ہے اور تگ و دو میں سرگرداں ہے ۔ یہ کیسے پہنچے ۔ بائیں لکڑی کی دھم گویا یہ قلب کی رفتار ہے ۔ مستانہ وار ۔ ایک ہاتھی کی چال کی طرح ۔ منزلِ جاناں کی طرف رواں دواں ۔

دو گھڑی کے لئے سرتی بند ہو گئی ہے ۔ اُف کس قدر صفائی کے ساتھ جیسے گہرے بادل پھٹ گئے ہوں اور سورج کی نکھری ہوئی کرنیں فضا کو منور کر رہی ہوں ۔ زندگی سے ماوراء ۔ وجود کی پابندی سے آزاد ۔ یہ روح کی نکھری ہوئی آواز ۔ کس بانکپن سے اشارہ کر رہی ہے کہ چلے آؤ شہنائی تھم جاتی ہے ۔ سُرتی پھر رواں ہے ۔ دونوں ڈھولوں میں سوال جواب ہوتا ہے ۔ یہ میں اور تُو کی کشمکش ۔ جب دونوں یکے بعد دیگرے ترازو میں پورے اترے تو پھر دونوں ساتھ بجنے لگتے ہیں ۔ چار ہاتھ ہیں ۔ دو ڈھول ہیں ، مگر ایک آواز ۔ میں ، تُو ، جاں ، قلب ، روح ۔ یہ پنجتن پاک کا گویا دستِ مبارک ہے ۔ علی ، عثمان ، عمر ، ابوبکر ، میم کا انگوٹھا ۔ بیچ میں لے کر مٹھی بند کیجئے ۔ دل کی کلی بن جاتی ہے ۔ کھولیں تو دستِ عطا ہے ۔ سر پہ سایہ ہے ۔ پیٹھ پہ ہاتھ ہے ۔

۳۰ ربیع :- اے مالک جو میرا عشق ہے یہ صرف تیرے عشق کا ایک ہلکا سا پرتو ہے جب ذرا دل کی صفائی ہوئی ۔ جب ذرا میں کا پردہ ہٹا تو دیکھا کہ شعاع تیری طرف چلی ۔ اس کا پتہ چلا جب میں نے تیری ایک جھلک دیکھی ۔ تو فنا در فنا ہو گیا ۔ میرے مالک ، میرے آقا تو ہی تو ہے

۳ ربیع الثانی
۱۷ اکتوبر سنہ

آج باباجان کے ساتھ تصویر کھنچوائی ۔ جو چمپا کے تین پھول باباجان کے ہاتھ میں تھے مجھے دیئے ۔ دائیں طرف لچھمی نرائن تھے ، بائیں طرف میں اور درمیان میں باباجان ۔ یہی تصویر کسی نے دو مہینہ پہلے بشارت میں اسی تعین کے ساتھ پہلے سے دیکھی تھی ۔ اب سوچ کہ یہ ہمارے اعمال اپنے ہیں یا پہلے سے مقرر شدہ نقوش کی تائید ۔ پھر یہ بے چینی کیوں اور یہ رونا کیوں ۔ اگر دل سے مجبور ہو تو خیر ۔ یہ گو برا گر سمجھیں تو تاج کی بجاوٹ کام میں آئینگے

دربار میں جب باباجان کے پیر سُن ہوگئے اور باہر گئے تو مجھے پیر دبانے کا موقع ملا۔۔۔
الحمدللہ ۔ دل سے خدمت کے معنی سمجھ میں آئے ۔ باباجان کے پیر میں دبا رہا تھا اور آرام مجھے ملا
ساتھ ہی جیسے میرے پیر بھی دبائے جا رہے ہیں ۔

آج دربار کے بعد کڑک بجلی مستان سے جذب و سلوک پر گفتگو رہی ۔ محبوب ۔ ودود ۔
قرب جدائی ۔ تخلیق عالم ۔ غوث ، قطب ابدال اسم اعظم وغیرہ پر باتیں ہوتی رہیں ۔ قرآن کریم
کی اہمیت کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا ۔ قرآن کھانے میں اتنا مزہ نہیں آتا ۔ جتنا اُگلنے میں ۔ اندر
سے باہر نکالیں تو اس کی کچھ اور ہی لذت ہوتی ہے ۔ یہ بھی فرمایا کہ تین قرآن ہیں ۔ ایک فرقانِ
عظیم ۔ ایک حدیثِ قدسی ۔ ایک حدیثِ رسولؐ ۔ یہ جو اہلِ شیعہ کہتے ہیں کہ دس جزو غبن ہوگئے ۔
یہ بات دوسری ہے یہ دس جزو ، زمانہ کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں ۔ حکم حق کا ہی ہوتا ہے مگر
پورا کرنے والا ہے ۔

۱۸ ر اکتوبر ۱۹۵۸ء :۔ آج صبح رفعی فقیروں کا حلقے میں ذکر ہوا ۔ مجھ سے مخاطب ہوکر
باباجان نے فرمایا " عبیداللہ اس سرحدی پٹھان کے ہاتھ سے ان فقیروں کو بیس روپیہ دلوا
دینا ۔ شکر الحمدللہ ۔

۲۲ ر اکتوبر :۔ دین کی پختگی اور ترقی کے لئے دنیا کا ہونا ضروری ہے ۔ دنیا کے بغیر
جسے یکسوئی کہتے ہیں وہ ایک خام چیز ہے ۔ دھوکہ ہے ۔ اس کا راہرو ایک تالاب کے مینڈک کی
طرح خطرات سے محفوظ مگر بند رہتا ہے ۔ دنیا میں رہے تو باطنی طور سے ایک دیوار کی حد سے
جو پار ہو جاتا ہے اس کی ترقی کی کوئی انتہا نہیں اور جو اس طرف ہو جائے وہ دنیا میں پھنس جاتا ہے
نیند بُری طرح لپٹی ہوتی ہے ۔ جی چاہتا ہے ۲، دن تک سوتا رہوں ۔ کوئی تھکن نہیں
۔ نہ ورزش ہے ، نہ ہی سکون کی کیفیت ہے ۔ لیلیٰ نیند کی صورت محیط ہے ۔ اندر باہر نیند ہی

یلند ہے۔ آنکھ کھلتی ہے تو لیلیٰ کالے برقع میں نظر آتی ہے۔ اب تک میں محمل کو ہی لیلیٰ سمجھ بیٹھا تھا مگر جیسے ہی آنکھیں بند ہوتی ہیں تو بس لیلیٰ ہی لیلیٰ ہے۔ نہ نور ہے نہ نار ہے۔ یہ سورۂ یٰسین پڑھنے سے نہیں بلکہ ہونے سے روشن ہوا۔

۱۴ ربیع الثانی
۲۷ اکتوبر شنبہ

آج صبح بھی حضور دربار میں تشریف نہیں لائے۔ دوپہر کھانے پر ارشاد ہوا اٹھالو۔ پانچ گرم گرم پھلکے اٹھالئے۔ اجازت اتوار ۲ نومبر کی ملی ہے۔ ۸ سال تک دو ملتے رہے اور خادم کہتے تھے نہ معلوم یہ دو حصے کیوں ہیں اس کے بارہ سال ہوئے پہلے چلّے میں تین ملتے رہے۔ دوسرے چلہ میں چار۔ آج پانچ۔ مگر فرمایا اٹھالو۔ یہ ذمہ داری یہ بوجھ خود اٹھانا پڑے گا۔ دودھ پینے کے زمانے ختم ہو گئے۔ خود چبانا ہوگا۔ اور ٹوکرے اٹھانا پڑیں گے۔

۲۰ ربیع الثانی
۲ نومبر شنبہ

جب قادر نگر سے چلا تو شہنائی کی ٹولی نے۔ السلام، یا نبی سلام علیکم بجانا شروع کیا وہ طلوع کی نازک اور لطیف روشنی وہ ہلکا ہلکا سرور۔ دل کی اُمنگیں سے عجیب زندگی است، عجب ترحیات است ؎

ایک طائرانہ نظر سے دیکھا جائے تو جہاں ناگپور کے دربار میں نگاہوں سے کام، کلماتِ کُن سے کام اور ٹھوکر سے کام ہو رہے تھے وہی اب کچھ جمالی رنگ میں دربار قادر نگر سے ہو رہا تھا۔ اب جلالِ کبریائی کو جمالِ مصطفوی کا روپ ملا تھا۔ آتشِ عشق کی تپشِ سوزاں کو اپنے وجود میں جذب کر کے گلزار بنا دیا گیا تھا اس کے لئے بابا قادر اولیاء کو ناگپور سے عین عالمِ جمالی میں واپس آنے کے بعد اکیس سال جذب میں گزارنا پڑے تھے۔ پھر جب جذب سے باہر آئے تو باقی عمر سلوک کی خواہش ونشان سے زمانہ کو فیض پہنچایا۔ خوب بیان کیا ارشاد فرمایا تھا اس امت کے لیے جتنے ٹوکرے ہم نے ڈھوئے کیسے ڈھونے پڑے تھے: اب امت کو کچھ نہیں کرنا سوائے

اس کے کہ پھل کھائے ۔ اب فتح مبین ہے ۔ جن آنکھوں نے دربار کے نقشے دیکھے وہ اس نتیجہ پر ضرور پہنچے کہ اب باباتاج الدینؒ نئے روپ میں جلوہ فگن تھے گویا

نظر آیا جلالِ کبریا شیرِ خدا ہو کر
جمال اللہ کا ظاہر ہوا مشکل کشا ہو کر

اس ناگپور والی عقل کو خیرہ کر دینے والی شانِ ولایت کے بعد قلوب کی سطح پر کارفرمائی تھی ۔ قلوب کو حق کی جانب رجوع کرنے کے لئے محبت و فیض کے دریا جاری تھے ۔ اُسی ناگپور کے عطا کردہ فقر کے طفیل، کاروانِ انسانی کو ایک اور قدم آگے بڑھانے کا راستہ کھول دیا گیا باباقادر اولیاءؒ کی جمالی شان میں محبت و عشق کی وہ محفل جمی جس کی صدائے بازگشت جگہ جگہ عالمِ انسانی کے قلوب سے آج بھی گونج رہی ہے ۔ چونکہ یہ فقرائے باطن عالمِ مثال سے کام کرتے ہیں اس لئے اپنے زمانے سے پہلے ہی انکا ورود ہوتا ہے ۔ اور زمانہ عقل و ہوش و بصیرت رکھنے کے باوجود ان فقراء کی حقیقت سے ناآشنا ہی رہتا ہے ۔ یہ سلسلہ در سلسلہ کڑی در کڑی وہ نظام ہے جس کی بنیادوں پر ہی کہیں اگلے زمانوں میں ظاہر کے بھی فروغ کی راہ کھلتی ہے ۔ اس طرح ظاہر باطن کی میزان میں حیاتِ انسانی جاری رہتی ہے ۔ ظاہر بینوں کی نگاہیں ظاہر تک رہتی ہیں اور مصلحین ظواہر ہی کو فروغ کا باعث سمجھتے ہیں ۔ اسی طرح باطن میں رسائی رکھنے والوں کے لئے باطن ہی حقیقت ہے اور فروغ کی راہ باطن میں ہی ہے ۔ مگر حق کی نظر سے دیکھا جائے تو پہلے باطن اس کے بعد ظاہر ۔ دانہ دانہ کی فطرت میں ودیعت ہے ۔ نہ باطن کے بغیر ظاہر کے کوئی معنی ہیں نہ ظاہر بغیر باطن کے کوئی معنی رکھ سکتا ہے ۔ وحدت کے انداز میں باطن اور ظاہر ایک ہی حقیقت ہے ۔ ایک ہی یکتائی ہے ۔ زمانے کے فرق و فاصلوں سے اس حقیقت میں کوئی فرق نہیں پڑتا ۔ ہر شجرِ مبارک کی جڑ پہلے زمین میں ہے

مستحکم ہے اور پھر اس کی فرع اس کا ظاہر آسمانوں میں پھیلتا ہے۔ اس لئے سمجھ دار کے لئے یہ باطن ظاہر کا تضاد دراصل کوئی تضاد نہیں۔ یہ تو صرف عقل کا پیدا کردہ تضاد ہے۔ ظاہر کا ہر عمل تو اُس صداقت کی گواہی دیتا ہے جو باطن میں ہے۔ اذان، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اس باطنی رجوع کی تصدیق ہوتے ہیں جو ایک طالب کو میسر ہوتا ہے۔ اب اس قلب کی دنیا سے ایک قدم آگے سارے زمانے کے لئے وہ راہ بھی کھلتی ہے جب جلال، جمال کے روپ کو کمالی شان میں دھار کر انسان کو اس کے اعلیٰ مقام کی طرف لے جاتا ہے۔ یہ مقامِ روح یعنی عالمِ امر کی بات ہے۔ اور فی زمانہ فقرائے باطن کا عالمِ انسانی کے لئے یہی خصوصی کام ہوگا۔

قبلہ درانی صاحب نے اس حقیقت کو اچھی طرح جان لیا ہے کہ انفرادی تمام بلندیوں کے باوجود ہر فقیر کو اپنے اپنے زمانے میں وہی کام سپرد ہوتا ہے جو اُس زمانہ کے لحاظ سے عالمِ انسانی سے رابطہ کی بات ہو۔ اور اگلا قدم، اگلا بوجھ اپنے اپنے زمانے میں دوسروں کو اٹھانا ہوتا ہے۔ اپنا انفرادی عروج ایک طرف۔ افراد کی اصلاحِ باطن یا ارتقائے باطن ایک طرف۔ مگر عالمِ انسانی اور امت کے لئے صرف اسی حد تک اس کا مشن ہوتا ہے جس سطح پر اس زمانہ میں باطنِ عالمِ انسانی آچکا ہوتا ہے۔ چنانچہ اب اگلا زمانہ اس جمعی سطح پر کام کرنے کا مقامِ روح ہے اور مقامِ روح میں قدم رکھنے کے بعد روحِ اعظم سے رابطہ ہے۔ انفرادی روح کی حقیقت روحِ اعظم کے سمندر میں ایک حباب سے زیادہ نہیں جس کی حقیقت فنا ہے اس لئے کارِ جہان، روحِ اعظم کے جمعی انداز میں ہونا ہے جس کے لئے بغیر جمعیت کے کام نہیں بنتا اور اسی لئے ایک توحیدِ فکر فقرا میں آئی ہے۔ یوں بھی زمانہ کے لحاظ سے یہ گروہ بندی اور جمہوریت کا زمانہ ہے۔ اسلام کا وہ پہلا پیام جمعیت بندی اب مادّی سطح پر بھی ہونا ہے ،

قلب کی سطح پر بھی ہونا ہے اور روح عالم امر کی سطح پر بھی ہونا ہے۔ تب ہی کہیں اسلام کا پیام تمام عالم انسانی میں پھیلایا جا سکے گا۔ مشیتِ ایزدی کے تحت زمانے کے مطابق فقراء کا ظہور ہوتا رہا ہے۔ انسانی جسم کی زندگی محدود اور مختصر ہے اس لئے ایک جسم کی فنا کے بعد دوسرے جسم کو یہ ذمہ داری نبھانی ہوتی ہے۔ چراغ سے چراغ اس طرح جلتا چلا جاتا ہے اس میں نہ کوئی فرق والی بات ہے نہ بڑے چھوٹے کی بات۔ ایک ہی توحید میں ہو کر کہیں اس چراغ کی بتی کو اپنے وجود سے وہ تیل دیا جا سکتا ہے جس کے ذریعہ یہ چراغ روشن رہے جب تک عشق میں فنا ہو ہو کر اپنے وجود کی ہر صفت تک کو فنا کرنے کی حالت نصیب نہیں ہوتی اس نور کو نہ پا سکتے ہیں نہ چراغ روشن رکھ سکتے ہیں۔ جب تک عشق کی آگ کو بھڑکا بھڑکا کر اور تیز نہیں کر دیا جاتا۔ یہ آگ روشنی نہیں بنتی۔ آخر اس روشنی کو بھی آگ ہی کا احسان ملتا ہے تو روشنی بننے کے قابل ہوتی ہے۔ یہ خوش نصیبی تھی کہ قبلہ نے بار بار ناگپور اور قادر نگر حاضری دے دے کر نہ صرف بابا تاج الدینؒ اور بابا قادر اولیاءؒ کے مشن کو سمجھنے کی کوشش کی بلکہ برسوں کی کاوش اور مرشد کے احسان سے اس کو اپنا کر، اپنا حقِ بندگی بھی ادا کیا لوگ بندگی کو سطحی معنی دے کر بڑی سادگی سے اس بندگی کی حقیقت کو بھول جاتے ہیں۔ عبد ہونا آسان نہیں اس بندگی کے عروج میں بھی رمز در رمز اور اس کے نزول میں بھی گنج ہائے گرانمایہ ہیں۔ پھر عُبید جو نامِ گرامی ہے اس کے معنی تو ایک چھوٹا سا عبد کے ہیں۔ اتنا چھوٹا کہ اپنے کو ہر ایک کی جوتیوں کی خاک سمجھے۔ مگر اتنا کون جھکتا ہے جو اپنی جوتیوں کی خاک تلے اس عُبید کے رمز کو پائے۔ حق ہے سہ جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔

انسان کیا اس کی بساط کیا۔ یہ عبدیت۔ یہ بندگی یہ غلامی۔ احسان ہی ہے مرشد کا۔ بغیر دستِ کرم کے کون اس منزل میں ثابت قدم رہ سکتا ہے جب سب کچھ قدموں میں ڈال

دیا گیا ہو۔ جب پوری کی پوری امانت جو سلسلہ در سلسلہ پہنچی ہو سپرد کر دی گئی ہو۔ جب انفاس اور آفاق دونوں کی شہنشاہیت عطا کر دی گئی ہو اور پھر بھی مرشد کے قدموں سے سر نہ اٹھ رہا ہو۔ تب صحیح بندگی ہے۔ یہ عشق کی بھی معراج ہے کہ سب کچھ عطاؤں کے بعد بھی وہی طوقِ غلامی ؎ مقام بندگی دے کر نہ لوں شانِ خداوندی

جمعہ ۲۷ جنوری ۱۹۶۱ء کو قبلہ کے مرشد بابا قادر اولیاؒ کا دزیانگرم (جنوبی ہند) میں انتقال ہوا۔ ادھر قبلہ کچھ دن قبل مشرقی پاکستان میں تھے۔ مرشد کے پاس جانے کے لئے تڑپ رہے تھے۔ فرماتے ہیں ادھر جاتا تو گڑبڑ پڑ جاتی وہی حال کہ ؎

گوری سوئی سیج پہ مکھ پر ڈارے کیس
چل خسرو گھر آپنے سانجھ بھئی چو دیس

حکم کے تحت رکنا پڑا۔ سرتابی کی کہاں مجال۔ قہرِ درویش برجانِ درویش۔ آنکھیں فرطِ غم سے سرخ ہو گئیں۔ بالکل خون سے لبریز ایسی کہ قبلہ سے نظر ملانے کی کسی میں مجال نہ تھی ؎ سچی پیت کنول بھئی جل سوکھے جل جائے۔ اسی حالت میں پاکستان لوٹے اور چند دن بعد جب باباجان کے وصال کی خبر آئی تو یہاں پہلے ہی سے یہ حالت طاری تھی کہ جیسے کالے ناگ نے کاٹ لیا ہو۔ پندرہ دن موت کی سی غشی۔ ایک سینما سا بلکہ اس سے بھی تیز آنکھوں کے آگے سے گزر رہا تھا۔ ادھر لشاور میں ساتھیوں کی مختصر سی جماعت نے غائبانہ نماز جنازہ ادا کی۔ ضیاء جعفریؒ مرحوم نے امامت کی۔ ان کا فرمانا ہے کہ باباجان ساتھ ہی کھڑے تھے پاؤں میں لرزہ سا آ گیا گرا جاتا تھا مشکل سے ہی نماز ادا کرائی معتقدوں میں سے بھی تائید ہوئی کہ باباجان موجود تھے تو ہم یہ سوچتے تھے کہ یہ نماز کیسے ہو گی۔ قبلہ کا فرمانا ہے کہ اس نماز کے بعد سے بدلی سی کھلی۔ اب معلوم

ہوا کہ میں ہی رانجھا۔ میرا ہی وصال ہوا ہے۔ اب کالا ناگ کاٹ لے تو پھر کسی ناگ کے کاٹے کا اثر نہیں ہوتا۔ موت تو در جاناں کا نام ہے۔ ان کے لئے جن کو ایک جھروکی مل چکی ہو۔ ایک بڑا کارخانہ چل رہا ہو مشینیں چل رہی ہوں۔ روشنی ہو پھر یکایک بجلی بند ہو جائے تو گھپ اندھیرا۔ پھر دوسرا سوئچ آن کر دیا جائے تو وہی ظہور کی روشنی وہی کُن فیکون۔ مشیت اپنا عمل کرتی رہتی ہے۔ یہ خود بخود ہوتا ہے بس اللہ اللہ کرتے جائیں الماری میں کتابیں ہوتی ہیں وہ بھرنا ہوتی ہیں۔ یہ شریعتِ دین کو جو ظاہر باطن کا خول دے کر پردہ کر رکھا ہے اس کو توڑنا ہوتا ہے۔ یہ درود وظائف ننگِ فقر ہیں۔ عاشق کا مقام دوسرا ہے۔ محبت کو ان چیزوں کی کیا ضرورت۔ اصلِ ایمان محبت ہے۔ نبی کریمؐ سے محبت ان کی امت سے محبت کی حالت میں ادا ہو سکتی ہے۔ اسلام کی نشاطِ ثانیہ کا زمانہ قریب ہے۔ اسی جانب فقر کا رجوع ہے۔ پاکستان سے چاٹگام تک سارے علاقہ میں اسلام کی حیات ہونی ہے۔

باب ۲ دو بتی ایک لو

ذاتِ حق جلال، جمال کا توحیدی، تجریدی انداز۔ عشق اور حُسن کی یکتائیتِ وحدت مرد مظہرِ عقلِ کُل، عورت مظہرِ نفسِ کُل۔ دونوں یکتائیتیں ایک توازن میں قائم ہوں تو توحید کو قیام، وجودِ انسانی میں عطا ہو۔ یہ دونوں حقیقتیں زوجین ہیں، ضدین ہیں۔ ان متضاد صلاحیتوں کے وجود سے عالمِ امکان میں بھی یکتائیت کا رنگ ہے۔ مرد آسمان ہے تو عورت زمین۔ زمین اپنی طرف کھینچتی ہے کشش رکھتی ہے تو آسمان میں بھی وسعتیں ہیں، پھیلاؤ ہے۔ عورت کی فطری جاذبیت، اصلہا ثابت" بن کر مرد کو اڑنے سے روکے رکھتی ہے۔ بندگی کے رشتہ سے باندھے رکھتی ہے۔ حوّا کی تخلیق آدمؑ کی پسلی سے ہوتی ہے۔ ربوبیت کا پہلو بن کر نسل کی بھی ضامن بنیں اور قیامِ حقیقت کی بھی۔ جب طالبِ حق کا سینہ عشق سے سمندر ہو جائے تو اس کو ایک کنارہ ایک زمین عطا ہوتی ہے عشق کی جمیعت کی جو اس کو اپنی آغوش میں لے لیتی ہے۔ دوئی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ایک نورِ حقیقت بنا ہے تو دوسرا ربوبیت کا مقام حاصل کئے ہے اور دونوں صلاحیتوں کے امتزاج سے شجر مبارک کا انداز قائم ہوتا ہے۔ اسی طرح انفرادی نشو و نما اور عظمت کی پرورش میں عورت کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یا یوں کہہ لیں دو بتی ایک لو بن کر دونوں حقیقتیں ایک ہی توحید میں منسلک ہوتی ہیں۔

۱۹۳۶ء میں جب قبلہ کی عمر ۲۹ سال کی تھی تو پہلی شادی علی گڑھ میں ایک ایسے خاندان میں ہوئی جن سے تعلیمی زندگی میں برسوں سے واقفیت تھی۔ یہ محترمہ

حسین الدین صاحب سپرنٹنڈنٹ پوسٹ آفسز کی دختر قمر النساء بیگم جن کی اس وقت تقریباً اٹھارہ سال کی عمر ہوگی۔ یہ تعلیم منزل میں رہائش پذیر تھیں جو ان کے والد محترم کی جائداد تھی۔ اس جگہ کا نام تعلیم منزل غالباً اس مناسبت سے رکھا گیا تھا کہ یہاں مختلف طلباء اور طالبات معہ اپنے خاندانوں کے رہائش اختیار کرتے اور یونیورسٹی یا گرلز کالج میں تعلیم پاتے۔ ان خاندانوں میں سے کچھ تو وہیں مستقل قیام پذیر ہوگئے اور کچھ فارغ التحصیل ہو کر چلے جاتے تو ان کی جگہ دوسرے لوگ سکونت اختیار کرتے۔ تعلیم منزل کے ایک گوشہ میں مسجد بھی تھی اور یہ سب علاقہ ایک خصوصی ماحول بن گیا جس میں ایک با اخلاق معاشرہ پروان چڑھ رہا تھا۔ اور یہی کچھ قبلہ کو اس خاندان سے قریب تر لانے کا باعث بنا۔ اس اخلاق، رواداری، خدمتِ خلق کے ماحول میں روحانی فروغ کارفرما تھا جو پاک روحوں کو ایک دوسرے کے لئے جاذب نظر بنا دیتا ہے۔ قمر النساء بیگم کم عمری میں ہی۔ وارداتِ قلب و روح، تلاشِ حقیقت کی باتوں میں فطری دلچسپی لیتیں۔ ان کو بھی یہ تفکر ہوتا کہ میں کون ہوں، کیا ہوں، حق کیا ہے۔ حقیقت سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ حُسنِ باطن نکھرا تو اس کا ظل جسدِ خاکی پر پڑا۔ اپنی منزل کی راہ اسی راہرو کے ساتھ چلنے کی ٹھانی۔ مگر اس دنیاوی ماحول میں یوں رفیقِ راہ پا لینا آسان نہیں ہوا کرتا۔ معاشرہ اخلاق، خاندان، تہذیب، اقتصادیات اور ایسی ہزاروں رکاوٹوں کو عبور کرنا آسان نہیں ہوا کرتا۔ ابھی قبلہ کی بھی تعلیمی زندگی کا زمانہ تھا ادھر طلبِ روحانی نے عشق کی صورت اختیار کی۔ فصل بڑھنا شروع ہوا۔ کیسی ملاقات، کیسا ملنا جلنا۔ دیدار بھی ایک حجاب عشق کے ظہور کے ساتھ ساتھ پاک روحوں کو تو اور پردوں میں ہو جانا ہوتا ہے۔ اب وہی تنہائیاں، وہی شب بیداری، وہی صحرا نوردی۔ کئی برس اس ہیجانی کیفیت میں گزرے

جسم وجان کی حد سے پرے روح میں حیاتِ عشق لئے ہو تو جسم کیسے مرے۔ اسی اندرونی آگ کو لے کر جب بابا تاج الدینؒ کی خدمت میں پہلی بار ناگپور پہنچے تو بابا صاحب اس وقت گھوڑے پر سوار تھے۔ پہلے ہی دیدار میں پیکرِ حُسن کا وہ جلوہ بابا صاحب نے دکھایا کہ اب قبلہ نے حُسنِ حقیقت کو جسم کے سراپا کے محدود دائرے سے پرے لازمان و لامکان کی وسعتوں میں پا لیا۔ تاج الدینؒ کا رنگ چڑھنا شروع ہوا۔ مدراس سے علی گڑھ آتے جاتے ناگپور اتر کر بابا صاحب کو حاضری دینا لازمی سا امر بن گیا۔ پھر وہ بھی دن آیا جب بابا صاحب نے کمر پر مکّے مارے اور دو ڈھائی سال قبلہ پر جذب کی کیفیت طاری رہنے لگی۔ عشق نے اس جذب کے عالم میں اپنی مکانی زنجیروں کو توڑ کر لامکان میں منزل پائی۔ پھر جب بابا صاحب کی شفقت سے یہ جذب کا پردہ اٹھا ہوش وحواس کی دنیا میں واپسی ہوئی تو پھر سے تعلیمی سلسلہ جاری ہوا اور ولایت جا کر شیفیلڈ سے انجینئرنگ کی ڈگری حاصل کی۔ واپسی پر جب علی گڑھ آئے اور یونیورسٹی میں کام شروع کیا تو قمر النساء بیگم سے شادی ہو گئی۔ مگر یہ ساتھ صرف ڈیڑھ دو سال رہا۔ ایک فرزند تولد ہوئے جن کا نام اجمیری نسبت سے معین احمد رکھا گیا۔ اس زچگی کے بعد ہی سے قمر النساء بیگم پلنگ سے نہ اٹھ سکیں۔ ان کی اسی بیماری کے زمانہ کی بات ہے کہ باہر کے کمرے میں قبلہ ایک رندِ منش سے باتیں کر رہے تھے اس نے قبلہ کو ایک واقعہ سنایا کہ اسے ایک مجذوبہ ملی جس نے پوچھا "ہے"۔ وہ سمجھا کہ خدا کا پوچھتی ہے۔ کہا۔ ہوگا۔ مجذوبہ نے پھر پوچھا "ہے" تو اس نے جواب دیا ہونا تو چاہئے وگرنہ یہ سارا دھندا کیسا۔ اُس مجذوبہ نے پھر پوچھا "ہے" تو اب اُس رندمنش اور مجذوبہ پر "ہے" کی واردات طاری ہوئی اور وہ پکار اٹھا ہے ہے ہے اور مجذوبہ اور یہ رندمنش دونوں ہے ہے ہے۔ ہا ہا ہا کرنے لگے۔ اور لطف یہ کہ قبلہ کو جب یہ واقعہ سنایا جا رہا تھا تو

قبلہ اور یہ رند دونوں ہے ہے ہے ہاہاہا کی کیفیت میں آگئے اور بیمار قمر النساء بھی ساتھ میں اس "ہے" کی واردات سے گزر گئیں۔ انہوں نے قبلہ کو بتایا کہ آپ اتنے عرصہ سے مجھے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے مگر آج مجھ پر اس حقیقت کا انکشاف ہوا۔ قمر النساء بیگم ہوش سے پرے، بیماری کی بنا پر اس نحیف و نڈھال جسم کے بندھنوں سے آزاد ہوجانے کی بنا پر، لطافتوں سے ہمکنار ہوئیں اور "ہے" کی واردات سے گزریں۔ جسم و عقل کے بندھنوں سے اس لمحی آزادی ہی میں انسان روح کی وارداتِ وحدت الوجود سے ہمکنار ہوتا ہے۔ اب قمر النساء بیگم کی روحانی زندگی نے وسعتیں پائیں تو جسم و جان کے بندھن ڈھیلے پڑنے شروع ہوئے۔ بیماری نے طول پکڑا۔ مسز نیوس کے ہسپتال میں منتقل کی گئیں مگر علاج معالجہ سے افاقہ نہ ہوا۔ حیات نے ساتھ نہ دیا۔ صرف ڈیڑھ دو سال کے ازدواجی رشتہ میں بندھ کر عین جوانی کی عمر میں ۱۹۳۶ء میں راہیٔ ملکِ بقا ہوئیں اور اپنے پیچھے ایک تڑپتی روح چھوڑ گئیں۔ ایک جلتی ہوئی شمع سوزاں جس کی روشنی کا تو نظارہ خلقت کرتی رہی مگر اس سوز تک نہ پہنچ سکی جو اس شمع کے سینہ میں جاں گزیں تھا۔ قمر النساء بیگم کے انتقال سے جو صدمہ قبلہ کو پہنچا۔ وہ ظاہر بیں آنکھیں بھی برابر دیکھتی رہیں۔ اس واقعہ کے بعد نہ قبلہ میں وہ شگفتگی رہی نہ وہ زندگی کا اٹھان۔ جیسے حیات کے چشمے ہمیشہ کے لئے خشک ہوگئے ہوں۔ عام انسانی نگاہوں میں ایک مجنونانہ سی کیفیت ہوگئی۔ انتقال کے بعد تین دن تک کمرہ میں بند رہے۔ نہ کھانا نہ پینا۔ سگرٹوں پر سگرٹیں۔ حالانکہ اس سے پہلے سگرٹ بالکل نہ پیتے تھے۔ اب اس فراق کے بعد وہی ازلی تنہائیاں۔ ایک غمِ پنہاں۔ اسے کون دیکھتا۔ اندر کا حال کون پائے۔ یہ غم آہستہ آہستہ قلب و روح میں رِستا رہا۔ جسم کو فنا تھی مگر یہاں خفائیں، بقا کے سوتے تھے۔ جسم و جان کے

سب رشتے ٹوٹ ٹوٹ کر لازمان لامکان میں اپنی روح کو گھمائے پھرتے تھے۔ پھر جس پر حق کی نظر پڑ چکی ہو جو اپنے ہی لئے منتخب کر لیا گیا ہو اس کے اور حق کے درمیان کے سب رابطے ٹوٹ ٹوٹ کر ایک ہی حقیقت میں منسلک ہونا شروع ہو جاتے ہیں۔ اب یہ غمِ عشق، ایک غمِ جہان بن کر پھیلتا ہے۔ اس غم کے ردِّ عمل میں زندگی کو ایک نئی کشادگی ملتی ہے۔ ہر مریض، ہر دُکھی انسانیت، ہر معصوم چہرے، ہر شگفتہ روح کے آگے یہ اپنے محبوب کو عشق کا نذرانہ پیش کرتا ہے۔ ایک نیا ہیجان زندگی میں اٹھا ہوتا ہے جیسے بُجھتی ہوئی شمع کا دھواں۔ آفاق میں پرواز۔ ایک بگولا، ایک ہیولی۔ اب ایک نہ بُجھنے والی شدتِ عمل کاروبارِ جہان میں بھی رونما ہوتی ہے اور طلبِ حق میں بھی۔ الغرض قبلہ کی تمام آئندہ زندگی اسی حقیقت کی تابندگی ہے۔ انہوں نے ہر لطافتِ حُسن میں اپنے شوق کا درماں تلاش کیا۔ ہر تپشِ شوق میں اپنے عشق کا مداوا پایا۔ اس تازہ، معصوم، حسین روپ کے تصوّر کو کچھ اس طرح حقیقت بنایا کہ ہر گُل، ہر خوشبو میں اسی ایک حقیقت کی جلوہ آرائی دیکھی۔ جب جانکنی کا عالم تھا، کہتی تھیں کسی نے اپنی زُلفوں میں ڈھانپ لیا ہے کیسی مبارک تھی یہ رخصت، کیسی ابدی ہے یہ مُشکِ لیسین (صلی اللہ علیہ وسلّم)

ہم بھیس میں بُلبل کے ہر شاخ پہ چہکیں گے ؎
تم بُوئے وفا بن کر ہر گُل میں رہا کرنا

اس طرح یہ باب، قمر النساء بیگم کی رحلت کے بعد بند ہو جانے کی بجائے اور کشادہ ہوا ہے۔ شدتیں اور امنڈ پڑی ہیں۔ پہلے ایک منزل تھی اب ایک منزل ہزار منزل۔ پہلے ایک دل تھا اب ایک دل ہزار دل۔ ہر دُکھے دل میں اسے پایا اور اس کے ردِ عمل میں ہر دُکھے دل والے نے قبلہ کی ذات میں اپنی منزلِ طلب کو پایا۔

الغرض آنے والے چند برسوں تک قبلہ کی جسمانی، قلبی، روحانی زندگی اسی طرح
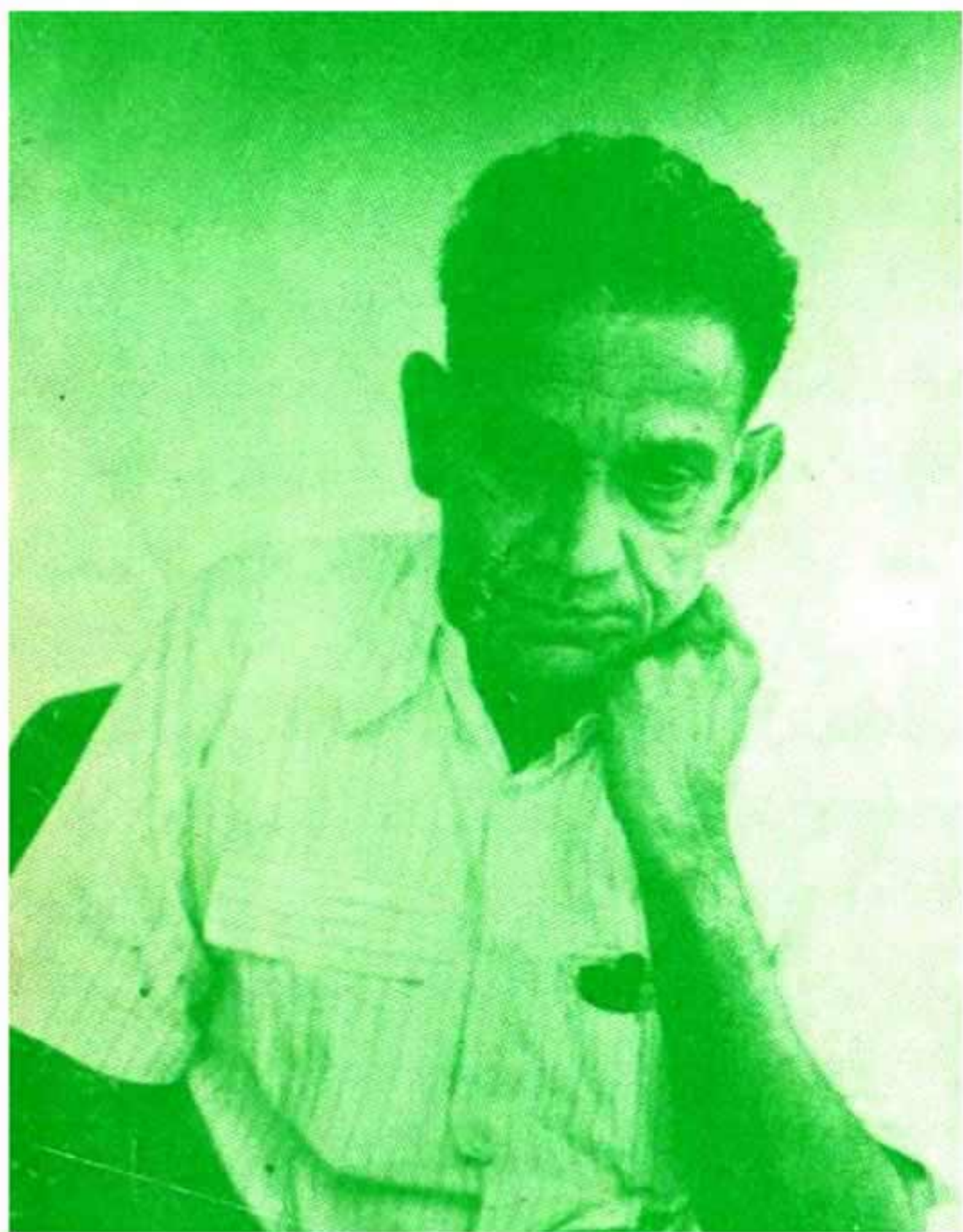
اے زِخیالِ مابروں بر تو خیال کے رسد
بحرمتِ ذاتِ پاکِ تو عشقِ بلال رضؓ کے رسد

وسعتوں میں پھیل رہی تھی اور ادھر صیادِ ازل نے اس تڑپتے ہوئے نخچیر کو اپنے جال میں پھر سے پھنسا لیا ۔ ان حالتوں میں سے کوئی گزر کر دیکھے تو اسے معلوم ہوگا کہ ازدواجی زندگی کیسی کٹھن، کیسی روح فرسا، کیسی زنجیر ہوتی ہے جس کو نبھانا، لوہے کے چنے چبانے، تنور کی آگ میں جلنے سے کم نہیں پھر بھی کارِ مرداں یہی ہے کہ ہر آتش زار کو گلزار بنا دیں۔ ہر خشک کھیتی کو رحمت کے بادلوں سے شاداب کرتے ہوئے گزر جائیں ۔ قبلہ کی بڑی ہمشیرہ مطہر النساء بیگم اب بجائے ماں کے تھیں ۔ قبلہ کی حالت سے دلگیر ہو کر اور خاندانی ذمہ داریوں کے پیش نظر انہوں نے اپنے جیٹھ شیخ امام صاحب کی لڑکی امام زہرہ خاتون سے قبلہ کی دوسری شادی کرادی۔ ادھر ننھے معین احمد کی پرورش کا بھی سوال تھا جن کی دیکھ بھال قمر النساء بیگم کی والدہ کے ذمہ ہوئی ۔ یہ محترمہ حُسنِ اخلاق کا پیکر تھیں اور جگت باجی کہلاتی تھیں ۔ محبت و شفقت کے لحاظ سے ہیرا تھیں ۔ یہ ۱۹۱۱ء کا زمانہ تھا اور قمر النساء بیگم کے انتقال کو صرف تین سال ہوئے تھے ۔ ادھر اپنا یہ حال کہ زندگی کا سرو سامان جیسے لُٹ گیا ہو۔ دوسری طرف نوجوان ماں کی جگہ ۔خاندان کی عزت کا بوجھ اٹھانا ایک فرضِ انسانیت ادا کرنا۔ مگر غایت نظر سے دیکھا جائے تو ایک طائر لاہوتی کو جس کی پرواز فضاؤں میں ہو اس طرح پابندِ سلاسل کر دیا جائے تو یہ بات خود ایک سانحہ سے کم نہیں ۔ قبلہ نے پھر بھی بیگم امام زہرہ خاتون کے ساتھ اچھی طرح زندگی نبھائی ۔ خاندانی روایات اور عظمتوں کو آنچ نہ آنے دی ۔ حقِ بشریت کے تحت جو ممکن العمل خدمت تھی وہ ادا کی ۔ محبت کا اندازہ بھی نبھایا ۔ اولادیں بھی ہوئیں ۔ علی گڑھ کی ملازمت کے دوران ، معہ بیوی بچوں کے بنگالی کوٹھی میں مقیم رہے اور کالج کے کاموں میں بھی کوئی دلچسپی میں کمی نہ آنے دی ۔ درونِ خانہ اور باہر کبھی کسی کو یہ احساس نہ ہونے دیا

کہ جو بات پہلے تھی اس میں کسی طرح کی کمی ہے۔ وہی انجمنیں، وہی محفلیں، وہی خاکساری تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا۔ کالج کے بنانے میں ہمہ تن مشغول رہنا۔ نہ صرف کالج کے لئے سامان مہیا کرنے کی فکر کرتے رہنا بلکہ کالج سے ایک خصوصی جذبہ دلا کر انجینئروں کا فارغ التحصیل کرا کر خدمتِ خلق کے لئے پھیلا دینا۔

۱۹۴۵ء میں جو کمر کی ہڈی میں چوٹ آئی تھی۔ اس پر اور مزید دوبارہ دہلی میں تانگہ کی سواری میں چوٹ لگی جس سے کمر کی ہڈی کے تین مُہرے گل گئے۔ صاحب فراش ہوئے اور وطن بھیج دیئے گئے۔ ۱۹۴۸ء میں بابا قادر اولیاء کے پاس دنیا نگرم اسی بیماری کی حالت میں اسٹریچر پر لے جائے گئے اور صحت یاب ہو کر پھر سے علی گڑھ آ کر کچھ عرصہ ملازمت کی۔ پھر جب ۱۹۵۰ء میں بابا قادر اولیاء کے حکم کے تحت پاکستان آنا ہوا تو بیگم امام زہرہ خاتون معہ بچوں کے ہندوستان ہی رہ گئیں۔ اُدھر رشتہ داری کا سوال اور مستقل نقل وطن کرنا ممکن نہ تھا۔ وہ اپنی مجبوریوں کو سمیٹ کر صبر و شکر سے اُدھر ــــ رہیں اور بالآخر وہیں انتقال کیا اور ادھر قبلہ کو مرشد کے حکم پر توکل بر اللہ پاکستان کا رخ کرنا پڑا۔ فقراء کو حکم کے تحت یہ قدم لازماً اٹھانا ہوتا ہے۔ ان کی زندگی کا اولین مقصد خدمتِ خلق اور تعمیر ملت ہوتا ہے۔ اب پھر سے سمندر کا کنارے سے ساتھ چھوٹا۔ زمین کی آغوش سے محروم ہوا۔ مرد ذات کے لئے عورت ذات ہی کنارہ کی آغوش بنتی ہے۔ مگر جب پانی کو زمین کی آغوش نصیب نہیں ہوتی تو ہوا کی آغوش میں ابرِ رحمت بن کر پھر سے بلند پہاڑوں کی جانب رخ کرتا ہے۔ بیگم امام زہرہ خاتون کی بھی بلند اخلاقی اور حسنِ فہم قابل تعریف ہے کہ انہوں نے قبلہ کے اس عزم میں روڑے نہیں اٹکائے اور نہ ہی کسی قسم کا شکوہ شکایت اس وقت یا بعد میں کیا۔ انہیں یہ یقین تھا کہ مرشد

کے حکم کے تحت قبلہ کو جو کام سپرد ہوا ہے وہ انہیں بہرحال انجام دینا ہے۔ ان کا یہ صبر ہی راہ حق میں ان کے سہارے کا ضامن بن جائے گا۔

پاکستان آنے کے بعد جب ۱۹۵۵ء میں پشاور یونیورسٹی میں ملازمت پکڑی تو ایک ہفتہ قبل بی بی قمر النساء مرحومہ کی چھوٹی ہمشیرہ اختر النساء صاحبہ سے شادی کر لی۔ معین احمد کی آگے کی تعلیم کی خاطر بھی گھر بار بنانے کی ضرورت تھی۔ اختر النساء صاحبہ بھی ایک میجر سے پہلی شادی کے بعد بیوگی کے دن گزار رہی تھیں نہ صرف ایک دوسرے کا خاندان بلکہ باجی اختر النساء صاحبہ اور قبلہ ایک دوسرے کو قریبی طور سے برسوں سے جانتے تھے معین احمد کی پرورش بھی باجی صاحبہ نے اپنی والدہ باجی صاحبہ کے ساتھ مل کر اس شفقت سے کی تھی کہ کم ہی لڑکیاں ایسا کر سکتی ہیں۔ اپنی ناکتخدائی کے زمانہ میں جب ننھے معین احمد کو چیچک کا عارضہ ہو گیا تو گھنٹوں اپنے سینہ سے لگا کر تسلی دیتی رہتیں اور اپنی فکر اس خطرناک مرض میں بھی نہ کرتیں۔ ایک یہی کیا کم احسان تھا جس کے شکرانہ میں یہ تیسری شادی ان موجودہ حالات کے تحت ہونا ضروری تھی۔ پھر اس شادی سے سمندر کو ایک کنارہ نصیب ہوا۔ اس شادی کے بعد دو معصوم، پاک اور قسمت والی روحوں کا عالمِ وجود میں آنا بھی تو مقرر تھا۔ چنانچہ اس شادی کے بعد دو بچے حبیب احمد اور محمودہ سلطانہ تولد ہوئے۔ مگر ظاہر سے قطع نظر باطن پر نگاہ ڈالی جائے تو رحمتوں کو وجودی شکل میں نازل ہونے کی جو ازلی بیتابی ہے اسے آغوش ملتی ہے۔ راہروِ منزلِ حق کو ساتھی ملتا ہے۔ پھر مثبت قطب منفی قطب کی توحید میں توحیدِ کلی نصیب ہوتی ہے جو اس راہ کے لئے ضروری ہے۔

اب قبلہ کا یہ زمانہ فقیری کی بساط پر مسند نشین ہونے کا بھی تھا۔ جس مقصدِ حیات کی تکمیل کے لئے فقیر کا ظہور ہوتا ہے اس کا حصول اس جسم و جاں، عقل و ہوش، عزیز و اقارب

تلاشِ روزگار، خدمت خلق کے بندھنوں میں رہتے ہوئے بھی کرنا ہوتا ہے۔ دست بکار دل بہ یار ایک شعارِ زندگی ہوتا ہے۔ نصب العین وہی فروغِ امت۔ طریقۂ کار وہی دردِ امت۔ اس مشن میں، اس حق کی راہ میں خویش اقارب، دوست احباب، اپنے پرائے، کتنی اعانت کرتے ہیں یہ قسمتوں کی بات ہے فقیر مسند ولایت پر ایک کھلی کتاب بن کر پیش ہوتا ہے اور رحمت اللعالمینی وسیلہ سے ایک رحمتِ عام بن کر خلق میں پیش ہوتا ہے اس حالت میں نہ وہ اپنوں کا ہوتا ہے نہ دوست احباب کا۔ نہ اعزا اور اقربا کا۔ ہوتا ہے تو بس امت کا۔ اس کی زندگی امت کے لئے وقف ہوتی ہے۔ یہی اس کی بنیادِ دین، یہی اس کی بساطِ ولایت۔ بار بار موتوں، درجہ بدرجہ فنا کے بعد اس کو بقائے محمدی نصیب ہوتی ہے اور ساتھ ہی وہ ان شدتوں میں اپنے ساتھ سب کو ان ہی رحمتوں کے بگولوں میں اوپر اٹھانے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ بائی صاحبہ کی فطری فراست اور صلاحیت کو دیکھ کر قبلہ نے انہیں بھی اپنے ہی ساتھ فقر کی منزلوں پر اٹھانے کا حق ادا کیا۔ قمر نے اب اختر ہی میں تو جلوہ گری کی تھی۔ بائی صاحبہ نے بھی شادی کی منظوری اور میدانِ فقر میں ساتھ دینے سے قبل یہ دریافت ضرور کیا تھا کہ آپ نے فقیری لے کر کیا پایا تو جواب میں قبلہ نے مٹی کا ایک ڈھیلا ہاتھ میں اٹھا کر دکھایا جو سونے کا ٹکڑا بن گیا تھا پھر اسے پھینکتے ہوئے کہا تھا کہ ہم ایسی فقیری کو ایک طرف پھینکتے ہیں اور تمہیں بھی فقر کی منازل میں ساتھ ہی ساتھ چلانے کی کوشش کا وعدہ کرتے ہیں۔ اس ضمن میں قبلہ کے چند خطوط سے اقتباسات درج ذیل ہیں:-

یہ خطوط قبلہ نے بائی صاحبہ کو اس زمانے میں لکھے تھے جب وہ جہاں گشتی کے لئے بیرونِ ممالک ۶ ماہ کے سفر پر نکلے تھے اور اس سے قبل جب وہ باباجان کے دربار قادر نگر جنوبی ہند میں تھے۔

"عشق میں خودداری، خودی، وہ انا، جو حق کی متحمل ہوتی ہے اس قدر جاگ جاتی ہے اور محیط ہو جاتی ہے کہ کوئی دوسرا نظر میں جچتا ہی نہیں عاشق و محبوب کی پیوستہ شدہ روح ایک ہوتی ہے اور توحید کی علمبردار۔ فٹن کا ایک گھوڑا تیز ہو جائے تو دوسرا بھی خود بخود تیز ہو جاتا ہے ورنہ فٹن راستہ طے کرنے کی بجائے گول چکر کاٹنے لگتی ہے۔

ہر چیز کا وقت مُعیّن ہے۔ دعا سے البتہ وقت بھی بدل سکتا ہے کیونکہ جس نے وقت کو خود بنایا ہے وہ اسے بدل بھی سکتا ہے تو بس دعا ہے کہ اے میرے محسنِ مطلق تیرے کرم و احسان کے میں صدقے۔ بندہ اگر بے چین ہے تو تُو ہی اسے چین دے یا وقت کو بدل کر یا دل کو سکون دے کر۔ اور دل کا سکون ایسا کہ درد کا حد سے گزرنا ہے دوا ہو جانا۔

محبت مرکز مانگتی ہے باباجان نے ایک سمندر ریلا دیا۔ اس سمندر کی ساحل تم ہو۔ مجاز اور حقیقت کا سوال نہیں۔ دونوں ایک ہیں۔ یہ ازلی اور ابدی جذبہ ہے باقی معمول کے واقعات سب پر رہے ہیں۔ باباجان خوب تربیت دے رہے ہیں کہ مُردہ جسم میں کس طرح جان ڈالی جاتی ہے۔ کس طرح راکھ میں سے شعلۂ جوالہ پیدا کیا جاتا ہے اور صحرا سے چشمے کیسے پھوٹ سکتے ہیں۔ باباجان کی شان انشاءاللہ میں تم میں دیکھوں گا اور تم اپنے آپ میں۔ عشق کی قدر کیسی کرنی چاہیئے جو ترتیب باباجان دے رہے ہیں اس کی تفصیل سنو گی تو حیران ہو گی صرف وقت بتائے گا کہ میرے یہاں آنے میں کیا کچھ ہے۔ تمہارے لئے، میرے لئے، ہمارے لئے، سب کے لئے۔ یہ سب نقش ہیں۔

جب رازِ حقیقت معلوم ہو جائے تو کوئی عجیب بات بھی نہیں اور وہ یہ کہ ہر منزل پر کنارہ بن کر تم ملتی ہو۔ ۱۹۴۰ء میں ایک کنارہ سے چلا۔ اکیس سال ہو گئے۔ سمندر کا ایک ہی

کنارہ ہوتا ہے۔ سمندر پار کرنے کے بعد بھی وہی کنارہ گھوم کر دوسری طرف ملتا ہے یہ تخیل یا شاعری نہیں۔ ٹھوس حقیقت بیان کر رہا ہوں۔ سنا ہے کنارہ سمندر کو اپنے آغوش میں لیتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ سمندر محیط ہے یا کنارہ۔

ایک مجذوب نے باباجان کے دربار میں کہا، شمع اگر ہاتھ میں ہو تو بھی کیا۔ لَو ہاتھ نہیں آسکتی۔ اپنی بتی کو اس تیل میں ڈال دیں اور روشن بتی کی طرف کھسک کھسک کر قرب حاصل کریں۔ جب مل جائیں تو بتی دو ہوں گی مگر لو ایک۔ یہ بات کس کس جوڑے کے نصیب میں ہوتی ہے۔ قسمت کی بات ہے۔ تم بھی خوش قسمت ہو اور وہ بھی خوش قسمت ہیں۔ بس قسمتوں کے ملنے کی بات ہے۔

انسان جو خدا کو تلاش کرتا ہے تو حقیقت میں اپنے آپ کو ہی تلاش کرتا ہے۔ میرا اپنا آپ تم میں مظہر ہے۔ ذاتِ پاک جو باباجان میں نہاں اور عیاں ہے ان کے طفیل ہم باطن میں اور ظاہر میں حقیقتاً ایک لو اور دو بتی ہو جائیں اور تمہیں روح کی وہ ساری لطافتیں اور لذتیں اس جیون میں نصیب ہوں۔

قرآن میں ہے کہ عورت تمہاری زمین ہے۔ اس کا مقصد غلط سمجھا جاتا ہے۔ جب طالب حق کا سینہ عشق کو سینچ سینچ کر سمندر ہو جاتا ہے تو اس کو ایک کنارہ عطا ہوتا ہے آخر سمندر کی تہہ میں بھی تو زمین ہی ہے۔ یعنی زمین سمندر کو اپنی گود میں لئے ہوئے ہے یعنی کنارہ محیط ہے اور زمین کی آغوش میں سمندر ہے۔ مرد ہمیشہ بے ٹھکانہ ہوتا ہے اس کا ٹھکانا، اس کی وسعت، اس کا تعین، عورت کی ذات ہے۔ یہاں عورت سے مطلب عورت کا عشق ہے یہ سمندر کیا ہوتا ہے۔ یہ پانی کیا چیز ہے۔ جب پیرِ کامل ذکرِ خفی کے ذریعہ روح الامین کو سینچنا سکھاتے ہیں تو سینہ سمندر ہو جاتا ہے۔ یہ

باتیں میں تم کو سمجھاؤں گا ہی نہیں بلکہ بابا کی شان سے لبھاؤں گا۔ انشاء اللہ۔

روحانیت کے راستے کے چار مراتب ہیں۔ شریعت، طریقت، حقیقت، معرفت۔ معرفت، عرفان کیا ہے یہ چکھنے کی چیز ہے۔ جب مجنوں نے انا لیلیٰ کہا تو لیلیٰ کا عرفان ہو گیا۔ اس سے قبل علم ہو سکتا ہے، پہچان ہو سکتی ہے۔ مگر عرفان جب ہوتا ہے جب دوئی مٹ جائے تم ٹھیک کہتی ہو، تم ایک لانبی تیز تلوار سے گزر رہی ہو کسی عاشق سے پوچھو پل صراط کس کو کہتے ہیں۔ ہاں ڈرتے ہی رہنا چاہیئے۔ زُعم بھی کرے ناز بھی کرے مگر ڈرتا ہی رہے۔ لیلیٰ (روح) بھی شاید چلنے لگی، مبارک ہو۔ واقعی تم بہت خوش نصیب ہو۔ یہ حالت تو بیس بیس سال بھی جھاڑ جھونکنے کے بعد مشکل سے ہی حاصل ہوتی ہے۔

نفلیں کسی سنت یا کمائی کے لئے ہوتی ہیں۔ نبیؐ کریم صلی اللہ علیہ وسلم احسانات کے شکرانہ میں نفل پڑھتے تھے۔ شکر کے سجدے بے گنتی ہوتے ہیں۔ جب دل شاکر ہو تو انسان ہمہ دل شاکر جس کا اظہار خدمت خلق سے ہوتا ہے۔ خدمت بہت بڑا سجدہ ہے۔

شدت کے لئے نصب العین قطعی کلی تعیّن کے ساتھ ضروری ہے۔ شدت قُرب کی صفت ہے۔ خواہش کی شدت ناکافی ہے۔ ہجر میں مُردہ شدت ہے اِسی لئے قلندر کی ایک سانس عابد کی ایک سال کی عبادت سے بہتر ہے! ہر عارف کی نیند عابد کی عبادت سے زیادہ وقعت رکھتی ہے۔ اصل شدت باطن کی اس وقت ہے جب بے نیازی ہو جیسے کُن فیکون سے پہلے۔ (یہ اُدھر سے اللہ کی نظر سے دیکھنے سے بات پیدا ہوتی ہے) عشقِ کامل میں شدت ہو سکتی ہے۔ مگر کس کے نصیب میں۔ اسی

کے لئے کہا ہے کہ مومن ہوا سے بھی زیادہ شدید ہے۔ شدتِ ذکر، اشدُّ ذکراً بعد کی بات ہے سب سے بڑا شرک یہ ہے کہ اللہ کی دین اور رحمت میں اپنی اہلیت یا حق سمجھتے ہیں کہ ملتا ہے۔ یہ ایسا ہے جیسا کہ دودھ میں مینگنی ڈال دیں ستیاناس ہوجاتا ہے۔ اسی لئے کہا ہے کہ سب گناہ معاف ہیں سوائے شرک کے۔

قرب کی نشانی یہ نہیں کہ جو چاہے ہو جائے۔ یہ تو کرم کی وجہ سے ہے۔ کرامات تو صرف فیض سے ہو سکتی ہے۔ قرب بُو بہ گلاب اندر والی بات ہے۔ قُرب کی نشانی ہے جب آنسو سوکھ جائیں۔ پشاور میں ایسا مانس بابا کو دیکھا۔ یہ جو آنسو بہتے ہیں گنگا جمنا کی طرح، بغیر وجہ یہ لایحزنون والی بات ہے۔ اُو درمن و من درو سے زیادہ حق معلوم ہوتا ہے۔ یہ بعد کی بات ہے۔ یہ رحمت سے ہوتی ہے۔ رحمت کی قدر اس وقت ہی ہو سکتی ہے۔ بُو بہ گلاب اندر والی دوئی بھی نہ رہے۔

تصوّر ایمان کی جِلا ہے۔ یقین اگر چند لیک میں ہو جائے تو چودھویں صدی میں کامیابی ہے۔ کیونکہ فقراء کا یقین مقدر ہو جاتا ہے۔ سُن کر ہی کسی چیز کا یقین کر لیں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ یہ یقین اتنی مثبت چیز ہے کہ زندگی کی زندگی اس سے بھری ہوئی ہے۔ بسم اللہ کا اذن نہ ہونے سے اٹکے ہیں۔ اسمِ اعظم کے متعلق دفتر کے دفتر لکھے ہیں مگر عارفین جو زندگی کا نچوڑ دیتے ہیں وہ یہی بسم اللہ ہے قلب و روح اس کی جان اس کے معنی پکڑ لیں تب بات ہے۔ یہی اسم اعظم ہے۔ یہ کُن فیکون سے پہلے کی سی بات ہے۔ ایک فرد سوچ ہی نہیں سکتا، یہ اجتماعیت کی بات ہے۔ اجتماعیت ہی سے زمانہ نے فائدہ اٹھایا ہے۔

"میں ذکر ہو جاؤں" یہ توحید کی طرف سعود ہے۔ "ذکر میں کھو جاؤں" اسی کا

نام فنا فی اللہ ہے ۔ اللہ ایک ہے ۔ اللہ اسم ۔ پیر جسم ۔ یہی طریقہ سب سے افضل ہے بغیر کسی سے سننے کے انسان خود منزلیں طے کرتا چلے ۔ یہ سب خلوت کے ساتھ ذکر کی برکات ہیں لوگوں کو ذکر تو مل جاتا ہے مگر اسے اپناتے نہیں ۔ مبارک ہو صد مبارک ۔

امامت کا راز یہ ہے کہ امامت وہی کرتا ہے جو دل میں لبا ہے اور مالک ہے عبید اللہ نہیں صرف اللہ ۔ انسان کی کشتی جوانی کی طرف چل رہی ہو، خواہ ضعیف ہی ہو کیونکہ جنت میں جوان ہی جائیں گے ۔ دل جوان ہو یعنی محبت کی خوشبو ہو تو کافی ہے ۔ اگر توحید کو پالے تو دل کے ساتھ سارے قویٰ جوان ہو جاتے ہیں ۔

محبت ایک روشنی ہے ایک خوشبو ہے اس کے نشر میں کوئی روکاوٹ نہیں البتہ اس کے جذب کرنے میں ہم خود آپ اپنا پردہ ہو جاتے ہیں جیسے اللہ کی رحمت ہر وقت موجود ہے مگر ہمارے حجابات مانع ہوتے ہیں ۔ محبت میں فرق نہیں آتا صرف اس کے شعور میں آسکتا ہے یہ قول فیصل ہے اگر مجسم ذکر ہو جائے ۔ اس خیال کو بغیر اپنے کو دھوکہ دیئے ذہن نشین کر لو کہ میرا باطن بابا ہے تو تم مجسم ذکر ہو جاؤ گی ۔ یہ خوش نصیبی کسی اور کی ہو نہیں سکتی ۔ یہ کچھ بی بی عائشہ والی بات ہے اگر تم اس کو پا سکو ۔

اللہ تعالیٰ تم کو قرب عطا کرے ۔ قُرب منزل بہ منزل ہوتا ہے معلوم نہیں ہم کس منزل پر ہیں ۔ تم خدا کی محبت اور انسان کی محبت کو دو علٰحدہ چیزیں سمجھتی ہو ۔ جب تک سر نہ کٹاؤ یہ تشکوک کبھی پیچھا نہیں چھوڑتے ۔ امام غزالی کا یہی حال تھا ۔ مولانا روم شمس تبریز کے طفیل تشکوک کی دلدل سے پار نکل گئے ۔

حضورؐ کا فرمان ہے اگر تم شکر کرو تو اللہ اور دے گا ۔ اگر شکایت کرو گے تو جو ہے سو بھی نہ رہے گا ۔ جب یہ رحیم کارسازہ محبت کا منبع ہے تو شکایت کس سے کریں

میں اپنی لانبی بیماری کو سچے دل سے احسان دیکھتا ہوں اور مانتا ہوں۔ جو جو احسانات اس کے ہیں کیا کیا ہم ان کو گن سکتے ہیں۔ یہ نفس ہے جو دودھ میں مینگنی ڈالتا ہے یہ بھی اس کے کرم سے مطیع ہو جاتا ہے۔ بس اللہ اللہ کرو۔ اسی ذکر میں ضم ہو جاؤ اور سب باتیں خود بخود سلجھ جاتی ہیں۔ آزما کر دیکھو۔ یہ خیالی بات نہیں ہے۔

تمہارے متعلق تحت الشعور میں، جو میری آرزو ہے اس کو پورا ہوتے ہوئے دیکھ کر آنسو گنگا جمنا کی طرح بہہ رہے تھے۔ ڈائری، دماغ سے متعلق کوئی چیز نہیں۔ دل سے ہے۔ حیات قادر قلب کے مقام سے لکھی گئی ہے۔ روح کی واردات ہیں۔ قرآن بھی قلوب پر اتارا گیا تھا۔ قلب جب متحمل ہوتا ہے تو رمز کو خود پاتا ہے وہ آہنی دیوار قلب اور دماغ کے مابین تم عبور کر گئی ہو۔ مالک کی مدد سے۔ خدا کرے قیام بھی عطا ہو سبحان اللہ پتہ پتہ ذکر کر رہا ہے یہ حالت مجھ پر بابا تاج الدینؒ کے تصرف سے تھی۔ ایسا لگتا تھا کہ اب پھٹا سچ ہے چلنے میں بھی وقت لگتا ہے۔ بھسم ہونا، زمان مکان سے ماورا ہے۔ اللہ اللہ دو تجی ایک لو۔ تم فکر نہ کرنا۔ روح زمان مکان کی پابند نہیں ہے۔ وہ جو توجہ دیتا ہے ہر اونچ نیچ سے واقف ہوتا ہے۔

تیج بو دیا گیا۔ ذکر کے پانی سے سیراب کرو۔ اس کو رحمت کی دھوپ ملتی رہے گی۔ مالی کو اپنے پودے سے بڑی محبت ہے۔ عشق ہے۔ وہ بے خبر نہیں ہوتا۔ جب پودا درخت ہو جائے اور پھل دینے لگے تو طاہرہ کی طرح تم کو بھی ابا یا اماں جی یا پیر من، خضر من ہادئ من پکارنے لگیں گے۔ گھر کا تنکا تنکا اور اینٹ اینٹ کو خود یہ خود ذاکر بننا چاہیے باباجان نے جہاں گشتی کا طوق پہنایا ہے۔ وہ مشن پورا ہو۔

تمہاری پریشانی کی یہ وجہ ہو سکتی ہے کہ جب بیج زمین میں دبا دیا جاتا ہے اور

جب بارش ہوتی ہے تو بیج پھول کر پھٹتا ہے اور اس میں سے کلّا نکلتا ہے۔ ذکر کا بیج تمہارے بطنِ روح میں دبا رہا۔ توجہ اور کچھ نہیں صرف اللہ کے فضل اور رحمت کو ایک آئینہ رخ دے کر کسی پر ڈالتا ہے۔ اس فضل کی گرمی سے کلّا یعنی روح پھوٹ نکلتی ہے جب یہ کلا درخت ہو جائے تب یہ کہتا ہے "انا روحی"، یہ ہے مُوتو قبل انت موتو۔ بڑی تکلیف ہوتی ہے۔ زندہ سکرات ہے۔ یہی ہے کلمۂ لا الٰہ الا اللہ کی معرفت۔ سارے اِلا ہی میں بھسم ہو جاتے ہیں اور صرف اللہ ہی اللہ رہ جاتا ہے۔ زبان سے پڑھنا کچھ نہیں بابا جان کہتے ہیں فقیر کلمہ پڑھتا نہیں ہو جاتا ہے۔

"یہ ساری دنیا میرے سینہ میں سما سکتی ہے۔ یہ احساس ثبوت ہے کہ روح کی زندگی مل گئی۔ اللہ مبارک کرے قیام عطا فرمائے۔ بہت سے اچھے لوگ جو بزرگ کہلاتے ہیں ان کو روح کی زندگی کی بھنک بھی نہیں لگی۔ ایسی بات پر تو مطلوب صاحب لوٹ گئے ہیں۔ یہ بابا جان کا کمال ہے کہ آج کل کی مادہ پرست دنیا میں بچوں کی سی سادگی کے ساتھ وہ ساری منازل طے کرا دیتے ہیں۔

عشق ذات سے ہوتا ہے۔ ذات غیب میں ہے۔ صفات ایک کھڑکی ہے جس کے ذریعہ انسان دیکھ سکتا ہے مگر پہنچ نہیں سکتا اگر عبید اللہ میں اللہ کی صفات ہیں تو اللہ سے عشق ہے۔ اگر حضورؐ کی صفات ہیں تو حضورؐ سے عشق ہے۔ سبحان اللہ۔ کتنے گہرے اور پکے جذبات ہیں۔ عشق صرف اللہ سے ہوتا ہے عُبید کوئی چیز نہیں۔ باقی فنا فی الرسولؐ، فنا فی الشیخ منازل ہیں آئینہ داری کے۔ اب تو آئینہ کی پیار کر لو گی۔ جب قلب پاک ہو جاتا ہے تو پھر یہ آئینہ اور وہ آئینہ کا امتیاز بھی اٹھ جاتا ہے۔ اپنا ہی آئینہ شیخ بھی ہے اور رسولؐ بھی اور اللہ بھی۔ من عرف نفسہٗ فقد عرف ربہٗ۔ یہ بڑی کڑوی شراب ہے

ابھی وقت ہے اللہ کے فضل سے وہ دن بھی دور نہیں جب رُوح پکار اٹھے گی۔ انا الحق انا الحق۔ کوئی ڈر نہیں۔ پشت پہ ہاتھ ہے۔

نبوت وصل کی تفسیر ہے۔ یہ ہجر کا رونا کیا۔ وصل کا جو فروغ، جو زندگی، جو جوشِ عمل اور انہماکِ کار ہے۔ جو بھی خوشی اور روشنی ہے یہ ہی سچا اسلام ہے۔ کیا گناہوں سے توبہ، کیا نا اہلیت کا شکوہ۔ اس کی رحمت کے نور سے پُرشاداں انسان چلا جاتا ہے۔ یہ ہی بابا جان کا بنیادی مشن ہے۔ انسان کو اپنے روح میں قیام دلوا کر اسلام کے اس اصل رمز سے دنیا کو واقف کریں۔ چودھویں صدی کے بعد تاریخ اسلام کو جو ورق لوٹنا ہے یہی ہے۔ اس کے لئے نہ علم کی ضرورت ہے نہ ریاضت کی۔ صرف عشق کے بوتے اس کے کرم سے وہ آہنی دیوار پار کر جائے تو بس سب روشن۔ یہ کام باطن سے ہوتے ہیں ظاہر سے ان کا تعلق نہیں۔

فقر کے میدان میں انسان قدم ہی جب رکھتا ہے جب اس کا سر کٹ چکا ہوتا ہے۔ وہ شہید اکبر ہوتا ہے۔ اس کی ابتداء روح سے ہوتی ہے۔ شہید کبھی نہیں مرتا اور کس بات کی شہادت دیتا ہے۔ اشھد ان لا الہٰ الا اللہ جس کے معنے ہیں میں نہیں تو ہی تو ہے۔ سب سے بڑا الٰہ تعین ہے۔ ہر وقت ہر دم، شعور میں، تحت الشعور میں اس کا ذکر، اس کا فکر۔ یہ عمل ہے کلمۂ طیب کا۔ اس رمز کو کوئی کیا جانے۔ اپنی فنا اس کی بقا۔ راستہ، ذکر، اس کی فکر، کتنا آسان راستہ ہے۔ نہ نفس سے جہاد ہے نہ ماسوا سے غرض۔ سیدھا سادا ذکر، ذکر، ذکر۔ پانی کے قطروں سے بھی پتھر کٹ جاتے ہیں۔ اسی طرح اس معصوم ذکر سے سارے جسم کی کثافتیں کٹ جاتی ہیں۔ ذکر کو دودھاری تلوار کہتے ہیں۔ ایک طرف ظلمتوں کو مٹاتا ہے۔ دوسری طرف

نور سے پُر کرتا ہے۔ دیدار کیا چیز ہے۔ روح کی غذا۔ اس باطنی بھوک کی غذا۔ وصل کیا چیز ہے۔ وہ تو ایک نُو۔ جس نے ذکر کی اہمیت کو پالیا اس کا بیڑا پار ہے۔ ہمارے ساتھیوں میں سے بہت کم نے ذکر کی اہمیت کو پایا ہے۔

کم از کم ایک سفر، سمندری جہاز کا تو ہم جب چلیں گے مزدور کر لیں گے۔ یہ بہت پُر کیف ہوتا ہے۔ مثال غالباً سات آسمان طے کر کے غیب تک پہنچنے کی ہی صحیح ہوگی۔ جب انسان ہوش کے ساتھ چلے تو سفر کی مشکلات کے ساتھ سفر کی کیفیت سے بھی محظوظ ہوتا ہے اور منزل کی قدر بھی کرتا ہے۔ جذب میں چلے تو کسی منزل پر آن کر اٹک جاتا ہے یا کوئی ٹھوکر لگائے تو ہوائی جہاز کی طرح ٹھپ سے آگے کی منزل پر ہوتا ہے۔ کیا طے کیا اس کا کچھ پتہ نہیں ہوتا۔ اسی لئے بابا جان روحانی سفر کو سمندری جہاز کے سفر سے تشبیہ دیتے ہیں۔ زندگی بھی وقت کے دھارے پر ایک سفر ہے۔ بھلا کیا لطف آئے جو افیون کھا کر یا ایک خیالوں کی زندگی میں یہ سفر طے کر لے۔ دراصل عمل سے زندگی کا لطف ہے اور عمل کا اسٹیم یا بجلی عشق ہے۔ بے عشق کے، عمل ایک ملمع یا دھوکہ ہے۔

یہ جو نکتہ ہے، ابتدا میں "میں" کا نکتہ ہوتا ہے۔ ہر خیال، ہر عمل کا مرکز، اپنی خودی یا نفس ہوتا ہے۔ جب اس میں "میں" کی جگہ "تو" کا نکتہ لگ جائے تو وہ بسم اللہ کا نکتہ ہو جاتا ہے۔ ذکر سے متعلق زیادہ فکر نہ کرنا چاہئے۔ جب دماغ کسی بھی انہماک میں ہو جیسے پڑھنے میں یا کسی سوچ میں تو لازم ہے کہ ذکر کا احساس نہ ہو۔ مگر جب وقفہ طے تو پھر اللہ اللہ جیسے کوئی ربڑ کی ڈوری ہو اس کا ایک سرا بندھا ہوا اور ایک سرا ہاتھ میں لے کر جتنا چاہو کھینچو اور ادھر ادھر گھماؤ اور جب چھوڑ دو تو اپنی اصلی حالت پر۔ صرف احتیاط اتنی کریں کہ ذکر میں سو جائیں اور جب آنکھ ذکر کے ساتھ کھلے تو یہ ثبوت ہے کہ سوتے میں بھی جاری

تھا اور یہ کہ قلب جاری ہے اور جب رات کو خواب کی حالت میں خصوصاً جب کوئی ڈر لگے یا کوئی اچھی بات ہو اور خواب میں بھی اس وقت ذکر ہو رہا ہو تو یہ پہچان ہے کہ ذکر روح میں اتر گیا۔ اور اگر خواب میں بھی ذکر کا ایسا ہی شعور ہو جیسا کہ جاگتے میں تو پھر یہ نشانی ہے کہ ذکر روح میں قائم ہو گیا۔ جب ایسا ہو جائے تو سوائے پیر کے حکم کے اور کوئی طاقت اس کو چھین نہیں سکتی۔

قلب کے ذکر کو، ذکر خفی کہتے ہیں۔ یہ اپنے سے بھی خفی میں ہوتا ہے اور جب اس کا شعور بھی ہو تو خفی و جلی ہوتا ہے۔ جلی ذکر کا کوئی خاص اہمیت نہیں۔ یہ عام ذکر ہے اور رچتا نہیں ہے۔ خفی ذکر پہلے تو مذکور کے رنگ میں رنگ دیتا ہے اور جب روح میں قائم ہو جائے تو دوئی مٹ جاتی ہے اور انا لیلیٰ کہنا شروع کر دیتا ہے۔ انسان "پتہ نہیں" کے مقام کو اس وقت عبور کرتا ہے جب غیب پر فتح پا لے۔ یہ عطا ہے۔ اپنی کوشش کچھ نہیں۔ نہ اس میں وقت کا سوال ہے نہ قسمت کا۔ یار کی موج کی بات ہے۔ جب ٹھوکر لگائی پار ہو گئے۔ میں کوئی نجومی نہیں کر رہا ہوں۔ یار کو منانے کے ڈھنگ کچھ نہیں آتے۔ وہ نیاز جو تھی یار کو منانے کی بات تھی۔

جن محسوسات سے تم گزر رہی ہو ان سے صرف کوئی کوئی خوش قسمت گزرتا ہے میری ارتقاء تقریباً ایسی ہی ہوئی تھی۔ مگر عموماً لوگ بیل کے بیل ہی رہتے ہیں۔ آسا خود ہے کہ پردہ ہٹتے یعنی مرنے کے بعد پھر سارا معاملہ ٹھیک ہو جاتا ہے۔

جب دل کی کلی کھلتی ہے تو ہر شخص ناچتا ہے۔ یہ کیفیت زندگی میں صرف تین بار ہوتی ہے۔ نوعمری میں جب پہلے پہلے عشق گدگداتا ہے۔ دوسرے جب پیر کی نظر کرم ہوتی ہے۔ تیسرے شہادت پر یا مومن کی موت کے وقت۔

دیکھنا کسے کہتے ہیں یہ ایک بہت اونچے مقام کی بات ہے بڑا طویل معاملہ ہے لقا کسے کہتے ہیں - مازاغ البصر کیا ہے - اُف میں کیسے بتاؤں - موسیٰ تیسرے آسمان کے باسی ہیں - گو کلیم اللہؑ ہیں مگر دماغ سے کام لیتے تھے - عیسیٰؑ چوتھے آسمان کے ہیں یعنی قلب کے مقام کے شہنشاہ - رسول کریمؐ ساتویں آسمان کو پار کر گئے اور ہم غلام ہیں ان کے - مالک کے ساتھ ہم بھی وہیں ہوں گے -

تم مجید ہو چکی ہو اور حضور عزیز سے عزیز - سبحان اللہ - یہ کفر نہیں بلکہ اسلامی توحید ہے - "پتہ نہیں کیا چاہتی ہو" - یہ بالکل سچ ہے جو کہتے ہیں یہ چاہتا ہوں وہ چاہتا ہوں یہ سب سنی سنائی باتیں ہیں - حقیقت تو چکھنے کی بات ہے اور جب چکھ چکے تو پھر اور کیا ہے - نہ بابا جان نے پوچھا نہ خیال میں آیا کہ میں چاہتا کیا ہوں - ایک لگن تھی اور ہے اور بس - اس کا نہ آگا نہ پیچھا" - قبلہ نے یوں حق رفاقت ادا کیا - راہرو منزل حق کو ساتھ ہی لیا - بائی صاحبہ نے بھی حق زوجیت اچھی طرح ادا کیا - اصلہا ثابتؐ بن کر مضبوطی سے شجرطیبہ کو تھامے رکھا ورنہ فرعہا فی السماء کی شدت قلندرانہ میں کس کے پاؤں زمین پر تھمتے ہیں - عروج کے بعد مقام عبدیت کس کس کو نصیب ہوتا ہے - جب تک بائی صاحبہ کی صحت نے ساتھ دیا روزانہ قبلہ کے ناسور کی مرہم پٹی اپنے ہی ذمہ رکھی - غذا ، آرام کی سختی سے دیکھ بھال رکھی انہیں قبلہ کے جسم کے شکستہ ہونے کا حال معلوم تھا اس لئے دوست احباب کی ان کوششوں کو حتی المقدور روکے رکھا جس کے تحت وہ قبلہ کو مختلف محفلوں میں شرکت کرانے کے لئے لگے رہتے تھے - ان پابندیوں سے قبلہ کی بیقرار طبیعت اور جہاں گشتی کی عادت میں رکاوٹ تو ضرور پڑی مگر قبلہ کی صحت کی دیکھ بھال ہوتی رہی - پھر اب کئی سالوں سے بائی صاحبہ کے صاحب فراش ہو جانے سے سب ہی کے

دل دکھے۔ گھر کی وہ چہل پہل وہ رونق۔ وہ باجی صاحبہ کی ہر ایک میں دلبستگی کے مواقع ختم ہوئے پھر بھی اپنی بساط سے زیادہ اپنے بیماری کے بستر سے بھی ہر ایک کو دعائیں بھی دیں اور شفقت کی نظر رکھی۔ قبلہ نے بھی اس طویل صبر آزما دور میں یہ تکلیف باجی کے ساتھ ساتھ خود بھی کاٹی۔ منزلِ مختصر بس یہ جسم کا پنجرہ جیتے جی ہی اتارنا پڑتا ہے۔ صدیوں کے نسلی خون کی پاکی اور طہارت کی جاتی ہے۔ یہ چالیس دن والے چلّوں تک کی بات نہیں ہوتی جتنے اعلیٰ مقامات میں پرواز اتنی ہی کثافتوں سے صفائی کرانا ضروری ہوتی ہے جو منزل قمرالنساء نے ایک حد تک اپنی کم عمری میں پار کر لی اور ان کی بیماری نے اس کا ذریعہ پیدا کیا۔ اسی قسم یا اس سے بلند منزل کی جانب اب اختر النساء بیگم کا سفر بھی ہو رہا ہے۔ جن فضاؤں میں اب قبلہ کی پرواز ہے وہاں اور شدتیں ہیں اور اس زمانہ سے کہیں زیادہ بڑا جب قمرالنساء بیگم کا ساتھ تھا۔ جن انوار سے اس وقت باجی صاحبہ کا گزر ہے اس کی جھلکیاں کبھی کبھی ان کی ہی زبان سے بے ساختگی میں نکل جاتی ہیں۔ یہ عالم برزخ کی کیفیات ہیں جن کی فہم اس شعور اور ادراک سے پرے ہے۔ اسی لئے بظاہر یہ ایک مبالغہ سا معلوم ہوتی ہیں۔ مگر یہ حقیقت سے قریب تر ہیں۔ یوں بھی جب عقل و ہوش و ادراک اور جسم و جان کے بندھن ڈھیلے پڑھنے شروع ہو جاتے ہیں تو نورِ باطن چمک اٹھتا ہے اور حقیقت سے روشناسی ہو رہی ہوتی ہے۔ موتو قبل انت موتو کی منزل پار ہو کر، روح کو قیام ابدی نصیب ہوتا ہے۔ یہ مقام حیرت ہے۔ نسبتِ محمدی اور قربِ حق کے نشاط دوام میں حیات ابدی ہے۔

باجی صاحبہ کی اس برسوں کی بیماری سے قبلہ کی صحت پر بھی اثر پڑا ہے۔ اول تو اب اس دردِ دل سے کوئی قبلہ کی دیکھ بھال نہیں کر سکتا اور پھر ادب کا پہلو خدمت پر عمل

پیدا ہونے میں حائل رہتا ہے کس کی ہمت اور کس کی مجال جو قبلہ کو ان کے درد کا درماں بننے کے لئے اپنی پیشکش کرے یا دوادارو، علاج معالجہ، دیکھ بھال کرانے پر مجبور کرے۔ قبلہ نے بھی بائی کی تکلیف کے غم کو بہت کچھ اپنے پر لیا ہے۔ پشاور سے باہر آنا جانا برسوں سے بند ہے۔ زیادہ تر وقت بائی کے ساتھ کمرے میں گزارنے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ دلجوئی میں کمی نہ ہو اور بائی صاحبہ تنہائی محسوس نہ کریں۔ مگر قبلہ کو دیکھا جائے تو جیسے شاہباز فضائے اعلیٰ کے بال و پر ترش گئے ہوں۔ بزرگوں کے ساتھ وہ محفلیں وہ مزارات کی حاضری۔ مقامات کی سیر تقریباً بالکل بند ہے صبر و وفا کی تصویر بن کر اپنی اس جسمانی حالت اور بائی صاحبہ کی اس طویل بیماری میں بھی وہ حق ادا کیا ہے کہ اچھے اچھے فقرا اس منزل میں رہ گئے۔ حق زوجیت سے کہیں ہزاروں گنا زائد بائی صاحبہ کی دل بستگی کی ہے۔ حالانکہ فقر میں کیسی پابندی۔ فقیر کے آگے غیر اللہ کی گنجائش کہاں۔ سب کچھ بھسم ہو کر رہ جاتا ہے۔ الفقر ہو اللہ۔ فقر کی اس شان جلالی کو بھی قبلہ نے اپنی ہی ذات میں جذب کر لیا ہے۔ اس کی تفسیر نہ قلم سے بیان ہو سکتی ہے نہ الفاظ اس کی تشریح کی تاب لا سکتے ہیں۔ تخیل ہی میں کوئی اس حالت سے گزر کر دیکھے۔ چند سال نہ سہی چند گھنٹے ہی سہی۔ ایک طرف نفس کل کی نارِ نمرود ہے دوسری طرف رحمتِ کُل کے گلزار ابھی ایک طرف عورت جہنم کا ایندھن کہلائی تو دوسری طرف عورت، خوشبو، نماز، قرۃ العین آنکھوں کی ٹھنڈک معراج المومنین۔ قاب قوسین۔ عکسِ رُخسار۔ گویا ؎

عشقِ مجنوں نیست ایں کارِ من است
حُسنِ لیلیٰ عکسِ رخسارِ من است

باٹ پشاور

بشارتوں کے ذریعہ شیخ کے حکم سے ہندوستان سے پاکستان کے لئے روانہ ہوئے۔ زمانہ اب بھی پُرآشوب تھا۔ سفر خطرے سے خالی نہ تھا۔ لانبی بیماری اور قادرنگر وجیانگرم (ہند) کے طویل قیام کے دوران داڑھی، مونچھیں، سر کے بال ایک نیم مدہوشی اور مجذوبانہ سی حالت میں بے ہنگام طور پر بڑھ گئے تھے۔ ریل میں بیٹھے۔ راستے میں جو سنگھی ڈبہ جھانک کر آ بیٹھے۔ پہلے تو اندازہ لگاتے رہے کہ یہ کونسی قوم کا شخص ہے پھر چھیڑ چھاڑ شروع کی۔ مسلمانوں کو بُرا بھلا کہنا شروع کیا۔ اس سے کام نہ بنا تو نبی کریمؐ کی شان میں گستاخی کی۔ اس پر قبلہ کا خون کھول پڑا۔ اب تک ضبط کیا۔ اب قابو سے باہر ہوا چاہا کہ پھٹ پڑیں کہ باباجان کا ہاتھ کاندھے پر محسوس کیا۔ سختی سے فرمایا خبردار، صبر۔ قبلہ نے گردن جھکادی۔ ان لوگوں نے جب قبلہ کو ٹس سے مس ہوتے نہ دیکھا تو جھنجلا کر کہا، اچھا تم کوئی بھی ہو، تلوار کھینچ لی، کہا کہ گردن اڑاتے ہیں۔ قبلہ نے کہا جو تمہاری مرضی۔ مگر ایک بات سُن لو۔ کھڑے ہو گئے۔ الفاظ دریا کی طرح رواں ہوئے۔ ان ہی کی کتابوں کے حوالے سے احترامِ انسانیت، مقامِ آدمیت، خدمت و مقامِ فقیر، کی باتیں بتائیں۔ پھر فیضِ اولیائے کرامِ ہند۔ مقامِ اولیاء، مقامِ مرسلین، مقامِ اوتار، مقامِ ختم المرسلین سمجھایا۔ اس پر وہ لوگ قدموں میں گر پڑے کہ ہم سے بھول ہوئی۔ معافی مانگی۔ ڈبہ سے اتر گئے اور گارڈ اور ٹکٹ کلکٹروں کو ہدایت کی کہ یہ شخص بھگت ہے۔ اسے حفاظت سے سرحد پار پہنچاؤ۔

ہندوستان و پاکستان کی جب سرحد پار کر رہے تھے تو پاسپورٹ پھینک دیا
چوکی کے افسروں نے پاسپورٹ کا پوچھا تو جواب دیا کہ بانیانِ پاکستان کو پاکستان آنے
کے لئے پاسپورٹ کی کیا ضرورت ہے اور جہاں تک میرا تعلق ہے۔ ٹیلیفون کر کے
لیاقت علی خان یا کسی دوسرے بڑے رہنما سے پوچھ لیجئے کہ میں کون ہوں۔ لیاقت علیخان
کو جب اطلاع ملی تو انہوں نے ٹیلیفون پر کہا کہ اسے آنے دیجئے۔ اس مہاپاکستانی
کو پاکستان میں داخل ہونے سے کون روک سکتا ہے۔

کراچی کچھ عرصہ مقیم رہے۔ اس کے بعد پشاور کی راہ لی جہاں کی بابت مرشد کا
ارشاد ہوا تھا۔ یہاں یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر رضی الدین صدیقی سے علی گڑھ
کے زمانہ سے صاحب سلامت تھی۔ انہیں قبلہ کی اس جدوجہد کا حال معلوم تھا جو انہوں
نے انجینئرنگ کالج کے لئے علی گڑھ میں کی تھی۔ مگر افسوس کیا کہ الیکٹریکل انجینئرنگ
کا پروفیسر ایک جرمن ہے جو جرمنی چھٹی پر گیا ہے۔ قبلہ کی پشاور کی جائے قیام اور کراچی
کا پتہ دریافت کر لیا کہ آئندہ کوئی موقع ہوا تو بلا لیں گے پھر دوسرے ہی دن شام کے
وقت قبلہ کی قیامگاہ پشاور پہنچے اور کہا کہ بھائی خوش قسمت ہو۔ اُس جرمن کا تار آ گیا ہے
کہ نہیں آرہا۔ کل انٹرویو کے لئے آجاؤ۔ قبلہ کی اس وقت یہ حالت تھی کہ وہی بے ہنگام
سر، داڑھی اور مونچھوں کے بال بڑھے ہوئے تھے۔ سفر کے دوران شیروانی اور پاجامہ
بھی میلا ہو چکا تھا۔ غرض اسی حالت میں انٹرویو میں پہنچے۔ دوسروں نے تو بات نہ کرنا
چاہی۔ مگر ایک امریکن اسپیشلسٹ انٹرویو بورڈ میں تھا اس نے مضمون سے متعلق
متعدد سوالات کئے اور مطمئن ہو کر قائل بھی ہوا کہ اس بظاہر میلے کچیلے حُلیے والے کے
پیچھے واقعی کارآمد شخصیت ہے۔ پھر تنخواہ کی بات چیت آئی۔ قبلہ سے دریافت کیا گیا کہ

علی گڑھ میں کتنی ملتی تھی - قبلہ نے فرمایا معلوم نہیں - اصرار کیا گیا تو بھی معذرت چاہی
کہ تنخواہ کا جو کچھ ملتا تھا وہ لفافہ میں اپنے گھر میں دے دیتا تھا - اس پر ایک صاحب نے
کہا مجھے دنیا میں وہ شخص دیکھنا ہے جو تنخواہ میں دلچسپی نہ رکھتا ہو - اس پر قبلہ اپنی کرسی
سے کھڑے ہو گئے اور کہا کہ وہ شخص آپ کے سامنے کھڑا ہے - سنبھالئے اپنی ملازمت
اور یہ کہہ کر باہر نکل گئے سیدھے جائے قیام پہنچے اور تانگہ میں بیٹھ کر اسٹیشن چل دیئے
ڈاکٹر صدیقی، کار میں نکلے - جائے قیام پر دیکھا - بالآخر ریل کے ڈبہ میں قبلہ کو تلاش
کر لیا - اور کہا کہ تم فضول خفا ہو گئے - لو، واپس اترو تمہارا اسلیکشن ہو گیا ہے -
اس پر قبلہ نے کچھ عرصہ کے لئے مہلت چاہی کہ حلیہ ٹھیک کر کے - کپڑے وغیرہ بنوا کر آ
جاؤں گا - دو ماہ بعد ستمبر ۱۹۵۴ء میں قبلہ اپنے داڑھی مونچھ کے بال صاف کرا کے -
بال ترشوا کر، عام پڑھے لکھے لوگوں کا سا لباس پہن کر لیتا ورز پہنچے اور انجینئرنگ
کالج کی ملازمت اختیار کر لی - الیکٹریکل انجینئرنگ کے پروفیسر مقرر ہوئے اور بالآخر
اسی کالج کے ایکٹنگ پرنسپل مقرر ہوئے اور پندرہ سال سروس کے دوران ایکٹنگ
ہی رہے جس کی کبھی پرواہ نہ کی پرنسپل شپ کے عہدہ کو قبول کرنے سے دو باتوں کے
تحت معذوری ظاہر کی ایک یہ کہ اکاؤنٹس کے جھنجھٹ میں پڑنے دوسرے کسی کو سخت
سست کہنے کی فطری عادت نہیں تو اس پر اس وقت کے وائس چانسلر رضی الدین صاحب
نے کہا تھا کہ یہ ذمہ داری میں اٹھاؤں گا - قبلہ نے اس پرنسپل شپ سے کئی بار مستعفی
بھی ہونا چاہا مگر یونیورسٹی کسی نہ کسی طرح یہ ذمہ داری قبلہ کو ہی سونپتی رہی - کئی بار یونیورسٹی
نے کوئی پرنسپل مقرر کرنا چاہا مگر ایک نہ ایک صورت ایسی ہوئی کہ کوئی صاحب اس جگہ مستقل
طور سے نہ آ سکے - قبلہ کے لئے مقصدِ ملازمت نہ اقتدار کی تلاش تھی نہ ترقی روزگار و معاش

لی۔ یہ تو ایک عطا کے طور پر مل چکا تھا۔ اس عطا کی قدر وہی جان سکتا ہے جو اپنی ساری زندگی کسی کے حوالے کر کے پھر اس کے کرم و احسان پر زندگی گزار رہا ہو اور یوں بھی جو طلب و آرزو سے گزرا اس کی ہر آرزو پوری کی جاتی ہے وہی جذبۂ خدمت خلق جو زندگی کی روشنی بن چکا تھا۔ صبح سے شام تک قبلہ کے ہر عمل و کردار سے نمایاں تھا۔ انجینیرنگ کالج کے لئے قیمتی ساز و سامان، ولایت سے زرِ کثیر صرف کر کے یونیورسٹی نہ منگوا سکی تو اسکی ضرورت بھی کیا تھی۔ وہی علی گڑھ والا سلسلہ، پرانے یا کباڑ کے سامان سے کالج کی ضرورت کی مشینری بنا لینا یہاں بھی جاری ہوا۔ وہی انہماکِ کار۔ وہی پُرخلوص دلچسپی انجینیرنگ کالج کے اسٹور کے چپہ چپہ سے واقفیت۔ کباڑیوں کی دکانوں پر مستقل چکر لگانا اور پھر ضرورت کے لحاظ سے پہلے سے منصوبہ بندی کر کے آلات اور مشینوں کا اکٹھا کیا جانا ایک مرغوب شغل تھا۔ پرانے سامان اور پرزوں سے مشینوں کی مرمت کا سلسلہ تمام دورانِ ملازمت جاری رہا۔ پشاور کے امریکن بیس سے اور اس کے علاوہ امریکن ایڈ کے تحت بہت کچھ سامان کالج کے لئے حاصل کیا جاتا رہا۔ جس سے آئندہ برسوں تک کالج کی ضرورتیں پوری ہوئیں پھر ایک جہاں گشتی کے زمانہ میں مختلف بیرونی ممالک خصوصاً امریکہ کے فلاحی اداروں سے ایسے ایسے قیمتی آلات اور مشینیں مفت حاصل کی گئیں، جو پاکستان حکومت کے دفاعی اداروں کے بھی جنگ ۶۵ء کے آڑے وقت میں کام آئیں۔ انجینیرنگ کالج بھی رفتہ رفتہ ایک قابل قدر ادارے میں تبدیل ہو گیا۔ اس قیمتی مشینری کے لئے یونیورسٹی کو صرف کراچی سے پشاور تک سامان کے لئے پچاس ہزار کی رقم کرائے میں صرف کرنا پڑی۔ اسی کرائے کی رقم سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ جو سامان انجینیرنگ کالج کے لئے بیرونی ممالک سے مفت حاصل ہوا اس کی قیمت بذات خود کتنی ہوگی۔ اور شپنگ

کے اخراجات بھی اُن فلاحی اداروں نے کتنے ادا کئے ہوں گے۔ اس کالج میں ہائیڈرولکس لیبارٹری بنائی گئی جو ملک کے کالجوں کے لئے بھی بطور نمونہ پیش ہوئی۔ سول، الیکٹریکل مکینکل انجینئرنگ کے علاوہ ایک شعبہ ایگریکلچرل انجینئرنگ کا بھی قائم کیا گیا۔ میٹریل ٹسٹنگ لیبارٹری۔ ریڈیو اور الیکٹرانک لیبارٹریاں قائم ہوئیں۔ ایک ہائی ٹنشن لیبارٹری کی علحدہ عمارت بنائی گئی مگر امریکن امداد رُک جانے کے باعث وہ منصوبہ تکمیل کا منتظر ہے۔ بہرکیف ایک اہم تعلیم کی داغ بیل ڈال دی گئی ہے تاکہ اگلے والے زمانہ میں اس کالج میں کام کرنے والوں کے لئے ایک مستقبل کا نصب العین بھی سامنے رہے۔

قبلہ کی اس عظیم خدمت، اور اس کالج کی اہمیت کے جہاں سینکڑوں معترف ہیں وہاں ایسے بھی چند ایک احسان فراموش تھے جنہیں اس مجلیٰ آئینہ میں اپنی مکروہ شکل ہی نظر آئی۔ قبلہ کے ریٹائرمنٹ کے بعد بھی جب الزامات اور بہتان تراشی سے کام نہ بنا تو کنبہ پروری، اعزا پروری اور وائس چانسلر بننے کی کوشش وغیرہ کے بے بنیاد مضامین ایک مقامی اخبار میں نکال کر ہی اپنا دل ٹھنڈا کیا۔

آخر ایسا کیوں ہوتا ہے کہ مصلحین، مفکرین، خادمینِ قوم کو خراجِ تحسین ملنے کے ساتھ ساتھ یہ گند بھی ضرور اچھالی جاتی ہے ہماری تاریخ جہاں روشن بابوں سے پُر ہے وہاں خلفائے راشدہ تک کے زمانوں کے دل خراش واقعات بھی جلیسے قسمت میں لکھ دیئے گئے ہیں۔ غالباً تخلیقِ وجود بھی قدرا سی انداز میں ہے کہ انفرادی جسم تک میں جہاں لطافتیں ہیں وہاں کثافتیں بھی ساتھ ہی لگی رہتی ہیں۔ جمیعت کے پاک مطہر لوگوں کی نظر لطافت پر جاتی ہے اور کثافتوں کے پروردہ ہر شے میں کثافت ہی دیکھتے ہیں۔ یہ اپنی کورینی کا قصور ہے کہ شمس کی تجلی میں بھی انہیں تاریکی ہی نظر آتی ہے۔ مگر اس کوتاہ بینی سے شمس

کا فیضان تو نہیں رُکتا۔ یہ فیض تو ایک صدقۂ جاریہ کی طرح قوم کی آبیاری صدیوں تک کرتا رہتا ہے۔
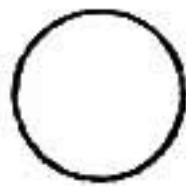
پیر و مرشد کے حکم کے تحت پشاور کے قیام کا مقصد روشنیٔ باطن کو بلادِ ہند کے جنوبی گوشہ سے لے کر شمالی علاقہ پہنچا دینا مقرر تھا۔ قبلہ نے اپنی فطری سادگی اور عاجزی کے سہارے لباطِ فقیر کو زمین میں پھیلانے کی بجائے قلب و روح کی بسیط فضاؤں میں نشر کرنے کو ترجیح دی۔ جس فقیر کی اصلہا ثابت" ناگپور میں بہ فیضانِ بابا تاج الدینؒ محکم تھی اور جس کی فرع بہ فیضانِ بابا قادر اولیاءؒ وزیا نگرم جنوبی ہند میں اپنی کھلی بہار دکھا چکی تھی، اس کی نوبہاروں کا نشر بابا درانی نے، آسمانِ وجود یعنی روح، امر ربی کے مقام سے کرنا تھا۔ اس کے لئے نہ کسی ظاہری طور طریق اور سلسلوں کے پھیلانے کی ضرورت تھی نہ رسمِ درویشی کی ظاہری پابندیوں کی جن کو دیکھ کر خلقت ارد گرد جمع ہونی شروع ہوتی ہے۔ اسی لئے بابا درانی کی روز مرہ زندگی اس طور طریق کی رہی کہ ظاہر بینوں کی نگاہ میں جیسے دوسرے عام انسان ہوتے ہیں دیکھا جائے تو بابا درانی کا مقصد، حق کا بول بالا کرنا تھا نہ کہ اپنی شخصیت کا۔ اور یہ ظاہر بین دنیا تو صرف کشف و کرامات کی قائل ہوا کرتی ہے جس سے انہوں نے ہمیشہ پرہیز کیا۔ یوں بھی ظاہری تجلیاں دیکھ کر متلاشیانِ حق زیادہ سے زیادہ اس ہستی کے قائل ہو جاتے ہیں جو مظہرِ حق بن کر سامنے ہوتی ہے۔ حق تک رسائی کا اگلا قدم تو اس فرمان کا عین ہے کہ "مجھ میں دیکھو"۔ یعنی وجود سے ماورا حقیقت تک

رسائی ہونا تو کچھ اور بات ہے ۔ اسی لئے بابا ذہانی نے عامیانہ سطح پر زندگی گزارتے ہوئے باطنی دنیا سے روشناس کرانے کے لئے پہلا قدم مقامِ قلب قرار دیا ۔ اس طرح اپنے ہر عمل میں محبت کا ظہور، میل جول، ملاقاتیں، عملی دردمندیوں کا اظہار، نگاہوں سے، ہمدردانہ باتوں سے محبتیں انڈیلنا برسوں ہوا کیا ۔ عوام سے خواص سے جو بھی موقع ملا، ملاقاتیں کرنا شغل رہا ۔ اپنے شکستہ جسم کی معذوریوں کو اس راہ میں بالکل حائل نہ ہونے دیا ۔ جہاں اللہ والے کا نام سنا پہنچے ۔ مزاروں پر حاضریاں دیں ۔ قوالی محفلوں، نیازوں میں شرکت کی ۔ ادبی محفلوں، علمی پروگراموں میں برابر دلچسپی قائم رکھی ۔ بازاروں، گلیوں، خلقت میں اس لئے گھومے کہ محبت عام ہو سے نہ من بیہودہ گردِ کوچہ و بازار می گردم ' کے جذبہ کو ایک معنویت کے روپ میں اپنایا ۔ اور یہ سب کچھ اس لئے کہ محبت عام ہو ۔ اس محبت کے نشتر کی شدتیں مادی سطح سے کہیں زیادہ برق سا سامانیوں کے ساتھ اپنے باطنِ وجود میں ہو رہی ہوتی ہیں ۔ انہیں کون دیکھتا ۔ اسی شدتِ شوق کے اظہار کی ایک نشانی یہ تھی کہ قسم قسم کی مچھلیاں (مثلاً شیانِ بحرِ حق کی نشانی) پالیں ۔ پہروں یہاں تک کہ راتوں ان کی دیکھ بھال کی ۔ قسم قسم کے ہزاروں پودے (اصلھا ثابتٌ وفرعھا فی السماء ۔ دیع دنیا) ترسریوں سے تلاش کر کر کے بڑی احتیاطوں سے ان کی پرورش کی اور یہ سب کچھ ایسے دردِ دل سے کہ جیسے اس کے علاوہ اور کوئی کام ہی اپنے مقصدِ حیات کا نہیں ۔ پھر کیکٹس (خار والے ۔ انانیت کے مظہر) جمع کرنے کا شوق ایسا چڑھا کہ ہزاروں قسم نایاب سے نایاب تر، صرف اس شوق کو ظاہراً پورا کرنے کے لئے کر کبھی تو پھول دیتے ہیں ۔

خواہ رات کے دو بجے صرف چند منٹ کے لئے ہی سہی ۔ تو یہ سب ظاہری دنیا میں ایسی نشانیاں جمع کرنے کا شوق اور خصوصاً کباڑی بازار کے روزانہ چکر اور کباڑ سے کوئی مفید مشین یا چیز بنانے کے پروگرام برسوں اسی لئے ہوئے کہ بابا درانی کا دائرۂ عمل انسانوں کے ہر طبقہ اور ماوراء سے تعلق رکھتا ہے ۔ ہر شے ، ہر عمل میں حُسنِ حقیقت کی تلاش ان کی فطرتِ ثانیہ کی نشاندہی کرتی ہے ۔ ان مشغلوں میں خون پسینہ صرف کرنا بے معنی بات نہیں ۔

مادی سطح پر ہی اگر کسی فقیر کے اردگرد کے ماحول کا جائزہ لیا جائے تو اس کے حلقۂ اثر کا حق والے بھی ہوتے ہیں ۔ دنیا و آخرت کے حسنات والے بھی اور خالص دنیادار بھی ۔ مگر اس کا باطنی دائرہ عمل اپنے اردگرد کے ماحول سے کہیں وسیع ہوتا ہے اور اس کی اپنی الکلیت کے مطابق ۔ جغرافیائی حدود اس کی وسعتوں کو محدود نہیں کرتیں جذبے کی راہوں سے گزرنے والے ، ذات کو اپنائے ہوتے ہیں اور چونکہ ہر وجود مظہرِ ذات ہے اس لئے وہ سب تخلیق کو ایک وحدت کی اکائی میں دیکھتے ہیں دنیا والوں کے لئے اتنا جان لینا ہی کافی ہے کہ فقیر کا سیدھا سادھا عمل بھی معنی در معنی گہرائیاں لئے ہوتا ہے ۔ دل بہ یار دست بہ کار کا مقولہ عشق کی دنیا میں ، وجود ، قلب ، روح کے ربط کا ایسا انوکھا انداز بن جاتا ہے کہ ہر سانس میں محبوب کی یاد ۔ ہر ہر قدم محبوب کی جانب ۔ اس طرح فقیر کے دنیا کے عمل بھی ٹھیک ہوتے رہتے ہیں ، اور وہ ایک لمحہ بھی اپنی راہ سے نہیں ہٹتا ۔ جس کے سر میں عشق کا سودا سما گیا ہو اس کا ہر ذرہ وجود محبوب کے لئے ۔ دنیا والوں کی نگاہوں میں وہ عام سا انسان نظر آتا رہتا ہے ۔ قلب و روح کی دنیا کا حال کون جانے ۔ حقیقت بینوں کی نگاہیں فقیر کے ہر عمل میں ، پس پردہ

حق کی کارفرمائیاں دیکھتی ہیں۔ فقیر کی زندگی کی مادی سطح تک نگاہ رکھی تب بھی وہ عام انسانوں سے زیادہ شفیق، خلیق، نرم گفتار، منکسر، عاجز، خادم نظر آتا ہے اور قلب کی گہرائیوں سے کچھ تعلق قائم ہوا تو وہاں محبتوں کے سمندر طغیانی طوفانی اُمنڈتے دیکھے پھر روح، امرِ ربی کی کارفرمائیاں تو وہ دیکھے جسے جیتے جی مقامِ روح نصیب ہو چکا ہو۔ جو خود محبوبیت کے زمرہ میں آگیا ہو۔ مقامِ روح سے ساری تخلیقِ وجود میں امرِ ربی کی کارفرمائی ہے یہیں سے عالمِ مثال کے نقشے ہیں، جن کے تحت دنیوی واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ ایک یکتائیتِ توحید امرِ کُن اور فیکونِ ظہور میں قائم ہے۔ عالمِ مثال اور عالمِ ظہور میں ایک مضبوط رابطہ ہی مشیتِ ایزدی کو نمایاں کرتا ہے۔ اسی کے تحت پتہ پتہ اس کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کرتا۔ پھر عالمِ مثال سے بھی پرے رحمت ہے۔ رحمت وسعِ کُلِّ ہے۔ بے سبب، بے وجہ، بے حد، بے نہایت۔ فقر کی منزل اسی عالمِ رحمت سے رابطہ کی بات ہے۔ عالمِ رحمت سے رابطہ نسبتِ محمدیؐ، نورِ محمدیؐ کے ذریعہ ہے۔ پردہ کی بات پردہ میں ہی رکھنا مناسب ہے۔ کون جانے، کون سمجھے سہ

کوئی حد ہے ان کے عروج کی ، بلغ العلیٰ بکمالہ

یہ سب کچھ عشق کی دسترس میں ہے، عشق ہی بنیادِ وجود ہے۔ عشق ہی ظہورِ اولیں۔ ہر ذرۂ کائنات کی فطرت میں عشق ہے۔ اَحبَبتُ اَن اُعرِفَ۔ وہ اپنے پہچانے جانے کا شوق، جو حق نے سب مخلوق میں ودلیعت کیا، انسان میں اکمل ظہور میں ہے۔ اسی جذبہ کے تحت من عرف نفسہٗ، اپنی پہچان کا شوق۔ یہ اگر تکمیل پاتا ہے تو عشق کی صورت میں۔ عشق کو جگانے کا طریقہ جو بابا درانی نے اختیار کیا وہ مقامِ روح سے اللہ اللہ۔ صلی اللہ علیک یا محمد۔ جب اسمِ اللہ کے تحت یہ روح میں کُن

سلسلہ بہ سلسلہ عطا کر دیا تو رحمتِ محمدی کے طفیل، فضا خود بوئے مشک بیشن سے معطر ہوتی چلی جائے گی۔ اللہ اور رسولِ پاکؐ کا عشق، خدمتِ خلق، دردِ امت، باہمی اخوت اور محبت کی فراوانیوں میں پروان چڑھے گا۔ ایسے قلوب ان لطافتوں میں حیاتِ جاوید حاصل کرلیں گے جن کے نصیب میں جہاد اور شہادت سے امت کی حیات کی آبیاری کرنا مقرر ہے۔ فروغِ اسلام کا یہ وہی جذبۂ اولیں ہے جس کے تحت سیدھے سادھے بدو جیسے رحمت کا پیام لے کر جہان میں پھیلے۔ اسی باطنی سبق کی زمانہ میں یاد دہانی اور اجراء کی ذمہ داری اپنے اپنے زمانہ میں فقراء اپنی اپنی استطاعت کے مطابق کی۔ انہیں نہ اپنے نام و نمود کا شوق تھا نہ ولایتوں کی منزلیں طے کرنے کا۔ انفرادیت کی "میں" سے ہٹا کر جمیعت کی وسعتوں میں ملت کو قیام عطا کرا دینا ان کا مشن تھا۔ سلام ہے ان پر جن کے قلوب عشق سے پُر ہو کر یہی خوشبوئے حبیب دنیا میں نشر کرنے کا ذریعہ بنے اور جب بھی افراد کا باطن درست ہوا تو ان کا ظاہر بھی حسنِ شرع کی تجلی دینے لگا۔

باطن کے چراغ روشن کرنے کی مہم کو عام کر دینے کے لئے بابا درانی نے اپنی روزمرہ گفتگو خصوصی محفلوں، شب بیداریوں، نیازوں میں امر باللہ کے سہارے فیضِ عام کیا۔ پھر رحمتِ عالم کے دردِ اُمت اور غمگساری کی سنت کی پیروی کو سب سے افضل سنت کی پیروی گردانتے ہوئے غمِ امت کو اپنا نصب العین بنا کر چند ایک تصانیف بھی پیش کیں کہ زمانہ کے کام آئیں۔ رحمتِ محمدی بلا تخصیص عام ہو جائے اور زمانہ حسب ضرورت اس بحرِ رحمت میں غواصی کر کے موتی چن لے جو ایک حکم کے تحت زمانہ کو پہنچا دینا ان کے ذمہ ہے۔ عوام سے قطع نظر خواص کی سطح پر جو بابا درانی کی کوشش

رہی وہ بھی اسی سید ھے سادھے جذبے یعنی دردِ امت کی جانب توجہ مرکوز کرانی تھی تاکہ فقرائے باطن کی صلاحیتوں کو نسبتِ محمدی کے رشتہ میں یک رنگی حاصل ہو اور فقراء میں امت کے فروغ کے لئے ایک توحیدِ فکر قائم ہو۔ قلب و روح کی سطح پر عمل پیرائی کا طریقۂ کار اور مادی سطح پر فکر و عمل کی جانب بابا درانی نے اپنی مختلف تصانیف میں بھی نشاندہی کی ہے۔ یہ اُن کے مشن کی شاید ایک ہلکی سی جھلک ہی پیش کر سکیں گی۔ کیونکہ فقراء کا دائرۂ عمل گفت و تحریر کی دنیا سے پرے قلب و روح کی دنیا سے تعلق رکھتا ہے۔

چند ایک تصانیف کے نام یہ ہیں:۔

وورای سادھو ۔ حیاتِ قادر ۔ کُن فیکون ۔ چار اسلام

باب ۹ ہومیوپیتھی

خاکسار تحریک میں شرکت اور ہومیو پیتھی علاج کرنے کی ابتدا تقریباً ساتھ ہی شروع ہونے کی بات ہے۔ دونوں کے تحت وہی جذبہ کارفرما تھا جس کا قبلہ کو بچپن سے شوق تھا کہ خلق اللہ کی خدمت کروں۔ یہ راز کسی نہ کسی طرح قبلہ کی روح میں پیوست ہو چکا تھا کہ خالق سے رابطہ خلق کی خدمت ذریعہ ہے۔ اسی لئے انداز اور گفتگو میں نرمی شفقت، ہمدردی، پیار، ان کی عادتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ طالب علمی کے زمانہ میں والد صاحب جو پچاس روپیہ بھیجتے۔ اس میں سے کھانے کے اخراجات سے بچا بچا کر ہومیو پیتھی کی دوائیں خریدتے۔ اپنے اوپر سختیاں جھیل جھیل کر کچھ ہومیو پیتھی کی کتابیں بھی خریدیں۔ یہ زمانہ ایف۔ ایس۔ سی میں طالب علمی کا تھا۔ ایک چھوٹا سا بکس دواؤں کا تیار ہوا اور اتوار کو چھٹی کے روز اطراف کے گاؤں دیہات میں جاکر دوائیں دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ جس جگہ علی گڑھ میں قیام تھا وہاں کے لوگ تو وقت بے وقت آکر دوائیں لیتے ہی رہتے۔

ہومیو پیتھی طریقۂ علاج کے متعلق جس سے بھی، جہاں سے بھی مزید معلومات ہونے کی توقع ہوتی قبلہ پہنچتے۔ کلکتہ کے ڈاکٹر گرگنگی سے لیوکوڈرما (برص) کا نسخہ حاصل کرنے کا واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ ڈاکٹر کٹر قسم کا آر ایس ایس کا ممبر تھا۔ یہ لوگ اپنی کلائی میں

کالا تاگہ باندھے رکھتے ہیں اور جب تک کسی مسلمان کو قتل نہیں کر لیتے یہ خیال کرتے ہیں
کہ ان کے کلنگ کا ٹیکہ لگا ہے یعنی بے حیا ہیں ۔ ایسے کٹر آدمی کے پاس مسلمان کا
گزر ویسے ہی اشتعال کا باعث تھا ۔ قبلہ تین دن تک اس کے اردگرد جا کر بیٹھ جاتے
وہ توجہ نہ دیتا ۔ اپنی طلب کی عرض پہلے ہی دن کر چکے تھے اور یہ بھی بتا دیا تھا کہ اُس کی
دیوار پر لکھے کتبہ نے انہیں اس کے قدموں میں روک رکھا ہے ۔ دیوار کے کتبہ پر انگریزی
میں لکھا تھا " نسخہ میں تجویز کرتا ہوں ، شفا اس کے ہاتھ ہے " ۔ بالآخر ایک روز ڈاکٹر نے
وہ نسخہ بتا دیا مگر ساتھ ہی برچھی اور بلّم لئے ہوئے پہرہ داروں کو کہا کہ انہیں ٹرام پر چڑھا
دو ۔ قبلہ نے اس وقت سمجھا کہ شاید ان کے قتل کا اشارہ کیا ہے مگر خیر گزری ۔ طلب صادق
تھی ۔ قبلہ کا خود فرمانا ہے کہ طلب صادق ہو تو گھورے سے بھی موتی چن سکتے ہیں ۔
زہر سے بھی تریاق بنایا جا سکتا ہے ۔ شیطان سے بھی علم سیکھا جا سکتا ہے ۔ ظاہر میں
یہ برص کا نسخہ اور باطن میں وہ ہی دستِ عطا ۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ بعد میں کئی ایک مریض برص
کے ٹھیک ہوئے اور حال ہی میں کسی کرم فرما نے ریڈرز ڈائجسٹ میں یہ بات شائع کر دی
ہے کہ قبلہ کے پاس برص کا نسخہ ہے چنانچہ جولائی ۱۹۶۵ء میں کئی خطوط قبلہ کے پاس اس
نسخہ کی تلاش کے سلسلہ میں آئے ہیں ۔ دوائیں تجویز کرنے اور مفت تقسیم کرنے کا سلسلہ اس
زمانہ سے آج تک قبلہ کے یہاں جاری ہے ۔ پشاور میں قبلہ کے متعلق اکثر لوگوں کو معلوم
ہے کہ وہ ہومیوپیتھی کے ماہر معالج ہیں ۔ ان کے ہاتھوں میں شفا ہے ۔ اتوار کو وہ اپنی جائے
قیام پر مریضوں کا معائنہ کرتے ہیں ۔ یہ سلسلہ ان کی انجینئرنگ کالج کی پرنسپلی کے
زمانہ میں چلتا رہا اور ریٹائر ہونے کے بعد بھی جاری ہے ۔ ہومیوپیتھی سے مزید دلچسپی
کے متعلق قبلہ کا فرمانا ہے کہ ۱۹۳۶ء میں جب وہ سخت علیل ہو گئے تھے تو علالت نے اتنی

تشویشناک صورت اختیار کر لی کہ دوست احباب، ڈاکٹر اور گھر والے ان کی زندگی سے مایوس ہو گئے تھے۔ لیکن قبلہ کی اپنی یہ حالت تھی کہ موت کو گلے لگانے کے لیے بیتابی اور شوق میں ایک ایک پل گن رہے تھے۔ اس کیفیتِ انبساط کا اظہار بارہا اس کے بعد بھی مختلف بیماریوں اور اوقات پر وہ بڑے جذباتی انداز اور مستی کے عالم میں کر دیتے ہیں۔ یہ کچھ ایسی کیفیت کا اظہار ہوتا ہے کہ جیسے پرندہ آزاد ہونے کے لئے بے تاب ہو اور سننے والے تک پر یہ اثر ہو کہ وہ بھی ساتھ ہی اڑان لگانے کے لئے بے قرار سا ہو جاتا ہے مگر جن کے ذمہ کاروبارِ جہان سپرد ہوں ان کے بارہ لگام لگی ہوتی ہیں۔ پاؤں زمین پر بندھے ہوتے ہیں۔ الغرض ان ہی بیماری کے دنوں میں ایک قدیم دوست ڈاکٹر محمد اسمٰعیل نامی جو، ان دنوں حیدرآباد سندھ میں ہیں قبلہ کو دیکھنے علی گڑھ آئے اور انہوں نے کہا۔ جا تو یوں بھی رہے ہو، لگے ہاتھوں ایک پڑیا ہماری بھی استعمال کرتے جاؤ۔ قبلہ نے وہ پڑیا استعمال کی اور سب کی حیرت کی انتہا نہ رہی کہ درد کے دورے اسی دن سے بند ہو گئے۔ نامی صاحب اس دوران چھ ماہ تک قبلہ درانی صاحب کے ساتھ رہے۔ مکمل علاج کیا اور جب اللہ تعالیٰ نے قبلہ کو کلی شفا عطا کی تو ڈاکٹر نامی نے ایک روز کہا کہ اب تم صحت یاب ہو گئے ہو بتاؤ میری فیس کیا دو گے۔ قبلہ نے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی وساطت سے نئی زندگی بخشی ہے۔ یہ زندگی آپ کی ہے۔ اگر آپ چاہیں تو بخوشی لے سکتے ہیں۔ ڈاکٹر نامی نے قرآن شریف پر ہاتھ رکھوا کر قسم لی کہ ہومیو پیتھی کا مزید مطالعہ اسی جنون اور جذبے سے کرنا ہے جس سے دوسرے مضامین کا کیا ہے چنانچہ قبلہ نے دو سال تک ہومیو پیتھی کا مطالعہ جاری رکھا اور اس پر عبور حاصل کر کے چھوڑا۔ مگر اس تمام علاج میں کے پیچھے لوگوں نے بالآخر یہ بات جان لی کہ درانی صاحب کے ہاتھوں میں بڑے بڑے مرضوں سے شفاء

ہومیوپیتھی کے مطالعہ کا کرشمہ نہیں بلکہ اس کا سرچشمہ کہیں اور ہے۔ لوگوں کے اصرار پر قبلہ نے بتایا کہ یہ بات ظاہر تو نہیں کرنا چاہتا تھا مگر بات یہ بھی ہوئی کہ ایک بار علی گڑھ کے کالج کے لئے سامان لینے رڑکی جانا پڑا۔ حضرت مخدوم صابری کلیری کے مزار پر حاضری دینے کا موقع ملا۔ کئی روز تک یہ معمول رہا کہ مزار پر حاضر ہوتا، فاتحہ پڑھتا اور خاموشی سے واپس چلا آتا۔ مزار پر جانے والوں کی زبانی اکثر سنتا رہتا تھا کہ یہ ناممکن ہے کہ صابرؒ سے کچھ مانگیں اور وہ نہ ملے۔ ایک روز دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ پیرِ کلیری سے شفا مانگو۔ یہ سوچ کر مزار پر حاضر ہوا لیکن وہاں جا کر بھول گیا۔ فاتحہ پڑھ کر واپس لوٹ رہا تھا کہ رڑکی کی طرف سے ایک ملنگ کو، شیر کی طرح دندناتے آتے دیکھا۔ جب وہ نزدیک پہنچا تو میں نے نظر نیچی کرلی۔ ملنگ نے ہاتھ پکڑ لیا اور کرخت لہجہ میں بولا، لاؤ سوا روپیہ۔ میں نے اس کی صحت اور توانائی دیکھ کر روپیہ دینے سے انکار کیا۔ اس پر اس نے ڈانٹ کر کہا۔ صابرؒ سے حکیمی کا سرٹیفکیٹ لے کر آرہے ہو اور فیس بھی نہیں دیتے۔ یہ سُن کر مجھے پسینہ آیا اور پورا بٹوہ ملنگ کے حوالے کر دیا اور خدا کا شکر ادا کیا۔ یہ شفا، کلیری عطیہ ہے

پھر اس عطا پر مزید مُہر قادر نگر دربار میں باباقادرؒ کے حضور لگی۔ قادر نگر میں، قبلہ نے دیکھا کہ وہاں تو صرف حُکم چل رہا ہے۔ یہ ہوتا۔ ایسا ہو جاتا۔ ایسا نہیں ویسا ہو۔ جو باباقادر اولیاؒ نے کسی کے لئے فرمایا وہی ہوتے دیکھا۔ ٹیڑھے سے ٹیڑھے مرض کی شفا بھی بس اسی حرفِ کُن سے ہوتی دیکھی۔ اندھے، کوڑھی، بیمار بس نگاہ کے اثر سے شفایاب ہوتے دیکھا تو سوچا کہ یہ دوا نہ کا بہانہ بھی درمیان میں کیوں ہو، مگر ایک دن باباجان نے قبلہ سے خود اپنے لئے دوا مانگی اور فرمایا تمہاری جرمنی گولیوں نے اثر کیا جی۔ جرمن لوگ علم معلوم کر رہے ہیں۔ حضرت لقمانؑ پر ہزاروں جڑی بوٹیوں کا علم روشن تھا۔ اب وہی

علم معلوم کر رہے ہیں۔ جسم تو ضعیف ہوگا مگر دل چلتا رہے گا۔ مرنے نہیں دیں گے۔ یہ ظاہر کا بہانہ بھی اچھا ہے۔ اپنا کام کرتا ہے۔ یوں دل کی اصل حیات تو ذکر سے ہے ذکر ہر حال میں جاری رہے۔ ہوش ہو، بیہوشی، کیف ہو، مدہوشی ہو، سکتہ ہو یا سانس جاری رہے۔ سب کچھ ذکر کی کارفرمائی ہے۔ اُس وقت قبلہ پر روشن ہوا کہ اپنے ذکر میں ہو جائیں اور کسی کے لئے دوا تجویز کریں تو اثر کئے بغیر نہیں رہتی۔ اس طرح غیب کی مُہر، ظاہر میں بھی لگ گئی اور اس ہومیوپیتھی علاج کے ذریعہ، امراض کا بھی علاج ہوا اور قُلوب کا بھی۔ قلب کی حیات ہی، اصل زندگی کا سرچشمہ ہے۔ اُس زندگی کا جواس جسم کی محدود زندگی سے پرے بھی ابدالاباد تک جاری رہنی ہے۔

پشاور میں ہومیوپیتھی کا سلسلہ ابتدا میں صرف روزمرہ کے ملاقاتیوں کے لئے جاری رہا۔ صبح، شام، رات جو بھی مریض آتا اسے دوا دی جاتی۔ پھر کچھ ایسے بھی پُرانے عارضوں میں مبتلا لوگ آئے جو پہلے سے قبلہ کی فقیری کی بابت جانتے تھے۔ قبلہ نے ان سے اس شرط پر علاج کرنے کی ٹھانی کہ کسی سے کہنا مت۔ یہ لوگ ٹھیک ہوئے تو دوسرے لوگوں کو یہی کہہ کر بھیجتے کہ کسی سے کہنا مت۔ الغرض تین چار ماہ میں بیماروں کے آنے کا تانتا بندھنے لگا اور پھر روزانہ ہی شام کو دوائیں دی جاتیں اور دس بجے رات تک یہ سلسلہ رہنے لگا۔ مریضوں کی بڑھتی ہوئی تعداد اور اپنی دیگر مصروفیات کے باعث، پھر چھٹی کا دن مقرر کیا گیا اور صبح سے دوپہر تک دوائیں دینے کا سلسلہ جاری ہوا۔ سہولت کے لئے یونیورسٹی میں کیمسٹری بلاک کے ایک کونے والے کمرہ کی کھڑکی سے دوائیں تقسیم کی جاتیں اب تک اس فقیری دوا کی اتنی شہرت ہو چکی تھی کہ اچھی خاصی تعداد لوگوں کی پہنچتی جن کو سنبھالنا مشکل ہوتا۔ ان لوگوں میں شامل ہو کر وہ بھی آجاتے جو یہ جاننے کی کوشش کرتے کہ آخر اس

کے لبسِ پردہ کیا ہے۔ یہ نام ونمود یا شہرت حاصل کرنے کا چکر ہے یا پیسے بٹورنے کا ذریعہ ہے یا عمل عملیات کا زور ہے البتہ اتنا ضرور ہوا کہ کچھ عرصہ اس خدمت خلق کے طریقہ کو دیکھ کر ان میں سے کچھ روشن باطن ضرور اپنی منزلِ طلب کی راہ پا لیتے۔

لوگوں کے اس مجمع کو سنبھالنے کے لئے کچھ نوجوان منتظمین خود اس کام میں لگنے لگے مگر یہ ہومیوپیتھی دوائیوں کی پڑیاں حاصل کرنے کے لئے لوگ ایسے ایک دوسرے کو ہٹاتے کہ کپڑے تک پھٹ جاتے اور ہر ہفتے کھڑکیوں کے چند شیشے ٹوٹ جاتے۔ یہ بات یونیورسٹی کے حکامِ بالا کو ناگوار گزری یا اسی چیز کو اپنے اختلاف کا سہارا بنا کر ممانعت کر دی گئی کہ یہاں دوائیں تقسیم نہ ہوں۔ اس جگہ سے دوائیاں دینے کا سلسلہ بند ہوا تو تہ کمال بالا گاؤں کے باہر ویرانے میں قبرستان والی مسجد، دوائیں تقسیم کرنے کے لئے منتخب کر لی گئی۔ اس مسجد کو جنوں والی مسجد بھی کہا جاتا تھا۔ اب ایسی ویران جگہ پر دوائیں تقسیم کرنے میں تو کسی کو شکایت نہ ہو سکتی تھی۔ چھٹی کے روز صبح ہی سے اس جگہ مفت دوائیاں تقسیم کرنے کا سلسلہ شروع ہوتا۔ قبلہ، نسخے لکھتے جاتے اور آٹھ دس لوگ پڑیاں باندھنے میں لگے رہتے۔ اب ایسی ویران اور دور جگہ پر لوگوں کا ہجوم گھٹنے کی بجائے کہیں اور زیادہ بڑھ گیا۔ شروع شروع میں لوگ پیدل، سائیکل، تانگے موٹروں پر آتے اور بالآخر ایک دن اس جانب کے لئے اسپیشل بسیں چلنے لگیں۔ سینکڑوں ہزاروں لوگ آتے۔ ان میں شہر کے لوگ بھی ہوتے۔ آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی ہوتے اور بہت سے خانہ بدوش کوچیوں کے خاندان۔ جو اس زمانہ میں کافی غربت کی زندگی گزارتے تھے اور آج وہ خوشحال بھی ہیں اور صحت مند بھی۔

اس دور جگہ پر دوائیں لے جانے اور لوگوں کے وہاں تک پہنچنے میں رکاوٹیں تھیں

مگر دھوپ، بارش، کیچڑ، سردی کے باوجود یہ سلسلہ ٹوٹنے نہ پاتا فقیر ڈاکٹر کی شہرت ہو چکی تھی کہ مرد، عورتیں، بچے، بوڑھے۔ گروہ در گروہ اس دن اپنے لئے فقیر کی دعا والی پڑیاں لینے پہنچتے۔ مسجد کے اندر بیٹھ کر قبلہ نسخے لکھتے جاتے اور انسانوں کے ساتھ اجنبی بھی اسی بہانے قریب آجاتے اسی دوائی کے پیچھے، فیضِ عام ہی ذریعہ ہوتا ہے خلقت اور اجنبی کو اپنے قریب لانے کا۔ ان ہی میں اگر کوئی موتی آتا ہے تو حق کی نذر کے لئے چن لیا جاتا ہے اور حق کی راہ پر لگا دیا جاتا ہے۔ یہ خدمتِ خلق، چور دروازہ ہے، قُربِ حق کا۔ حق کو تلاش کرنا ہے۔ تو خلقت کو تلاش کرو۔ یہی خدمت خلق، اپنے عرفان کا ذریعہ بنتا ہے اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کے بروئے کار آنے کے بعد کچھ اپنے باطن کی پہچان ہو جاتی ہے۔ دُکھی انسانیت کا دُکھ درد اپنا کر ہی انسان قلبی سکون پا سکتا ہے۔ یہ خلوص ہی سب کچھ ہے۔ قبلہ کا بھی فرمانا ہے کہ خلوص صدا بہار ہے اور اس ہنگامۂ ہستی میں یہی ایک نعمتِ ابدی ہے۔ جن لوگوں نے عرصہ تک، صرف زبانی، انسانی ہمدردی اور خدمتِ خلق کی باتیں کرنے کی بجائے، عملی طور پر اس قسم کے پُرخلوص ماحول میں چند دن بھی گزارے ہیں ان کے ساتھ یہ ضرور ہوا ہے کہ وہ اس بے لوث خدمتِ خلق کے ذریعہ اپنے باطنی سکون حاصل کرنے کی راہ پر لگے اور ان ہی میں سے بہت سے پُرانے بیمار، اپنی اپنی بیماریوں اور اپنے اپنے خیالوں اور پریشانیوں میں گھرے ہوئے انسان، دوسرے لوگوں کی تکالیف اور امراض دیکھ کر اپنی خود غرضی والی زندگی کو بھی بھلا بیٹھے اور اپنے فرض کو بھی بھلا بیٹھے۔ قبلہ کے دوائیں تجویز کرتے وقت کوئی ساتھ بیٹھ کر دیکھے تو اسے معلوم ہو کہ فقیر کا کتنا دل گُردہ ہوتا ہے کہ ہر ایک کی تکالیف نہ صرف سنتا ہے بلکہ اپناتا ہے۔ وہی تکلیف خود بھی محسوس کرتا جاتا ہے جیسے شفیق ماں،

اپنے بچے کی تکالیف دردِ دل سے اپنے پر اپناتی ہے۔

اس جنوں والی مسجد سے دوائیاں تقسیم کرنے کا سلسلہ کئی سال چلتا رہا اوراس کے ساتھ ساتھ جو مریض، جس وقت بھی آجاتا اس کو گھر پر بھی دوا دی جاتی۔ پھر چند سالوں بعد جب یونیورسٹی کے حالات بدلے تو اس دور جگہ سے ہٹ کر اپنی جائے قیام پر ہی۔ ون سے یہ ہفتہ وار دوائیں دینے کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس عرصہ میں دواؤں کی پڑیاں باندھنے والوں نے اپنی اپنی ڈیوٹیاں طے کر لی تھیں۔ دوائیں دینے کا دن آنے سے پہلے پہلے ہی بہت سی عام دواؤں کی پڑیاں گھروں سے بنا کر لائی جاتیں، تاکہ دوائیں دیتے وقت زیادہ وقت نہ لگے اور بیمار لوگوں کو دواؤں کے انتظار میں تکلیف نہ اٹھانی پڑے۔ البتہ خصوصی دواؤں کی پڑیاں وقت کے وقت بنا دی جاتیں اس مقررہ دن کے علاوہ بھی کسی دن لوگ دور دور سے آتے اور علاج لے کر جاتے۔ آس پاس کے شہروں کے مریض ہی کیا۔ کراچی، لاہور، پاکستان کے دور دراز مقامات سے لوگ اس فیضان کا سن کر پہنچتے اور ان میں سے بعض اپنے جسم وجان کے سکون کے ساتھ ساتھ، روحانی سکون بھی لے کر جاتے۔ اس کی عام طور سے یہ وجہ ہوتی کہ ہر قسم کی دوا دارو کرنے کے بعد، یہاں تک کہ بعض صورتوں میں یورپ جا کر بھی علاج نہ ہو سکنے کے بعد یہ لوگ یہاں پہنچتے۔ ان مریضوں میں کچھ ناممکن العلاج امراض والے بھی ہوتے۔ یہ داستان مختصر بھی ہے اور طویل بھی۔ اس کی شہادت صرف وہی لوگ دے سکتے ہیں یا ان کے لواحقین کہ یہ فیضانِ شفا ان کو کیسی کیسی ناامیدیوں کی حالت میں ملا۔

جہاں قبلہ کی اس فقیری شان کا چرچا تھا اور فیض کا دریا ہر خاص و عام کے لیے جاری تھا وہاں ساتھ ہی ساتھ دنیا دار لوگوں کو پتہ نہیں کیوں ایک عداوت سی تھی۔

اور وہ ہر طرح دل آزاری پر لگ گئے ۔ تہمتیں ، الزام ، بدنامی ، بُرا بھلا سب کچھ سننا پڑا ۔ کچھ لوگ بر سرِ عام بیٹھے پیچھے تقریباً روزانہ ہی کسی طرح قبلہ کا ذکر چھیڑ کر ان کی برائی کرتے یا فقرے کستے ۔ اور کچھ لوگ دواؤں والے دن تماشہ بینی یا سی آئی ڈی کرنے پہنچتے ، مگر ــــ صبر کی ندی بڑی گہری ہوتی ہے ۔ یہ دشنام ، یہ کوڑا کرکٹ ، یہ گند اس کی روانی پر کیا اثر کرتے ۔ ہُوا یہی کہ ان لوگوں تک پر فیض ہوا ۔ یہ بیمار پڑے تو بڑے دردِ دل سے ان کا علاج ہوا اور بالآخران کی بھی زبانیں بند ہوئیں ۔ اس طرح فقیر کو کڑوا بھی کھانا ہوتا ہے اور کانٹے بھی اپنے نرم ہونٹوں سے کھانے ہوتے ہیں ۔ تب ہی وہ فقر کی میراث پر بیٹھنے کا حقدار ہوتا ہے ۔

قبلہ کے ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد پھر یہ ہفتہ وار دواؤں کا سلسلہ یونیورسٹی میں پروفیسر امجد مرحوم کے گھر سے ہوتا رہا اور بعد ازاں قبلہ کے بھانجے محی الدین پاشا کے گھر ایس ۔ ۹۰ میں آج تک یہ سلسلہ جاری رہتا ہے ۔ قبلہ کی جسمانی صحت اب اس بات کا کہاں تقاضا دیتی ہے کہ رات دن وہ اس مشغلہ میں لگے رہیں ۔ جسم پہلے ہی سے شکستہ حال ہے ۔ ابتدائی زمانہ میں خلقت کی بیماریاں اپنے پر سے گزارنے کے شوق کا بالآخر یہ نتیجہ ہوا کہ ہر قسم کی ٹی ۔ بی ہر قسم کا مرض اپنے جسم پر لگا ۔ یہاں تک کہ بعض ہڈیاں تک گل گئیں ۔ ریڑھ کی ہڈیاں ، شانہ کی ہڈی ، سینہ کی دو ہڈیاں بھی گل چکی ہیں اور اب ایک پیڈ و بیلٹ کے ذریعہ اپنے سینہ کو سنبھال رکھا ہے اور اوپر سے قمیض پہن لی جاتی ہے ۔ جسم کی اس حالت میں کوئی دوسرا ہوتا تو پلنگ سے نہ اٹھ سکتا ، قبلہ نے اب بھی وہی خدمت خلق کا ذریعہ جاری رکھا ہے ۔ صبح سے شام تک اب بھی روزانہ لوگ وقت بے وقت اپنے علاج کی غرض سے آتے رہتے ہیں اور قبلہ کسی کو ناامید واپس نہیں

جانے دیتے ۔ اس کے علاوہ ہر اتوار کو وہ دوائیں دینے کا سلسلہ اب بھی برابر جاری ہے ۔ لوگوں کے اس ہجوم میں کمی یا زیادتی ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فقیر کی اپنی مرضی سے ہوتی ہے ۔ خلقت کے دکھ درد ، لوگوں کی ذہنی اور جسمانی تکالیف کی حالت کوئی اپنے پر سے گزار کر دیکھے ۔ تب ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ فقیری کتنے دل گُردے کی بات ہے ۔

مریضوں کے ہجوم اور قبلہ کی جسمانی حالت کے زیرِ نظر پی ۔ ون کے قیام کے زمانہ سے قبلہ کے ساتھ ، اس ہفتہ وار دوائی والے دن ، چند اور لوگوں کو بھی نسخے لکھنے کی اجازت مل گئی ہے ۔ یہ وہ خوش نصیب لوگ ہیں جنہیں قبلہ نے بسم اللہ کی اجازت عطا کی ہے اور شفا ء کا رمز سکھا دیا ہے ۔ وہ یہ کہ خود صفر ہو کر ، ایک وسیلہ بن کر ، اپنی ڈور ، مالک کے ہاتھ میں دے دو ۔ پھر بسم اللہ کہہ کر جو نسخہ لکھو گے وہ ادھر ہی کے فیضان سے ہوگا جہاں سے یہ نسبت قائم ہے ۔ نسخہ باندھنے والوں میں بھی ایسے خوش نصیب ہیں جو برسوں سے اس فرض کو ہر ہفتہ بغیر سلسلہ ٹوٹنے کے آج تک انجام دے رہے ہیں ۔ باہر کی میزوں پر مرد اور کھانے کے کمرہ میں وہ خوش نصیب عورتیں ، جو دواؤں کی پڑیاں باندھتے ہیں ۔

ان میں ایسے بھی ہیں جو اپنی تکلیفیں بھول کر خدمتِ خلق میں لگ گئے ہیں ۔ قبلہ کا ان لوگوں سے یہ فرمانا ہے کہ یہ کام ہر ہفتہ ضرور کر لیا کرو جو لوگ دو ماہ یہ کر لیتے ہیں ان کی ساری تکلیفیں دور ہوتی ہیں ۔ اور وہ اس خدمتِ خلق کے ذریعہ ، جنت کی سیڑھیاں چڑھتے ہیں ۔ اس طرح دیکھا جائے تو دوائی خانہ کیا ہے ، ایک لنگر خانہ ہی ہے جیسا کہ عام طور سے فقراء کے یہاں لنگر کا سلسلہ ہوتا ہے

اس دوائی والے دن جسمانی امراض والے مریض بھی آتے ہیں، قلبی اور روحانی امراض والے بھی۔ کچھ ناممکن العلاج مریض لے کر آتے ہیں، کچھ دنیا کے دکھ درد کے احوال لے کر، کچھ قلبی اور ذہنی سکون کی تلاش میں، تو خال خال وہ بھی جنہیں کچھ حق کی تلاش ہے۔ یہ بھی دیکھنے میں آیا ہے کہ کیسا ہی کیس ہو، خواہ تین دن بعد مرنے والا ہی ہو، تب بھی قبلہ نے کسی کو ناامید واپس نہیں کیا۔ کچھ نہیں تو اپنی شفقت کی نگاہ سے اسے موت کے خوف سے نکال کر، رجوع الی اللہ ضرور کر دیا۔ بعض دیکھنے والوں نے یہ بھی کہا کہ آخر ٹکائے رکھنے سے کیا فائدہ تو قبلہ نے اشارۃً یہ ضرور کہہ دیا کہ اب مریض کا آخری وقت ہے، مگر اپنی طرف سے دوا اور دعا ضرور دے دی کہ اس جانے والے کیلئے بھی امرِ بسم اللہ آخرت کی روشنی کا سہارا بن جائے۔

یوں لاعلاج مرضوں کے علاج بھی ہوئے اور بغیر دوا کے بھی یہاں آ کر مریض ٹھیک ہوئے۔ اس لئے اسے دوا کا کرشمہ کہا جائے یا دعا کا۔ لوگوں کے اعتقاد کا معجزہ کہا جائے یا عطا کا۔ جب سب کچھ ایک ہی وحدتِ وجود ہے تو یہ سارے کا سارا نقشہ ایک ہی وحدتِ شہود ہے۔ کوئی کسی انداز میں دیکھے، کوئی کسی انداز میں اپنائے کوئی خواہ، سبب اور نتیجہ کے تحت اس کی تشریح کرے یا چاہے تو سب کچھ کسی دلائل کے تحت ٹھکرا دے مگر اس حقیقت سے کیسے آنکھیں بند کر لے، جو اس ہومیوپیتھی کے پس پردہ کار فرما ہے۔ ایک دو واقعات ہوں تو خیر۔ جب تعداد سینکڑوں، ہزاروں سے بھی تجاوز کر جائے تو چند مثالیں ہی اس ڈرامے کی پیش کر دینا کافی ہیں۔

۱۹۵۲ء کی بات ہے ایک لاہور والے صاحب کو ٹیپک السر تھا مدتوں علاج کرایا۔ جرمنی بھی ہو آئے، شفایابی نہ ہوئی۔ خواب میں انہوں نے دیکھا کہ پشاور میں

ایک ڈاکٹر درّانی ہیں۔ انہوں نے پیٹ کا اپریشن کیا ہے۔ پشاور پہنچے۔ ڈاکٹروں کی فہرست دیکھی پتہ نہ چل سکا۔ ان کو بہر حال لگی ہوئی تھی کہ کوئی اس نام کا ہونا چاہیئے دریافت کرتے کرتے پتہ چلا کہ ایک صاحب انجینئرنگ کالج پشاور یونیورسٹی میں ہیں جن کا نام دُرّانی ہے۔ سرجن تو نہیں ہیں مگر ہومیوپیتھی علاج کرتے ہیں۔ یہ صاحب یونیورسٹی پہنچے۔ ملاقات ہوئی۔ پہچان لیا کہ یہ تو وہی ہیں جنہوں نے خواب میں پیٹ کا اپریشن کیا تھا۔ الغرض ماجرا بیان کیا۔ قبلہ نے ہومیوپیتھی کی۔ دو پڑیاں دے دیں۔ وہ دوا لے کر چلے گئے اور کچھ عرصہ میں ٹھیک ہو گئے۔ یہاں قریبی لوگ اس بات سے حیران تھے کہ آخر یہ مریض اتنی دور سے کیسے علاج کے لئے آئے۔ ان کی صحت یابی کے بعد یہ رمز کھلا کہ وہ بشارت کے تحت کیسے پہنچے تھے۔

پشاور اکیڈمی کے ایک صاحب کو نروس بریک ڈاؤن ہوا۔ پہلے سے قبلہ کو پہچانتے تھے۔ فقیری دعا اور دوا کے طالب ہوئے۔ ساتھ ہی شفا ہو جانے کی صورت میں اس بات کو صیغۂ راز میں رکھنے کا وعدہ کر گئے۔ شفایاب ہوئے تو اپنے خصوصی دوستوں کو علاج کے لئے چھپ چھپ کر بھیجتے رہے۔

فوج کے ایک اعلیٰ افسر شوگر کے مریض تھے۔ چھپ کر ادھر بھی علاج کے لئے رجوع ہوئے۔ کچھ عرصہ میں ہومیوپیتھی علاج سے صحت یاب ہوئے تو میڈیکل بورڈ پیچھے لگ گئی کہ غیر مصدقہ طریقۂ علاج کی طرف کیوں رجوع کیا۔

ایک صاحب بچپن میں کہیں گندی جگہ گر کر زخمی ہوئے تھے بات گئی گزری ہو گئی کافی معمر ہو کر ٹانگ کے ایک عارضہ میں مبتلا ہو گئے۔ ٹانگ پر ایک گندا بدبودار زخم تھا بہت سے علاج معالجہ سے بھی ٹھیک نہ ہوا۔ قبلہ نے زخم دیکھا۔ مریض کی گزشتہ ہسٹری

دریافت کرتے رہے۔ اتفاق سے ان صاحب کو بچپن کا یہ واقعہ یاد آ گیا۔ قبلہ نے ایک ہی ڈوز دیا اور زخم تھوڑے سے عرصہ میں بالکل ٹھیک ہو گیا۔

۱۹۵۶ء کا واقعہ ہے۔ بابا قادر اولیاؒ ابھی حیات تھے۔ قبلہ کو لنڈن آئے چند سال ہی ہوئے تھے۔ بڑے بڑے پرانے مریضوں کا علاج کر رہے تھے۔ ایک اعلیٰ افسر کی ضعیف بیگم ٹی بی میں مبتلا تھیں۔ خود قبلہ وہاں جا کر دوا دیتے۔ مریضہ اور گھر والوں کو قلبی سکون، قبلہ کی موجودگی سے حاصل ہوتا تھا۔ کچھ عرصہ علاج کے بعد بھی مریضہ ٹھیک نہیں ہوئی تو قبلہ نے باباجانؒ کی طرف توجہ کی۔ باباجانؒ نے فرمایا "قدرت کے کاموں میں کیوں دخل دیتے ہو۔ یہ دنیا ہے۔ ایک نہ ایک دن ہر ایک کو چھوڑ کر جانا ہے۔ قبلہ یہ سن کر دل شکستہ ہوئے۔ اپنی ساری عمر کی فقیری پھر بھی داؤ پر لگانے کی ٹھانی۔ سردیوں کے دن تھے، شام کا وقت۔ فقیری ملنگی والا چوغہ پہنا اور بابا تاج الدینؒ اور بابا قادر اولیاؒ کے تبرکات کا ڈبہ جو ملا تھا وہ بغل میں دبایا اور مریضہ کے سرہانے پہنچ گئے۔ باباجانؒ کا ہاتھ اپنے کندھوں پر محسوس کیا اور آواز سنی کہ کیوں دخل دیتے ہو۔ مریضہ کے گھر سے چلے آئے اور ساتھ ہی ایک ہم جلیس کا گھر تھا وہاں پہنچے ادھر دو ایک اور فقیر اور بزرگ ملنگی پہلے سے موجود تھے۔ ان کا کہنا ہے کہ قبلہ کرسی پر بیٹھ گئے۔ آنکھیں بند کر لیں۔ پھر وہ ڈبہ چوغہ کے اندر سے اسی حالت میں نکالا اور اس میں سے کچھ تبرکات تقسیم کرنے شروع کر دیئے جتنے ہی لوگ تھے اس لئے اس میں سے ایک ایک دے کر ڈبہ بند کر لیا۔ اور کہا اس کا کیا کریں۔ ایک سالک بزرگ جو موجود تھے انہوں نے دو ایک نام لئے کہ یہ ان کا حصہ ہے۔ اس پر قبلہ نے فرمایا ابھی ان کا وقت نہیں آیا ہے۔ یہ ڈبہ آپ امانت رکھیں وقت آنے پر انہیں

دے دیں۔ پھر قبلہ نے اسی حالت میں فرمایا کہ جب باباجان نے ہمیں روک دیا ہے تو پھر ہمیں ادھر سرحد کے علاقہ میں بھیجنے کا فائدہ کیا۔ وہ مریضہ ٹھیک نہیں ہوتی تو ہم بھی روانہ ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر جسم سے روح سمیٹ کر اوپر کھینچنی شروع کی ان بزرگوں کا کہنا ہے کہ پہلے ٹانگوں سے جان سی گئی۔ پھر آہستہ آہستہ اوپر کے جسم سے اور اب آنکھوں کے درمیان پیشانی میں جیسے روح آبیٹھی اور وہاں سے خطاب ہو رہا تھا۔ لوگوں نے اس ماحول سے متاثر ہو کر منت سماجت کی پیر پڑے، رونا دھونا شروع کیا۔ ایک بزرگ نے مصلیٰ بچھا کر حضور غوث پاک میں عرض کی۔ ان کو جواب ملا کہ ابھی نہیں جاتا۔ انہیں تو قلبی تسکین ہو گئی۔ دوسرے صاحب جو ملنگی میں تیس سال گزار چکے تھے۔ قبلہ سے برابر متوجہ تھے اور بات کر رہے تھے جب ان کے سمجھانے پر قبلہ نہ مانے تو انہوں نے پھر کہا کہ یہ کیا مشکل ہے روح کا سلب کر لینا۔ ہم نے بھی فقیری میں تیس سال بھاڑ جھونکا ہے۔ دیکھیں آپ کیسے روانہ ہوتے ہیں۔ یہ کہہ کر انہوں نے لوگوں سے کہا کہ پڑھو درود شریف زور سے۔ جوں ہی درود شریف پڑھا گیا۔ کھٹ سے روح پیشانی سے اتر کر قلب پر لگی۔ پھر آہستہ آہستہ نیچے کے بدن میں اتری اور قبلہ کرسی سے سجدے میں چلے گئے۔ کہنے لگے بڑی غلطی تھی۔ عبودیت عاجزی بڑی چیز ہے۔

برص کا پہلا کیس جو نظر سے گزرا وہ غالباً قبائلی علاقہ سے تیرہ کی مسجد سے ایک صاحب معہ خاندان کے آئے تھے۔ لڑکی کی شادی مقرر کر دی تھی۔ پندرہ دن بعد شادی ہونی تھی۔ لڑکی کے چہرہ پر دھبہ تھا۔ ماں نے فریاد کی کہ شوہر واپس کر دے گا قبلہ نے فرمایا لے آؤ۔ وہ سخت پردہ میں سامنے لائی گئی۔ قبلہ نے دیکھا دوا دی اور ساتھ

ہی کہہ دیا، شادی کی تاریخ بدلنے کی ضرورت نہیں، ٹھیک ہو جائے گی ۔ اور ایسا ہی ہوا۔ وہ لوگ کچھ عرصہ بعد شکر ادا کرنے آئے تھے ۔ اور یہ بھی دیکھنے میں آیا کہ دوسرے لوگ اِسی مرض کے کچھ تو ٹھیک ہو ہو کر گئے اور کچھ چار چار سال تک بھی ٹھیک نہ ہوئے ۔

ایک مُلک کے نامور بیرسٹر میگرین کے مرض میں مبتلا تھے ۔ یورپ جا کر بھی علاج کرا آئے ۔ ہومیوپیتھی علاج میں قبلہ کی مہارت کا حال سن کر پہنچے ۔ چند پڑیوں میں مرض بالکل غائب ۔ وہ صاحب نسبت ہیں اس لئے علاج کے پیچھے دستِ کرم کے زیادہ قائل ہو کر گئے ۔

کراچی کی ایک مشہور و معروف شخصیت ۔ عمر تقریباً اسی نوے سال ۔ کان سے اونچا سننے کی شکایت لے کر ادھر بھی پہنچے ۔ قوت سماعت تو خیر بہتر ہی ہوئی اس محبت کے رشتے میں بھی منسلک ہوئے جہاں ایک مومن دوسرے مومن کے ایمان کی تائید کرتا ہے ۔

کراچی سے ایک نوجوان بلڈ کینسر میں مبتلا آئے ۔ ان کی جوانی پہ سب کو ہی ترس آتا تھا ۔ قبلہ نے دوا بھی دی اور ان کی تسلی کے لئے ایک فقیر صاحب سے دعا بھی کرائی ۔ وہ صحت یاب ہوئے اور اس کا تذکرہ قبلہ کے ایک عزیز سے کرنے لگے ۔ جنہوں نے اُس وقت اس حیرت انگیز بات پر یقین کرنے سے اجتناب کیا لیکن بعد میں یہاں کے دوسرے حالات دیکھ کر اب اسے دوسرے انداز میں لیا کہ فقیر کے لئے یہ معمولی بات ہے ۔

بلڈ کینسر (لیکومیا) کے مرض میں گرفتار ایک ہوائی فوج کے افسر کا بچہ،

ڈاکٹری علاج سے ناامیدی کا سرٹیفکیٹ لے کر بالآخر ادھر علاج کے لئے لایا گیا اور بفضلِ خدا شفایاب ہوا۔

ایک نوجوان تقریباً نابینا لڑکی جسے سورج بھی صرف چاند کی طرح نظر آتا تھا لائی گئی جس حال میں پیش کی گئی وہ دہل ہلا دینے کو کافی تھا۔ قبلہ نے ایک پُڑیا دی۔ دوسرے اتوار وہ قدموں میں آکر گر پڑی کہ اب مجھے نظر آتا ہے۔

ایک نئی بیاہتا لڑکی اپنے بچہ کو گود میں اٹھا کر لائی۔ ڈاکٹروں نے دل میں پنکچر بتایا تھا اور دس پندرہ دن بچہ کی زندگی کو دیئے تھے۔ اس ماتا بھری ماں کے وہ آنسو دیکھ کر قبلہ نے دوا دی۔ چند دن میں وہ مسکراتی ہوئی بچہ کو لے کر آئی۔ پھر ایک ماہ بعد، ماں باپ دونوں مل کر آئے اور بچوں کا نام رکھوا کر گئے۔ اب وہ بچی اُس دل کے عارضہ سے ٹھیک ہو چکی ہے۔

۱۹۷۰ء میں پھر یونیورسٹی والوں کو یہ بات پسند نہ آئی کہ قبلہ کے پاس ہفتہ وار لوگوں کا مجمع ہوتا ہے۔ چنانچہ ایک انکوائری کمیٹی کے سپرد یہ کام کیا گیا کہ معلوم کریں۔ یہ ڈھونگ کیا ہے۔ روپیہ پیسہ بٹورنے کا یہ کیا ذریعہ بنایا ہوا ہے جب کچھ نہ ملا تو یہاں آنے والے معذور لوگوں کے پیچھے ہی لگ گئے کہ یہاں کی سیکورٹی کو خطرہ ہے۔ ہر قسم کے لوگ ادھر آتے ہیں۔ ایک اصحاب بابا والے معذور ضعیف سے کہا۔ تم یہاں کیوں بیٹھے ہو۔ انہوں نے عرض کی یہ ہمارا گھر ہے اس پر انہیں کہا گیا کہ یہ یونیورسٹی کی جگہ ہے۔ تم یہاں سے چلے جاؤ۔ ہم پھر آئیں گے اس پر ان ضعیف بزرگ نے کہا۔ دیکھو یہ مت کرو۔ ہمیں جو بھگاتا ہے۔ ہم اسے اڑا دیتے ہیں چنانچہ اگلے ہفتہ یہ دنیادار ایسے دنیوی قصوں میں پھنس گئے۔

کہ پھر نہ آ سکے۔

ایک صاحب جو قبلہ کو برسوں بُرا کہتے ۔ گالیاں تک دیتے ۔ یہ خدمتِ خلق کا سلسلہ انہیں پتہ نہیں کس لئے ستاتا تھا ۔ اس تمام خدمت کو ایک ڈھونگ تصور کرتے ۔ یوں زبانی خدمتِ خلق، خلوص، سچائی، عمل، زہد، تقویٰ پر کافی بولتے۔ پھر خود جب زبان کے کینسر میں مبتلا ہوئے اور ڈاکٹری علاج سے صحت یاب نہ ہوئے بالآخر قبلہ کے پاس پہنچے اور صحت حاصل کی ۔ پھر دوبارہ انہیں تھروٹ کینسر ہوا آواز بھی جاتی رہی ۔ ڈاکٹری علاج سب کر لئے ۔ قبلہ کے پاس پہنچے اور اس بار بھی ناممکن العلاج مرض سے تھوڑے سے دنوں میں صحت یاب ہوئے ۔ ؎

سلام! اُس پر کہ جس نے گالیاں کھا کر دعائیں دیں

علی گڑھ کے ایک پُرانے ساتھی، لندن سے بیمار آئے تھے ۔ کراچی یونیورسٹی میں ملازم تھے ۔ پشاور پہنچے ۔ کیفیت بتائی ۔ قبلہ نے صرف ایک پڑیا دی کہ یہ کافی ہے وہ سمجھے کہ شاید تمسخر رہے ہیں ۔ قبلہ نے فرمایا، اس کے ساتھ امر بھی شامل ہے ۔ تھے صوفی منش ۔ کراچی چلے گئے ۔ کچھ دن میں ٹھیک ہو گئے ۔ پھر تین ماہ بعد خاص اسی مقصد سے ملاقات کے لئے آئے کہ احوال بتائیں ۔ قبلہ سے کہا کہ میں نے ایک شرارت کی ۔ دوا نہیں کھائی ۔ نہ کوئی اور دوا لی ۔ البتہ دوا کے ساتھ والی چیز یعنی "امر" استعمال کر لی اور ٹھیک ہو گیا ۔ قبلہ نے فرمایا ۔ ٹھیک ہو گئے ہو تو ٹھیک ہے ۔

ایک ڈاکٹر کرنل معہ اپنی بیگم کے، علاج کے لئے پہنچے ۔ قبلہ نے دونوں کو دوائیں دیں ۔ بیگم نے غلطی سے کرنل صاحب والی دوا کھا لی اور کرنل صاحب اپنی پڑیا پہلے تو کھانے کو ٹالتے رہے پھر جب بیگم کو دیکھا کہ ٹھیک ہو گئی ہیں تو کرنل صاحب

نے بھی وہ پڑیا جو بیگم کے لئے تھی اپنی سمجھ کر کھا ڈالی ۔ پندرہ دن بعد دونوں قبلہ کے پاس پہنچے کہ میں بھی ٹھیک ہو گیا ، یہ بھی ٹھیک ہو گئیں ۔

ایک دواؤں اور اناٹمی کے ماہر قبلہ کے گھر پیدل چلے آ رہے تھے ۔ ان کی چال دیکھ کر ہی قبلہ اندر گئے ۔ ایک پڑیا دوا ان کے لئے لے آئے ۔ ان کے ہاتھ میں جب وہ پڑیا دی گئی تو وہ اوپر نیچے دیکھتے رہے کہ یہ آخر کیسے ۔ بالآخر صحت یاب ہونے پر قائل ہوئے کہ ہومیوپیتھی میں سمپٹم یعنی علامات پر کیوں زور دیتے ہیں اس ضمن میں یہ بیان کر دینا مناسب ہوگا کہ قبلہ نے میٹریا میڈیکا ، اناٹمی اور متعلقہ علوم بہت ہی انہماک سے پڑھے ہیں اور حافظہ اتنا عمدہ ہے کہ اناٹمی کے سارے ٹرم اور عارضوں کے تقریباً سارے نام یاد ہیں ۔ اسی لئے اپنی جانب سے ہمیشہ یہ کوشش کرتے ہیں کہ کتابی معلومات کے مطابق دوائیں تجویز کریں ۔ لیکن خصوصی موقعوں پر یہ دیکھنے میں بھی آیا ہے کہ مریض سامنے آیا اور اس کی دوا جیسے ان پر فوری طور پر روشن ہو گئی اسی لئے اتوار کے دن جس زمانے میں سینکڑوں مریضوں کو دیکھا کرتے تھے تو فوری نسخے تجویز کرتے جاتے تھے ساتھ میں دو ایک لوگ نسخے لکھ لکھ کر لوگوں کو بانٹتے جاتے تھے اور آنے والے اس پر شاکر رہتے تھے کہ جو دوا فقیر نے تجویز کی ہے ، وہ بغیر اثر کے نہ ہوگی ۔

۶۹ء میں پنڈی میں ایک شام کچھ ساتھیوں کے ساتھ قبلہ مشغولِ گفتگو تھے ۔ ان میں سے ایک صاحب کے لئے لاہور سے ٹیلیفون آیا کہ آپ کا دوست بہت بیمار ہے کینسر ہے ۔ ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے کہ ایک ہفتہ میں مر جائے گا ۔ قبلہ نے یہ بات سنی فرمایا ۔ "فون کرنے والے کو کہہ دو کہ ٹھیک ہو جائے گا" ۔ چنانچہ یہ بات فون پر کہہ دی گئی اور وہ صاحب ٹھیک ہو گئے ۔

پشاور میں ایک صاحب کی بیگم کو خون کے کینسر کا عارضہ بتایا گیا۔ وہ زنانہ مرض میں گرفتار تھیں۔ قادر نگر، تیمر گرہ سوات میں قبلہ اُس زمانے میں تھے۔ ایک عزیز دوست نے منت سماجت کی کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ قبلہ نے آنکھیں بند کر لیں۔ پھر فرمایا، لوکلائزڈ کر دیا ہے ٹھیک ہو جائیں گی۔ چنانچہ جب ان محترمہ کے اپریشن کا زمانہ آیا تو ڈاکٹری رپورٹ یہی تھی اور آج وہ بخیر و عافیت ہیں۔

ایک محترمہ کو ۱۹۶۵ء میں میگرین تھا۔ قبلہ نے ان کے سر پہ ہاتھ رکھ دیا اور انہیں اس موذی مرض سے نجات مل گئی۔

ایک محترمہ دائمی مریضہ۔ عرصہ تک بیمار رہیں۔ قبلہ انہیں جب بھی دیکھتے تسلی تشفی دیتے۔ ان کے انتقال کے وقت سے کچھ عرصہ قبل تک قبلہ نے ان کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اس موت و زیست کی کشمکش میں انہیں قلبی سکون مل چکا تھا اور بالآخر بغداد شریف میں انتقال ہوا۔

پی۔ ڈبلیو۔ ڈی کے ایک صاحب کے ۸، ۹ سال شادی کے بعد تک کوئی اولاد نہ تھی۔ قبلہ کی شہرت سُن کر پہنچے۔ قبلہ نے ان پر سرسری نظر ڈالی دو پڑیاں دلوائیں ایک ان کے لئے ایک بیوی کے لئے۔ ان کے ایک دوست نے جو موجود تھے کہہ بھی دیا کہ بچہ ہونے کے چھ ماہ کے اندر اندر شکریہ کے لئے آنا۔ ان صاحب نے بُرا بھلا کہا کہ یہ کوئی ڈاکٹری ہے کہ ایک سیکنڈ دیکھا دوا دے دی اور پھر دوسرے مریضوں سے مخاطب ہو گئے۔ ساتھی نے جیسے تیسے کر کے دوسری صبح ان دونوں کو دوا کھلا دی۔ میعاد مقررہ کے بعد بچہ پیدا ہوا۔ ان کا خط بھی اپنے دوست کے نام آیا کہ لڑکا ہوا ہے۔ انہیں پھر یاد دلایا گیا کہ بچہ کی چھ ماہ کی عمر سے پہلے ادھر قبلہ کے سامنے لانا۔ افسوس ہے کہ

انہوں نے کوئی توجہ نہ دی ۔ پھر ان کا خط اپنے دوست کے نام آیا تھا کہ لڑکا مر گیا

ایک محترمہ کے چودہ سال شادی کے بعد بھی بچہ نہیں ہوا انہیں گیارہ سال سے درّانی صاحب کی تلاش تھی ۔ ان کے خاوند ہومیو پیتھی کے قائل نہ تھے اور ڈاکٹر بھی یہی کہتے تھے کہ پڑھی لکھی ہو ۔ بیوقوف نہ بنو ۔ مگر جب دل کی لگی ہو تو قسمت کے لکھے کو کون روک سکتا ہے ۔ انہیں بچی حال میں دوا عطا ہوئی ہے ۔

ایک فوجی کرنل کی بیگم ، ایک مشہور لیڈی ڈاکٹر کے عرصہ سے زیر علاج ہیں ۔ درّانی صاحب کا انہوں نے سُن رکھا تھا ۔ تین سال پشاور رہ کر بھی آنے کا موقع نہ مل سکا ۔ بالآخر یہاں پہنچیں اور صحت یاب ہوئیں ۔

ایک تھیراپی کے ڈاکٹر اپنے بچوں کا علاج ہومیو پیتھی قبلہ سے ہی کروانے اکثر آتے ہیں ۔ اگرچہ ڈاکٹر اس کی مخالفت کرتے ہیں ۔

ایک اعلیٰ افسر جو اپنی دیانت صداقت میں مشہور ہیں ۔ قبلہ سے پوچھنے لگے کہ آپ چھٹیوں میں بیرِ بابا جا رہے ہیں تو آپ کے پیچھے اس ہفتہ وار دوا دارو کے سلسلہ کا کیا ہو گا ۔ قبلہ نے فرمایا کہ یہ میرا ڈیرا نہیں ہے ، نہ ان لوگوں کا ہے جو اس گھر میں رہتے ہیں ۔ یہ بات ذہن سے نکال دیں ۔ یہ چلتا رہے گا ۔ جس کا ہے وہ چلاتا رہے گا ۔ یہ سُن کر اُن صاحب کی آنکھوں میں آنسو آگئے ۔ امت کا درد اور حق پر بھروسہ بھی کیا چیز ہے ۔

دوائیوں کے بہانے بہت کچھ ہوتا ہے ۔ ایک چودہ پندرہ سال کا لڑکا جس کا دماغی توازن ٹھیک نہیں ، لایا گیا ۔ گھر والے اس کو سنبھال بھی نہ سکتے تھے ۔ اس کو قبلہ نے پیار اور محبت سے اپنایا ۔ اس کے لئے کہہ دیا کہ اتوار کو آیا کریں اور انہیں دو پیالی

چائے پلا کر دو۔ اب وہ تقریباً پورے ہفتہ سکون سے رہتا ہے۔ اگلے اتوار کے آنے کا انتظار کرتا ہے اور جب قبلہ کے پاس پہنچتا ہے تو دُور سے ہی آواز لگانا شروع کرتا ہے "نانا ابا چائے"۔

ایک لڑکی پنجاب کے گاؤں سے لائی گئی۔ اس کے لئے مشہور تھا کہ اس پر جن آتے ہیں۔ قبلہ سے عرض کی گئی فرمایا جب یہ دورہ پڑے تو مجھے اس کے پاس لے جانا۔ قریب ہی گھر تھا۔ دورہ ایک دن پڑا۔ قبلہ گئے مگر ساتھ ہی دو ایک غیر لوگ بھی تماشہ دیکھنے لگ گئے اس لئے کچھ نہ ہوا۔ اب لڑکی کے متعلقین دوسرے دورہ کا انتظار کرتے رہے کہ ایسے وقت پر کیسے ہو کہ قبلہ بھی مل سکیں۔ ایک اور بزرگ کرم فرما نے بتا دیا کہ یہ کیا مشکل ہے چند مرچیں دے دیں۔ کہا قبلہ کی موجودگی کے کسی مناسب وقت پر لڑکی کے ہاتھ سے یہ مرچیں آگ میں ڈال دو۔ ایسا کیا گیا۔ لڑکی پر دورہ پڑا۔ قبلہ کو اطلاع کر کے ساتھ لائے۔ لڑکی نے قبلہ کو دیکھتے ہی پیچھے ہٹنا شروع کیا۔ قبلہ نے بہت پیار محبت سے کہا "ہم تو شاہ جی کے پجاری ہیں۔ کوئی جھگڑا نہیں یہ ہماری بچی ہے۔ آج چاند کی یہ تاریخ ہے۔ فلاں تاریخ کے بعد کوئی تکلیف نہ ہو۔ جس وقت قبلہ یہ الفاظ کہہ رہے تھے ان میں اتنی گہرائی تھی کہ جیسے قدرت کی قوتوں کے ساتھ یہ بات کہی جا رہی ہو اور اتنی جان کے ساتھ کہ بہت بھاری درخت بھی اس حکم پر جھکنے لگے۔ قبلہ کا یہ کہنا تھا کہ وہ لڑکی ٹھیک ہو گئی ——— اور گھر والوں سے ہنسنے بولنے لگی۔ اس کے بعد اس پر کوئی دورہ نہ پڑا اور آج برسوں بعد وہ ہنسی خوشی شادی شدہ زندگی گزار رہی ہے۔

ہوائی فوج کے افسر کی عزیزہ زوجہ زنانہ مرض کے ٹیومر کے اپریشن میں انتقال کر گئیں عرصہ بعد دوسری شادی ہوئی تو ان کو بھی اسی قسم کا ٹیومر ہوا۔ لیڈی ڈاکٹر،

اسپیشلسٹ، بڑے ڈاکٹروں نے، سب نے مل کر کہا آپریشن کی فوری ضرورت ہے
قبلہ کے پاس وہ لوگ آئے، قبلہ نے فرمایا علاج ہو جائے گا۔ جب آپریشن کرانے سے
انکاری ہوئے تو ماہر ڈاکٹروں نے کہا، سمجھدار ہو کر کیوں بیوقوفی کرتے ہو۔ الٹے سیدھے
علاجوں میں پڑتے ہو۔ دُرّانی صاحب کو ہم بھی جانتے ہیں مگر اس ٹیومر کا علاج نہیں، سوائے
اس کے کہ فوری آپریشن ہو۔ یہ لوگ پھر پریشان ہو کر قبلہ کے پاس پہنچے۔ ماجرا سنایا۔
قبلہ نے فرمایا دیکھو، جو کیس آپریشن کا ہوتا ہے وہ میں خود بتا دیتا ہوں مجھے ایک ہفتہ
تو دو۔ ڈاکٹروں کو کہنے دو۔ علاج ہو جائے گا۔ چنانچہ دوا دے دی۔ صرف دو ہفتہ
دوا لینے کے بعد ان محترمہ نے کراچی کی ٹاپ اسپیشلسٹ لیڈی ڈاکٹر کو دوبارہ دکھایا
ایک اور لیڈی ڈاکٹر کو کراچی میں ہی احتیاطاً پھر سے دکھایا دونوں نے کہا پہلے اگر ٹیومر
ہوگا تو شاید اب تو قطعی نہیں ہے۔

ایک افسر کو شائی ٹیکا کا عارضہ تھا۔ چھ ماہ سی۔ ایم۔ ایچ میں زیرِ علاج رہے۔
پریذیڈنٹ کے فزیشن کا بھی علاج رہا۔ افاقہ نہ ہوتا تھا۔ قبلہ سے عرض کرایا۔ قبلہ نے
دوا دی اور وہ صحت یاب ہوئے۔ اس کے بعد سے برسوں سے صحت مند ہیں۔ کبھی
وہ تکلیف نہیں ہوئی۔ ان ہی کے ایک بچے کے ناک اور آنکھ میں بچپن میں تکلیف تھی
آنکھوں کے مشہور اسپیشلسٹ کے بھی بچہ زیرِ علاج رہا۔ مرض کم ہو جاتا اور دوبارہ
عود کر آتا۔ اس طرح چند سال گزرے۔ قبلہ کو لا کر بچہ کو دکھایا۔ صرف دو پڑیاں دیں
بچہ ٹھیک ہو گیا اور عرصہ سے ٹھیک ہے۔

ایک افسر کی بچی کے جسم پر چھلّے کے سے نشان پڑ جاتے اور دمہ کی شکایت بھی ہو
جاتی۔ ڈاکٹروں کے علاج ہوتے رہے۔ آکسیجن تک میں رکھنا پڑا۔ وہ تکلیف اب نہ

جب ہو جاتی ۔ قبلہ کو دکھایا ۔ دو پڑیاں دیں اور فرمایا اب اور کوئی دوا نہ دینا ۔ وہ بچی ان دو پڑیوں سے صحت یاب ہوئی ۔ اب دس سال کی ہے ۔ کبھی کوئی تکلیف دوبارہ نہ ہوئی

ایک صاحب کی بچی بیس دن سے اسہال میں مبتلا تھی ۔ ڈاکٹری علاج کرتے رہے افاقہ نہ ہوتا تھا ۔ ایک دن سر راہ قبلہ سے عرض کر دی ۔ قبلہ نے چلتے چلتے درود شریف الحمد شریف پڑھ کر پانی پر پھونک کر پلانے کو کہہ دیا ۔ ان صاحب نے رات کو ایسا ہی کیا ۔ اس رات کے بعد سے بچی کے اسہال بند ہو گئے ۔

انفرادی علاج معالجہ کے بہت سے واقعات ایسے ہوں گے جن کی گواہی وہ لوگ خود دے رہے ہوں گے ۔ اجتماعی انداز یہ بھی نظروں سے گزرا کہ ایک زمانہ میں ٹی بی کے مریض آتے تو قبلہ فرماتے کہ ٹی بی نہیں برانکائیٹس ہے اور واقعی یہ صورت پیدا ہو جاتی کہ وہ کیس بھی جو یقیناً ٹی بی کے تھے برانکائیٹس کی صورت اختیار کر لیتے اور ان کا علاج کر دیا جاتا ۔ دو ایک دفعہ تو لوگوں کے بحث کرنے پر کہ یہ تو یقیناً ٹی بی کا عارضہ ہے قبلہ نے یہ تک کہہ دیا کہ میں اپنی ساری ہنر مندی اور ہومیوپیتھی سے واقفیت کے بل بوتے پر یہ کہتا ہوں کہ میں غلط نہیں ۔ حالانکہ بعض کیسوں میں ایک پھیپھڑا بالکل کام نہیں کر رہا تھا ۔

اسی طرح ایک دور یہ گزرا کہ دل ٹھیک ٹھاک ہے ۔ یہ سب گیسوں کا عارضہ ہے یا یہ کہہ دیتے کہ یہ تیزابیت ہے ۔ اور اسی کا علاج کر کے مریض کو ٹھیک کر دیا جاتا ۔ اب اس قسم کی بڑے بھروسہ سے کسی بات کے کہہ دینے سے ایک طرف تو مریض کو تسلی ملنے کا ذریعہ ہوتا ۔ دوسری طرف قبلہ یہ سبق دے رہے تھے کہ بجائے منفی انداز کے مثبت انداز برتنا ۔ زندگی کو خوش آئند بنانے کی ضمانت کا ذریعہ ہوتا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ جیسا سوچو گے ویسا ہی ہو جائے گا ۔ یہ اپنے بھروسے ، ایمان اور خود اعتمادی کی

بات ہے اب اسے کرامت کہہ لیں یا پیشہ ورانہ کمال یا خود اعتمادی، خدا اعتمادی کہ ایسے سخت نازک کیسوں کا بھی علاج ایسی سادگی سے کر دیا گیا کہ جیسے یہ سب معمولی سی بیماریاں تھیں ۔ انسان اشرف المخلوق ہے ، اس کو بیماریوں کے چھوٹے چھوٹے سے کیڑے کیسے نقصان پہنچا سکتے ہیں ۔

اس دوائی والے دن ، اتوار کو کوئی آنکھیں کھول کر کھڑا ہو جائے تو تماشہ دیکھے کہ مریضوں میں ہر طرح کی خلقت آتی ہے ۔ غریب ، امیر، چھوٹے ، بڑے ، بیمار ، صحت مند ، تسلی و تشفی کے طالب ، دیدار کے طالب ، حق کے طالب ، دنیا کے طالب ، ان میں انسان بھی ہوتے ہیں ، اجنا بھی ۔ ان میں وہ بھی ہوتے ہیں جن کے دل عاجز ہیں چوٹ کھائے ہوئے ہیں ۔ وہ بھی ہوتے ہیں جو ازلی روحانی تڑپ رکھتے ہیں اور وہ بھی جو نسلوں سے روحانی عارضہ میں گرفتار ہیں ۔ الغرض سب ہی اس دریائے فیضان سے سیراب ہوتے ہیں ۔ دیدار کی مجال تو کسے ۔ انسان دوسرے آئینہ میں اپنی نگاہ کے مطابق ہی دیکھ سکتا ہے اور پردہ در پردہ کوئی ظہور ہو تو کسی کی نظر ان پردوں کے پار کیسے پہنچے ۔ البتہ یہ تو ممکن ہے کہ فقیر کی نظرِ کرم ، ان لوگوں پر پڑ جائے ۔ ان کے باطن کے اندھیرے دور ہوں ۔ یہ نظرِ رحمت ، اسی نورِ محمدیؐ کی روشنی ہے جو وسع کُلَّ شیئٍ ہے اور جو خود بخود فقیر کی آنکھوں سے محبت کی چشموں کی صورت میں پھوٹ رہی ہوتی ہے ۔ فقیر کے جسم تک جن کی نگاہ رہی وہ تو اسی جسم تک اُلجھے رہے اور جو نظروں کے پیاسے ہیں ان کے لئے مازاغ البصر ۔ یا پیا ملن کی آس ۔ یہ آس ہی حیاتِ روح کا سہارا ہے ۔ یہی دیدار کی تڑپ ہے ۔ ایک بار یوم ازل دیکھا ہے ۔ دوبارہ دیکھنے کی تڑپ ہے ۔ یہی تڑپ ، حیاتِ روح کا سرمایہ ہے ۔ یہی تڑپ اس زندگی کا انجام ہے ۔ یہی اس زندگی

کی نشانی ۔ یہ تڑپ ختم تو زندگی ختم ، حیاتِ روح ختم ۔ روشنیٔ ظہور ختم ۔

ہومیوپیتھی ، علاج بالمثل ہے ۔ جیسی مرض کی علامت ویسی مثالی علامت والی دوا ۔ رشتۂ حیات کو ایک ارتعاشی کیفیت دے کر ، توازنِ حیات پر لے آنا ۔ اور اس ہومیوپیتھی کے پیچھے اللہ پیتھی ۔ تیرے ہاتھ میں ہے فنا بقا ، خواہ ہڈیاں گل گئی ہوں ۔ جیسا چاہا جیسا بنا دیا ۔ کسی کو دیدار سے تشفی دی ۔ کسی کو آنکھوں کی مسکراہٹ سے تازگی بخشی ۔ کسی گرتے کو سہارا دے کر ، بھروسہ اور ایمان بخش دیا ۔ کسی شکستہ دل نے سکون کی تلاش مانگی تو خلقت کے آنسو پونچھنے میں ، اس کی محبت کو وسعتوں میں پھیلا دیا ۔ قلب میں کوئی چراغ روشن دیکھا تو اسے اور فروزاں کر دیا ۔ کہیں عشق کی چنگاری دیکھی تو اسے بھڑکا کر گلزارِ ابراہیمؑ بنا دیا ۔ کہیں روح کی کلی کھلتی دیکھی تو اسے کیفِ انبساط میں شگفتہ گل بنا دیا ۔ کہیں نافۂ ذات کی مشک و بو پائی تو اس کی خوشبوئے لطیف کو سات طبق اندر اور چودہ طبق اوپر پھیلا دیا ۔

باب ۱ توحیدِ فکر

اپنے طور طریق، اپنے اصل اصول کے مطابق اگر یہ دنیا چل رہی ہوتی تو یورپ والے سب سے زیادہ حق رسیدہ ہونے چاہیئے تھے کہ انہوں نے اپنی عقل کی معراج حاصل کر کے، سوسائٹی کے نظام کو ایک تہذیب میں رنگ کر اپنے نزدیک ایک مثالی معاشرہ بنایا ہے۔ حقیقت اس معاشرے کی اب خود ان پر ظاہر ہو رہی ہے اور وہ خود اس سے تنگ آ کر اس سے نبرد آزما ہیں۔ یہی کچھ اپنے معاشرے اور عوام کا حال ہے کہ ایک ڈھب پر زندگی گزارتے ہوئے انہیں یہی سب سے بہتر زندگی معلوم ہو رہی ہے۔ حالانکہ ایک سطحی عقل رکھنے والا بھی اس بے جان نظام کو بے کیفی سے دیکھے گا۔ اس نظام میں سوائے تن آسانی، نفانفسی، خود غرضی، بے اعتنائی خود ستائی خود پرستی کے رکھا کیا ہے۔ اپنا حال یہ ہے اور جانچتے، اپنی میزان سے ان ہستیوں کو جن کی سطحی جسمانی زندگی تک ان دنیا کے ٹھیکیداروں سے کہیں زیادہ پُرخلوص، پُرحیا پُرصداقت طور پر گزر رہی ہے۔ خدا بچائے رکھے ہمیں اس تخیل سے کہ جس کے تحت اپنے سے بہتر کوئی دوسرا انسان نظر میں ہی نہیں جچتا اور عطا کرے وہ محبت بھری آنکھ کہ اپنا سب کچھ دوسرے پر قربان کر دینے کو دل چاہے۔

ہر زمانے کے فقراء کا رنگ نرالا، ان کی پہچان، ان تک رسائی بس عاجزی یا محبت کے انداز میں ہو سکتی ہے۔ جب فقیر، ظاہر میں بھی اپنی شان پہ آ جائے تو اس کی توصیف آسان ہو جاتی ہے یا پھر پردہ کر لینے کے بعد دوسرے زمانے کے لوگوں کو یہ ظاہر کا حجاب درمیان سے اٹھ جانے پر کچھ اس کی خوبیوں اور لطافتوں تک رسائی ہو جاتی

خاموشم و گویانم چوں خط بہ کتاب اندر

ہے مگر جو فقیر زندگی میں اپنے گرد حجاب در حجاب کرلے، کیونکہ حُسن کا بھی یہی تقاضہ ہے کہ جتنا حسین اتنے ہی پردوں میں، پھر اس تک پہنچ کی ایک ہی صورت رہ جاتی ہے اور وہ ہے باطن کی گہرائیوں میں۔ نورِ پنہاں کو اپنے قلب کے آئینہ میں ہی دیکھا جاسکتا ہے قلب کی صفائی اور جلا کا ذریعہ محبت ہے اور محبت ہر چیز کی قدر ہی دیکھتی ہے محجوب ہیں۔ ایک ہی نورِ دو عالم کی جھلکیاں ہیں جو ان اجسامِ نور کے ذریعہ دنیا کے لوگوں تک پہنچتی رہتی ہیں۔ یہ قسمتوں کی بات ہے کہ کون اس نورِ محمدی سے مستفیض ہو اور کس کی آنکھیں بند رہیں۔ بجلی کہاں گرتی ہے کس پر گرتی ہے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ اتنا ضرور ہے کہ زمانہ کبھی فقراء سے خالی نہیں رہتا۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی گزرے ہیں تو ہر زمانے میں کم از کم ایک ولی ضرور موجود ہوتا ہے جو ان میں سے کسی نہ کسی کا رنگ لئے ہو اور بعض نبیوں خصوصاً حضور اکرمؐ کے رنگ پر تو ہزاروں لاکھوں ایک وقت میں موجود ہوتے ہیں۔ جب آسمانِ کائنات ان لاکھوں ستاروں سے جگمگا رہا ہو اور ہر زمانہ میں یہ لاکھوں ستارے موجود ہوں تو نورِ نبوت، نورِ محمدی کا فقدان زمانے میں کیسے رہ سکتا ہے۔ ایک سیلابِ نور زمانے میں موجود ہوتا ہے۔ یہ اپنی چاہ، طلب اور دُھن کی بات ہے کہ اس نور کا دامن ہاتھ آجائے۔ فرد کی حد تک فقیر کا کام اور مشن یہ ہے کہ طالب کے باطن میں وہ فطری صلاحیتیں بیدار کرے جو اس کے ارتقائے باطن، روحانی ارتقاء کے لئے، قدرت نے اس میں ودیعت کی ہیں۔ ارتقائے روحانی ہی فقیر کا سب سے بڑا احسان ہے عالمِ انسانیت پر۔ یہاں کُن بہ امرِ ربّی کی کارفرمائی ہے۔ مقامِ روح پر طالب کو سنبھال لینا ایک غواص ذات کا ہی کام ہے اور یہی خدمتِ خلق کے لئے رحمت اللعالمین کا حقیقی پرتو ہے ورنہ واصل بالذات ہو کر، اپنی مستی میں کسی کو یہ فکر کہاں رہتی ہے کہ دوسروں کی بھی فکر

کرے۔ فقیر نسبتِ محمدی کے طفیل، اپنی ہستی سے گزر چکا ہوتا ہے۔ وہ آمنا بے نفس ہو چکا ہوتا ہے کہ اسے سوائے اُمتی اُمتی کے دوسری فکر نہیں رہتی۔ اسی لئے باطن کی اصلاح کرکے، فرد کو اپنی ذاتی خود غرضیوں، آرزوؤں، تمناؤں سے ہٹا کر، جمیع خلق کی جانب رجوع کر دیتا ہے۔ جمیعت کا درد، خلوص، خدمت، جمیعت کے لئے آنسو بہانا، زندگی وقف کر دینا، جان تک دے دینا اس کا وطیرہ بن چکا ہوتا ہے۔ کمالِ انسانیت ہی یہ ہے کہ من حیث الجمیعت، گروہ کے گروہ، اللہ کی جانب اس طرح رجوع ہوں کہ دل بہ یار دست بہ کار۔ اُدھر اللہ سے واصل ادھر مخلوق میں شامل۔ اس طرح مرضیٔ امرِ الٰہی کے اجراء کا میدان یہی خلق ہے۔ اس خلق سے فقیر رابطہ کیسے توڑے۔ اس سطح سے شرعِ محمدی کا پابندی اور عالمِ خلق میں نشرِ حق ان فقرائے باطن کا ہی ذمہ ہے۔ یوں عام انسان اپنی زندگی میں ظاہر کا کوئی عمل کتنی ہی محنت اور مشقت سے کرے پھر بھی سطحی رہ جاتا ہے جب تک کہ اس کا تعلق قلب و روح کی سطح پر قائم ہو کر دائم نہ ہو جائے۔ اور جو چیز قلب و روح کی گہرائیوں تک اثر پذیر ہو سکے وہ عشق ہی ہے۔ عشق و محبت ہی خلوص، وفا، قربانی کا جذبہ قائم کراتے ہوئے نفس کی خود غرضیوں، خود طلبیوں سے نکال کر، انسان میں حسد، بغض، کینہ ہوس وغیرہ کی ظلمتیں ختم کراتا ہے۔ پھر ان کی جگہ خلوص، صداقت، وفا، خدمت، محبت، قربانی کا جذبہ ابھرتا ہے۔

اب کہیں انسان باشعور، تہذیب یافتہ، باشرع کہلانے کا مستحق ہو سکتا ہے۔ بغیر قلب کے دھوبی گھاٹ پر نفس کے گندے کپڑے صاف کئے۔ طہارت اور پاکی کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ تقویٰ کہاں عطا ہو سکتا ہے اور اُس قدوسیت سے، جس کو دوام ہے، رابطہ قائم کہاں ہو سکتا ہے۔ دوسرے معنوں میں حیاتِ قلب و روح کہاں عطا ہو سکتی ہے

طالب دنیا فقیر سے چاہتا ہے کہ اس کے نفس اور دنیاوی ضروریات کی ساری خواہشوں کو پورا کرے۔ دعا دے، کرامت دکھائے اور جب یہ حاصل ہو چکا ہوتا ہے تو پھر طالب کو یہ فکر ہوتی ہے کہ روحانی طاقتیں ملیں۔ خلافتیں عطا ہوں۔ انوار و تجلّیات دیکھے۔ مقام و منصب عطا ہو۔ الغرض طالب الجھ الجھ کر نفس کے چکروں اور بھنوروں میں گرفتار ہوتا رہتا ہے اور غوّاصِ حقیقت اسے ان طوفانوں سے نکال کر لطافتوں اور حقیقتوں کے سمندروں کی طرف رجوع کرتا ہے کہ یہ پانی کا قطرہ موتی بن کر کچھ دنیا کے کام آئے۔ یا بارانِ رحمت بن کر کشت زارِ انسانیت پر برسے۔ یا پھر خود اس کی طرح عشقِ امت میں جل جل کر خود بھی شمع سوزاں بن جائے۔ اور زمانے کو بھی منوّر کر دے۔

انفرادی سطح پر قبلہ نے یہی کیا کہ ہر فرد کی باطنی خوبیوں پر ہی نظر رکھی۔ کسی نہ کسی سطح کا حُسنِ کردار ہر شخص میں ہوتا ہے۔ خواہ وہ سطحی طور پر کتنا ہی بُرا نظر آ رہا ہو۔ قبلہ نے تقریباً ہر فرد کے ساتھ یہی کوشش کی کہ اس میں ایک خود اعتمادی، خدا اعتمادی سی پیدا کر کے اُس کو دنیوی جنجالوں سے نکال کر خلقت کے گلزار میں پھیلا دیں۔ عوام کے لئے سب سے آسان طریقہ خدمتِ خلق کے ذریعہ حق تک رسائی کا تھا۔ اس جانب انہیں رجوع کیا اور اس طرح ان کے حُسنِ باطن، ان کی اعلیٰ اقدار کو نکھارا۔ باطن کی راہ کھلنے کا سیدھا سا طریقہ، تھوڑا سا نور ڈال دینے کا ہے۔ پھر تاریکیاں خود غائب ہو جاتی ہیں عشق کی چنگاری ڈال دیں، آگ خود بھڑک اٹھتی ہے۔ یہ چنگاری ذکر بہ امر اللہ ہے۔ رانجھا رانجھا کہتے میں آپ ہی رانجھا ہوئی۔ یہ ذکر خفی ہے اپنے سے بھی خفا ہیں۔ یہ ذکر روح کی سطح پر عطا ہوتا ہے اور جو عطا ہو وہ بغیر شیخ کے حکم کے واپس بھی نہیں لیا جا سکتا۔ یہ عطا کیا ہے، سوائے اس کے کہ شیخ خود اپنے کو عطا کرتا ہے یہ اپنی مرضی سے عطا بھی نہیں کیا جاتا، سوائے حکمِ حق کے۔ پھر رُوح میں جب یہ "کُن" ہو گیا

تو اپنی منزل الیہ راجعون پر گامزن ہو گئے۔ اس ذکر کو حیا کے پسینے سے سینچنا ہوتا ہے سینچتے سینچتے جب سینہ سمندر ہو جائے تو ذاکر خود مذکور ہو جاتا ہے۔ الا اللہ کی نمود۔ فاذکرونی اذکرکم۔ اس کے بعد محمد رسول اللہ۔ اس ذکر کی تصدیق حاصل کر رہا ہوتا ہے۔ ورفعنا لک ذکرک۔

خواص کی سطح پر قبلہ کی یہی کوشش رہی کہ فقراء میں ایک توحیدِ فکر قائم کرائی جائے اپنی اپنی منازل، اپنے اپنے عروج، اپنے اپنے مقامات کی فکر سے کہیں زیادہ ضرورت اور اہمیت اس بات کی ہے کہ معراج والی تڑپ، امتی امتی فقراء میں عام کی جائے تاکہ اس امتِ بدنصیب کے دن پھریں۔ اس کے لئے عالمِ مثال سے وہ کچھ کر دیا جاتا ہے کہ امت کی ظاہری زندگی، کم از کم ہزار سال کے لئے اس کی تفسیر ہوتی چلی جائے۔ یہاں تک کہ اللہ کا حکم پورا ہو۔ اسلام کو اپنی راہِ فروغ نصیب ہو اور اسلام جو زمانہ کے لئے ہدایت و سلامتی کا پیغام بن کر آیا وہ بالآخر عالم میں پھر سے سربلند ہو۔ آخر صدیقین، شہداء اولیاء، اسی لئے تو زمانہ میں آتے رہے کہ مرکزِ حق بن کر، حق کے اجراء کی ضمانت بنتے چلے جائیں۔ حق کی اسی تجلی کی تلاش میں فقیر قریہ قریہ، کوچہ کوچہ گھومتا ہے۔ جہاں روشنی نظر آئی لو لگا کر بیٹھ جاتا ہے۔ جس آئینہ میں حق کے انوار نظر آئے اسی میں اپنے حسنِ باطن کی جھلکیاں پاتا ہے۔ میدانِ فقر، میدانِ امر میں توحیدِ فکر قائم کرانے کی اسے ایک ازلی بے چینی ہوتی ہے۔ اپنی اس پیاس کی تسکین کے لئے قبلہ نے تصنیفات کے ذریعہ اپنا پیغام خواص تک پہنچایا صالحین، عارفین، سالکین، مجذوبین سے ملاقاتیں کیں۔ جہاں گشتی کی۔ بیرونِ ملک اور ہم وطن فقیر اور فقراء کی صحبتوں میں اپنی فرصت کا بیشتر وقت گزارا مزارات پر حاضریاں دیں اور اسی جذبے میں کہ ؎ قم قم یا حبیبی کمتہ نامی (اٹھو اٹھو محبوب کب تک

سوتے رہو گے۔)

روٹھے کو راضی کرنے کے لئے بہت سے جتن کئے۔ توبہ کے دروازے بند تھے تو چور دروازوں سے بارگاہِ رحمت میں رسائی کی کوشش کی اس لئے کہ یہ وہ سطح تھی جو ہر سطح سے بلند تھی۔ نیاز بے نیاز گرامی جس کی تفصیل علٰحدہ کتاب میں درج ہے بھوکے کا پیٹ بھر جانا عین دعا کے مترادف ہے دس ہزار کو کھانا اس غرض سے کھلایا کہ شاید کوئی ایک واقعی بھوکا کھالے تو عرش کے دروازے کھل جائیں نزولِ رحمت ہو اور امت کے دن پھریں ؎

ہمچو او ختمؐ بحرِ حق بایک پیالہ جستہ ام
مثلِ قرنیؓ دُرِ دیگر را تلاشے کردہ ام
در شبیہم بر دیارتؐ نسبتے آوردہ ام
بہرِ امت تحفۂ نور جمالتؐ بُردہ ام

رحمت کی سطح سے ہی عالمِ امر، عالمِ روح میں نہ صرف اغیار کی چیرہ دستیوں سے قوم کو نجات مل سکتی تھی بلکہ اپنے اعمال کی وجہ سے جو اللہ اور اس کے برگزیدگان فقراء اور مجذوبین کے غضب میں جو قوم گرفتار ہے اس سے بخشش و نجات کی صورت ممکن تھی۔ رحمتی وسع علٰی کُلِّ شیئیٍ پر قبلہ کو اتنا یقین، بھروسہ اور اعتقاد تھا کہ بالآخر برسوں کی مسلسل جد و جہد سے ایک راہ نکال ہی لی اور بڑے بھروسے اور پہاڑ جیسے ایمان کے ساتھ کئی برس سے یہ فرما رہے ہیں کہ رحمت کی ہوائیں چل پڑی ہیں۔ لاریب فیہ۔ اسلام کا وہ روشن زمانہ آئے گا کہ ہوش نہ ہوں گے۔ یوں قوموں کی زندگیوں میں ہزار سال بھی کچھ نہیں ہوتے۔ تیس چالیس سال بھی نہیں تھوڑے ہی عرصہ میں زمانہ دیکھ لے گا کہ اسلام اپنے جادۂ فروغ پر چل پڑا ہے البتہ

شروع میں وہی سیدھی سادھی باطنی خوبیاں اُبھریں گی جو بدوؤں میں تھیں اور بعد میں کہیں اُس کی اصلی شان اور سچی شریعت و طریقت کا نکھار ہوگا۔ اس شریعتِ باطنی پر، سرِ دست ظاہر داری کا پردہ پڑا ہوا ہے اور لوگ ظاہر داری سے کوئی ارکان ادا کر کے اپنے کو سرخرو سمجھ بیٹھتے ہیں باطنی حُسنِ حقیقت کو خود لوگ آئندہ زمانے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور ان جھوٹی مصنوعی عبادتوں اور ریاضتوں میں خود سے خلوص پیدا کرنے لگیں گے اس وقت کہیں اندر باہر کی ایکائی، ظاہر باطن کی توحید نصیب ہو جائے گی۔ اسی وقت کہیں نماز معراج المومنین ہوگی اور اسی وقت کہیں اللہ کے نور کو اس دنیوی زندگی ہی میں دیکھ لیں گے کیونکہ جو یہاں اندھا ہے وہ وہاں بھی اندھا ہے۔

قبلہ کی چند ملاقاتوں کی صرف جھلکیاں اس جگہ پیش کر دینا ممکن ہے۔ ان ملاقاتوں کے پسِ پردہ یہ حقیقت ہے کہ فقیر جہاں جاتا ہے حکم کے تحت جاتا ہے اس کا ایک قدم بھی بے معنی نہیں اٹھتا۔ پھر عاجزی اور مسکینی کی چادر اوڑھ کر یہ ضروری ہوتا ہے کہ اپنا پردہ ہی رہے۔ حق کی خود یہی شان ہے کہ اس نے اپنے کو پردے میں رکھ کر ہم کو ظاہر کر دیا۔ اب ھل جزاء الاحسان الاَّ الاِحسان اس کے سوا کیا ہو کہ خود پردہ میں رہ کر اس کا اظہار کر دیں۔ یہی عبدیت ہے۔ یہی علیدیت (ادنیٰ غلامی) کہ خود کو ایک چھوٹا سا حقیر بندہ بنا کر دنیا کے آگے پیش ہو اور امت کے کاموں میں صاحبانِ امر کا رجوع ایک ہی توحیدِ فکر کے انداز میں کرائے۔

پاکستان پہنچنے پر قلندر عبدالسلام دہلی والوں کی نشاندہی پر پہلے داتا دربار لاہور حاضری دی۔ قلندر صاحب کا دیا ہوا عطر پیش کیا پھر پشاور میں مانس بابا سے سبزی منڈی میں ملاقات کر کے عطر پیش کیا اور چہل گزی پشاور میں شہداء کے مزار

پر عطا پیش ہوا جو لوگ اس وقت حاضر تھے وہ شاہد ہیں کہ جیسے مدینہ پاک کی کھڑکی کھل گئی ہو اور یہ حالت ہو سے

میخانہ پہ رحمت کی گھٹا چھائی ہوئی ہے
سنتے ہیں مدینہ سے صبا آئی ہوئی ہے

اس کے بعد فقراء سے ملاقاتوں اور اہلِ سلوک کے ساتھ صحبتوں کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس کی صورت زیادہ تر برسوں روزانہ اہلِ ذوق احباب سے ہم مجلسی کی صورت رہتی اور ہفتہ عشرہ خصوصی قوالیوں کی محفل کی صورت میں جو شب بھر جاری رہتیں۔ ان ہی مجلسوں اور محفلوں کے ذریعہ ایک اچھی خاصی تعدادِ اہلِ ذوق کی پیدا ہو گئی جو دوسرے عوام کے لئے بھی ایک مثالی جماعت کے طور پر کچھ نہ کچھ اپنا کردار ادا کرتے رہے۔ بزرگوں سے ملاقاتوں میں قابلِ ذکر تقریباً پشاور اور نواح کے تمام سالکین اور مجذوبین تھے جن سے قبلہ کی اکثر مؤانست ہوتی۔ مانس بابا۔ کیٹی والے بابا۔ حسینی بابا بارکہ والے۔ پہلوان بابا ڈھکبری والے۔ بکری والے بابا کمبل پوش والے۔ صلاح الدین بابا۔ لگا بابا۔ سائیں چندا اور بہت سے غیر معروف مجذوب جن کا پتہ لوگوں نے دیا وہیں جا کر ان سے ملے۔ اس تلاش میں پاکستان کے دور دراز علاقوں میں پہنچے۔ ہر مشہور مقام۔ ہر مشہور مزار پر حاضری دی۔ وہاں نہ صرف صاحبِ مزار بلکہ اہلِ خدمت سالکین، مجذوبین تک رسائی کی۔ پس منظر یہی درد امت تھا کہ فقر کی اس صدیوں کی میراث کرامت کا مستقبل سنوارنے کے لئے کیک رخی عطا ہو۔ ایک توحیدِ فکر باطن کے ان چراغوں کے ذریعہ قوم کو عطا ہو۔ داتا دربارؒ۔ میاں میرؒ۔ پاکپتن شریف۔ عزیز مکیؒ۔ گولڑہ شریفؒ۔ بری امام۔ لعل شہباز۔ منگھو پیرؒ۔ شاہ نورانیؒ۔ بکری امام۔ سلطان باہوؒ۔ میاں محمدؒ۔ سخی سلطانؒ۔ شاہ جمالؒ

چرم پوش ۔ بہاؤالدین ذکریاؒ ۔ شاہ رکنِ عالم ۔ کاکا صاحبؒ ۔ چکنی بابا ۔ اصحاب باباؒ ۔
جلیب بابا اور بیشمار مزاراتِ بزرگانِ دین پر حاضریاں دیں ۔ فقراء میں چند ایک کے
اسمائے گرامی ہی بیان ہو سکتے ہیں وگرنہ تعداد تو حقیقتاً اتنی ہے کہ یادداشت سے بھی
باہر ہے ۔ فقیر جیر خیل ۔ حضرت نور بادشاہ ۔ پیر تیار پورہ ۔ پیر صاحب گولڑہ شریف
جلیب الرحمان چترالی بابا ۔ محمد اسمٰعیل بابا ملتانی ۔ آدم بابا لغا والے ۔ بوڑھی بابا سیالکوٹ
والے نرسے بابا ۔ بہادر ملنگ ۔ جلیب الرحمٰن برق ۔ طارق میاں ۔ طاہر میاں ۔ سید
ضیا جعفری ۔ سید امیر شاہ ۔ سائیں دُر محمد ۔ حمزہ شنواری ۔ حکیم سید احمد علی ۔ صوفی برکت
علی سالار والا وغیرہم سے اکثر و بیشتر ملاقاتیں بھی رہیں اور ایک وحدانیت فکر کا بھی مضبوطی
سے قائم ہوتی چلی گئی جو آئندہ زمانے میں امت کے فکر و عمل میں یک رنگی قائم کرانے کی کسی
نہ کسی طرح ضمانت بنتی چلی گئی ۔ ۱۹۴۵ء سے دو سال قبل حضرت اسمٰعیل شہید کے
مزار پر خصوصی حاضری کے بعد ان برسوں کی کوششوں کی پہلی کامیابی اس وقت نصیب
ہوئی جب ادھر سے اشارہ ملا کہ ہزاروں والوں کی غداری پر جو برسوں سے عتاب تھا اس
کی معافی دے دی گئی اور ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا گیا کہ قوم پر جب وقت آئے گا تو شہدا
ساتھ ہوں گے ۔ اسی طرح حضور باباؒ قادر اولیاء کے حکم کے تحت جب قبلہ کا سیف
الملوک جانا ہوا تو وہاں شاہِ اجنا کی طرف سے وعدہ ملا تھا کہ وقت پر سب ساتھ دیں
گے ۔ اس غیبی امداد کی شہادتیں جنگ ۶۵ء کے دوران جگہ جگہ سے ملیں ۔ حضرت
اسمٰعیل شہید کے مزار پر جب دوسری بار حاضر ہوئے تو عالم اسلام کے جھنڈے
ہی جھنڈے دکھائے گئے اس کے دو ایک سال بعد ہی عالمِ اسلام کی وہ فقید المثال
کانفرنس ہوئی جس نے آئندہ زمانہ کی اسلامی تاریخ کو ایک نیا رُخ عطا کر دیا ہے ۔

موجودہ دور میں پاکستان کی ابتلاء کے دور میں جب ہر جانب عالمِ مثال میں دریائے خون ہی نظر آیا تو پھر راہِ نجات کی یہی صورت نظر آئی کہ نسبتِ علی کے سہارے حضرت بوعلیؒ کی نیاز جگہ جگہ کرائی جائے چنانچہ اس ضمن میں پشاور۔ مظفر آباد، کراچی، لاہور یہ نیازیں کرائی گئیں اور جس دردِ دل سے جگہ جگہ حاضرین نے دعا کے لئے ہاتھ بلند کئے تو دعاؤں کی مقبولیت کی شہادتیں جگہ جگہ سے نصیب ہوئیں۔ اہلِ ظاہر اس نکتہ کو شاید ہی پکڑ سکتے ہیں کہ مختصر سی جماعت کی پُرخلوص دعا شبِ بدر کی آئینہ دار رحمت اللعالمین سائے خود ہی حیاتِ نو کی ضامن بن جاتی ہے اور وہ یوں کہ اپنی نفسا نفسی سے نکل کر ہی گروہِ امت کے لئے ایسی مضطرب کن حالت میں فریاد کے لئے ہاتھ بلند ہوتے ہیں۔ اب امت کی تاریخ کا پندرھویں صدی میں نیا باب ہی کھلنا ہے۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد یہ امت کی ابتلا کا چودہ صدی کا دور ختم ہو رہا ہے اور پندرہویں صدی وہ نقشہ پیش کیا چاہتی ہے جو فکرِ انسانی سے ہٹ کر بالکل اچھوتا حُسنِ امم کی جلوہ نمائی کے شایانِ شان ہوگا۔ حریصٌ علیکم بالمومنین رؤف الرحیم ایک زندہ حقیقت ہے۔ اور سب کچھ فیضانِ مصطفویؐ کے طفیل ہی عطا ہونے والا ہے۔ ہم کیا، ہماری کوششیں اور سوچ کی حدیں بھی کیا۔ نظر جیسے ہی اپنے سے ہٹ کر کسی اور کی رحمتوں کی کارفرمائی پر پڑنے لگے گی تو یہ راز بھی افشا ہونے لگے گا کہ خیرِ امت کی قسمت میں خیر کثیر عجب عجب انداز میں آئندہ زمانے میں عطا ہونے والا ہے۔ اس کی نشاندہی حال ہی میں قبلہ کو لاہوت لامکان کے شاہ نورانیؒ اور منوڑا کے بحری امام یوسفؒ پر حاضری میں دے دی گئی ہیں۔ یہ وہ مقامات ہیں جہاں سے باطنی سُرنگیں منبعِ انوار تک جا پہنچتی ہیں۔ فقر کے یہ وہ خزانے ہیں جن سے سیرابی حاصل کرنا ان ہی کے نصیب میں ہو سکتا ہے جن کے دلوں میں وہ سوراخ ہوں جن سے دردِ امت رس رس کر بارگاہِ رحمت میں پہنچتا ہے

فقیر کیا جب تک الفقر فخری کے اس راز کا شناسا نہ ہو کہ اپنے مقامات اپنی منازل کیا جب تک اپنی معراج میں بھی سوائے امتی امتی کے دوسری طلب نہ ہو تو یہ قبلہ کی روح کی ازلی تڑپ ہی تو ہے جس نے باوجود جسم کی معذوری کے قبلہ سے یہ جہاں گشتی ساری عمر کروائی ہے اور آج تک اس سوز و طلب میں کسی قسم کی نہ کمی ہے نہ آگے کی امید بند ھ جانے سے ایک قسم کی بے اعتنائی جو جگہ جگہ انہیں آج تک لئے پھرتی ہے اور جس میں آج تک وہی شدت ہے جو روزِ اول تھی - بقول حضرت بو علیؒ

ہر جا کہ می بری من بیچارہ می روم
باشد عنانِ من بہ کفِ اختیارِ دوست

○

یہ توحیدِ فکر بھی اپنی ایک یکتائیت، ایک وحدت لئے ہوتی ہے۔ وہ حضرت ادھمؒ کی طرح سمندر کو چھلنی بالٹی سے خالی کرنے کا عزم رائیگاں نہیں جاتا۔ رحمتِ حق ضرور ایسوں کو نوازتی ہے جو قرنیؓ جیسا دُرِ یگانہ تلاش کرنے کی فکر میں ہوں۔ جو جستجوئے طلب میں اپنے نفس، قلب، روح کی تمام صلاحیتوں کو اسی لگن میں صرف کر دینے کی شدتیں رکھتے ہوں اور ناممکن کے تخیل کو سرے سے اپنی زندگی سے محو کر چکے ہوں۔ ایسوں کو خود بھی یگانہ اور یکتا ہونا پڑتا ہے۔ اور اسی لئے یہ عظیم شخصیتیں اپنے تنہائی در تنہائی کے سفر میں یکہ و تنہا ہی رہتی ہیں۔ ایسوں کی گہرائیوں کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ یہ غواصانِ حقیقت اپنے ہی اندر غوطہ زن ہو کر دُرِ عینی حاصل کر لیتے ہیں۔ حق کی معرفت خود اپنی معرفت میں پوشیدہ ہے۔ اس کے علاوہ ہر کوشش دوئی

ہے، یہاں اپنی جان، وجود سب صرف کر کے ذرِّ عینی ہو جاتا ہے۔ ساری وحدت اپنے میں سمو لے کر پھر کہیں ذرِّ عینی کے انوارِ زمانہ میں پھیلائے جاتے ہیں۔ اب کہیں نورِ وحدت کا وہ مضبوط ستون تیار ہوتا ہے جس پر سارے ظہورِ وجود کی عمارت ایستادہ ہوتی ہے اور جو عشقِ محمدی، نورِ محمدؐی کی تابانی میں رُکنِ عالم بنتا ہے۔ رُکنِ عالم زمانہ کا وہ بوجھ اپنے اُوپر اُٹھائے ہوتا ہے جس پر اگلی صدیوں کے قیام کا انحصار ہوتا ہے۔ حَیُّ و قیُّوم کے انوار، نورِ محمدؐی کی تابانی میں میزان، صلوٰۃ، قیام جیسی آیتیں اس حالت پر صادق اُترتی ہیں۔

مبارک ہیں وہ جن پر ان رموز کی فہم ہی منکشف ہو جائے خوش نصیب ہستیاں ہی ایسے کی یکتائیتِ فکر سے توحیدِ فکر قائم کر سکتی ہیں۔ اور اپنا اپنا بوجھ کچھ اسی طور اُٹھا کر ارکانِ دینِ فقر کی ادائیگی کا حق پورا کر سکتی ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو زمانہ کی گردش میں بے دست و پا ہو کر نہیں بہتے بلکہ جو زمانہ پر سوار ہوتے ہیں اور زمانہ کی رفتار بدلتے ہیں۔ ان ہی کے لئے اقبالؒ نے کہا تھا ے ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر۔ یہی وہ ہیں جن کے اشاروں سے گردشِ افلاک تغیر پذیر ہوتی ہے۔ مولانا رومؒ فرماتے ہیں۔

قطب شیر و صید کردن کارِ او ۔ باقیاں ایں خلق باقی خوارِ او
قطب آں باشد کہ گردِ خود تند ۔ گردشِ افلاک گردِ او زند

(قطب شیر ہوتا ہے اور شکار کرنا اس کا کام ہے۔ دُنیا کے باقی لوگ اس کے شکار کا جھوٹن کھاتے ہیں۔

قطب وہ ہوتا ہے جو اپنے گرد کھینچتا ہے اور آسمان کی گردش اس

کے گرد اشارے پر چلتی ہے۔)

یہ سوزِ درونِ امت ۔ یہ صاحب خدمت لوگوں سے ملاقاتوں کی نہ بجھنے والوں والی پیاس اسی توحیدِ فکر کو عام کرنے کی غرض سے ہے جس کے تحت نسلِ انسانی کو باطنی راستوں سے وہ ہدایت اور روشنی ملے جو اُن کے اندر سے انفرادیت، نفس پرستی، حسد، بُغض، کینہ، ظلم، بیداد کو ہٹا کر امن، آشتی، صلح جوئی، خلق، ایثار، محبت اور احترامِ آدمیت جیسی اعلیٰ اقدار یں پیدا کر دے۔ اس طرح انسانیت کے گم گشتہ قافلہ کو بالآخر اپنی ارتقائی کڑیاں نصیب ہو کر منزل کا پتہ مل جائے گا۔ اسلام تو زمانے میں پیامِ امن لے کر آیا ہے۔ سارے زمانہ پر احسان بن کر آیا ہے اسلام کی باطنی خوبیاں باطن انسانیت سے ہم آہنگ ہیں اس لئے باطنِ انسانیت میں ہی تبدیلی لا کر یہ ارتقائی راہ ہموار کی جا سکتی ہے اور یہ کام اب کسی ایک فرد سے یوں نہیں ہو سکتا کہ یہ انسان کی جمعی کوششوں کا زمانہ ہے۔ فقر میں بھی اسی جمیعت بندی کی ضرورت ہے تاکہ صاحبانِ خدمت جو اس وقت حیات ہیں اور جو پس پردہ ہیں ان کے مشن کو یک رخی نصیب ہو دنیا سے رخصت ہونے کے وقت اپنا مشن دوسرے کو سونپنا اور اس دوسرے کا حکماً اس فرض کو اپنے بوجھ کے ساتھ ساتھ سنبھالنا بھی فقراء کی سنت چلا آرہا ہے۔ قبلہ کی کئی بزرگوں سے آخری وقت میں ملاقاتیں اور کئی مزاروں پر خصوصی حاضریاں صرف اسی تعمیل حکم کے تحت ہوئیں کہ اُن روشنیوں کو زیرِ زمین دفن ہو جانے سے بچائے رکھنا ہے۔ بابا قادر اولیاءؒ ۔ حضرت نور بادشاہؒ ۔ حسینی باباؒ ۔ نرے بابا ۔ مانس بابا اور دوسرے بزرگانِ باطن کا بوجھ سنبھالے رکھنا صرف اسی توحید فکر کی نشاندہی کرتا ہے کہ وحدتِ امر ایک ہی اکائی میں اس عالمِ رنگ و بُو میں کار فرما ہے۔ جب ایک شمع

بجھتی ہے تو دوسری روشن کر دی جاتی ہے فقر کا یہ سلسلۂ جاریہ ہی باطنِ انسانی کی بنیادوں کو مضبوط کر کے اس شجر مبارکہ کی نشوونما کا ضامن بنا رہتا ہے۔

○

یہ خواصِ امت میں یک نظری، یک خیالی پیدا کرنے کی برسہا برس کی کوششیں اسی لئے تھیں کہ اسلام کا طلوعِ فجر ہونا ہے۔ شمسِ حقیقت^ص کی تجلی اب بھی زمانہ پر اسی رحمت للعالمینی انداز میں ہو رہی ہے۔ کاش اپنی تاریکیوں اور اندھیروں سے نکل کر یہ اندھی قوم شمسِ حقیقت کی تجلی میں آجائے۔ یہ دو ایک کی کوششوں کی بات نہیں۔ اس سے کچھ بھی نہیں ہو سکتا۔ یوم عام حیاتِ انسانی کا موجودہ دور بھی اس کی بیّن نشاندہی کر رہا ہے کہ یہ جمعی کوشش کا زمانہ ہے۔ اسلام کی فطرت اسی گروہ بندی اور جمعی انہماکِ کار کا سبق دیتی ہے۔ انفس اور آفاق دونوں راہوں میں قوم کے خواص کو جمعی عمل پیرائی کی ضرورت ہے۔ تعجب ہے کہ ایک ہی مرکزِ عشق، ایک ہی منبعِ حیات و نور سے وابستہ ہونے کے بعد بھی فقراء تک میں انفرادیت کی لٹک کچھ اس طرح پیوست ہو کر رہ گئی ہے کہ اس کی جڑیں صدیوں پرانی نظر آتی ہیں۔ مقامِ فکر ہے کہ جمعی عمل کی خوبیاں مقبول اور مستحسن نظر آنے کے باوجود۔ اپنی اپنی انفرادیت سے ہٹ کر جمعی فلاح کی جانب اپنا رُخ موڑ دینا خواص تک کے لئے دشوار ہو گیا ہے۔ اور اپنے اپنے مسلک سے ہر ایک کو ایسی وابستگی ہو گئی ہے کہ جیسے

چناں در بندگی خود ساختم من
نہ گیرم گر مرا بخشی خدائی

پھر بھی قبلہ نے مختلف فقراء سے برسوں روابط صرف اسی مقصد کے لئے رکھے کہ آخر پانی کی حقیر بوند بھی بڑی بڑی چٹانوں میں سوراخ کر دیتی ہے اور صبر و تحمل کی یہ کوششِ پیہم کبھی رائگاں نہیں جاتی۔ ان ملاقاتوں میں یہ ضرور رہا کہ کئی ایک صاحبِ نسبت اور باکمال بزرگ، اپنی اپنی سربلندی کی داد حاصل کرنے میں لگے رہے اور اپنا لوہا منوانے پر ہی قانع رہے یا اپنی اپنی روحانیت کی زور آزمائی آپس میں ہی کرتے رہے۔ نگاہ اتنی بھی بلند نہ ہو سکی کہ اسلام کے ظاہر باطن پر جو یہود و نصاریٰ و ہنود کی صدیوں سے یلغار ہے اس کا سدِ باب مجمعی انداز میں انفس اور آفاق دونوں میدانوں میں کر کے، قوم کو اس کی راہ فروغ پر گامزن کرانا ہے۔ آفاقی دائرۂ عمل میں جس لطافت اور ذہانت سے ان بدخواہوں نے اپنی تحریروں، کے ذریعہ یا تہذیب اور روشن خیالی کے نام پر اسلام کی فطری سادگی، غیرتِ دینی اور جذبہ جہاد کے نظریے کو یکسر ہماری زندگیوں سے محو کرا دیا اور عبادت و تقدس کا نام دے کر ہم کو انفرادیت کے اندھیرے غار میں دھکیل دیا۔ اُس تک ہماری خواص کی بھی نظر بند کرا دی۔ ہماری اجتماعیت کی اس طرح بیخ کنی کر کے ہم کو ذکر و فکر صبح گاہی میں مست کرا کے ہماری منزلِ فروغ سے دور کر دیا۔ ہماری صدیوں کی تاریخ اس بات کی گواہی دے رہی ہے کہ جذبۂ جہاد جو ہماری زندگیوں کا نصب العین تھا۔ اب ہم سے بالکل مفقود ہے۔ حالانکہ جہاد اور صرف جہاد ہی میں ہمارے وجود کی ساری صلاحیتیں ابھر آتی ہیں اور اجتماعیت صرف جہاد ہی میں مستحکم ہوتی ہے۔ یہی جہاد بالسیف کو اپنے تخیل تک سے محو کر دینا ہماری بربادی کا ذریعہ بن گیا۔ دیکھا جائے تو نبی پاک صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا مجمعی لشکر بھی جذبۂ جہاد میں ایک دوسرے سے سبقت لے

جانا ہی تو تھا۔ اسی جذبہ کے تحت سادہ لوح بدو تک اسلام کے وقار کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی جانیں نثار کر دیتے تھے اور اسلام کا یہی جذبۂ سرفروشی تھا جس سے دنیا کانپ اٹھی تھی کہ ایسوں سے کون مقابلہ کرتا جو اپنی جانیں فدا کرنا جانتے تھے۔

اب ضرورت ہے کہ اپنے دشمنوں کی اُن چالوں کو پہچانیں جو ظاہر میں صدیوں سے انہوں نے ہمیں شربت کے انداز میں زہر دیا ہے۔ قوم اور خواص کو اس زہر کے مختلف رنگوں کی وضاحت کرنی ہے اور ان کا توڑ پیش کرنا ہے اور اس ظاہر کی سطح سے ہٹ کر باطن میں جو ان کے ماہرانِ روحانیت نے اجتماعی اور انفرادی.. کوششوں سے ایک سحرِ فسوں سا ہماری قوم کے عقل و دماغ پر کیا ہے اور خواص تک کے قلوب پر تسلط جمانے کی کوشش کی ہے اُس کا سدِ باب کرنا ہے۔ باطنی یلغار ظاہری یلغار کے مقابلہ میں کہیں زیادہ شدید ہے۔ یہ صرف وہی جانتے ہوں گے جن کی نظر ایک مشفق ماں کی طرح اپنی قوم پہ ہے۔ سوچیں کہ آخر کیا بات ہے کہ سب کچھ ہوتے ہوئے بھی قوم اتنی پراگندہ کیوں ہے۔ بے یقینی، نامرادی، بے بسی نے اقوامِ مسلم کو ایسا گھیر رکھا ہے کہ ان کے ذہن سے احساسِ زیاں بھی جاتا رہا ہے۔ عشقِ مرکز سے وہ محروم ہو گئے ہیں اور بے پرواہ بھی۔ دل کے میدان کا اس طرح اُجڑ جانا ایسی بربادی اور شکست ہے جو ہماری سلطنتیں تباہ ہو جانے سے کہیں زیادہ ہے سوچیں کہ جب دل کی دنیا ہی برباد ہو گئی ہے۔ عشقِ نبیؐ سے ہی ہم محروم ہو گئے تو رہ کیا گیا۔ اسی عشقِ مرکز کے طفیل تو ہماری حیات تھی، ہماری جاں نثاری تھی ہمارا فروغ تھا، ہمیں دوام تھا۔ تو یہ نسبتِ محمدیؐ۔ یہ رشتہ۔ یہ ڈور پھر سے مضبوط کرا دینا اگر فقراء کا کام نہیں تو کس کا ہے۔ اس کے لئے تو

نہ وقت کی ضرورت ہے نہ اسکیموں کی۔ یہ تو قلوب میں انوار ڈال دینے کی بات ہے۔ جاء الحق و ذہق الباطل۔ جب نُور آیا تو تاریکیاں خود بخود غائب ہو جائیں گی ظاہری اور باطنی شیاطین کے سب فسوں ٹوٹ جائیں گے۔ قبلہ فرماتے ہیں اب مشکل سے دو سال ہی ہیں جن میں کچھ کرنا ہے۔ بار بار یہی صدا آ رہی ہے کہ تیاری کے لئے تمہارے پاس صرف دو سال ہیں اس لئے جلدی کرو۔ فقراء میں یہ پیغام دیا جا چکا ہے۔ عمل پیرائی ان کے اختیار میں ہے۔ جو بھی اپنا رُخ شمسِ حقیقت کی جانب کر لے وہی شمسِ حقیقت کی جھلک دینے لگے گا۔ تب ہی کہیں حقِ بندگی ادا ہو سکے گا۔

یہ ثُمَّ وجہُ اللہ یہ فقیر ہُو اللہ
ہوئی سرخرو بندگی اللہ اللہ

باب ۱۱ قادر نگر (پیر باباکوٹ)

ازل سے یہ سلسلہ چلا آرہا ہے کہ جب روح اس جسم خاکی میں رہ کر عرف نفسہ کی کیفیت سے آشنا ہوتی ہے تو انسان اپنے مقام کو پاجاتا ہے اور یہ وجود خود مرکز نور ہو جاتا ہے۔

حق کا اولیں جذبہ، اولیں خواہش یہ تھی کہ پہچانا جاؤں۔

"سب سے پہلے ہم نے (عشق، عقل سلیم) نور محمدی کو پیدا کیا کہ اس کے ذریعہ ہماری پہچان ہو" "کنت کنزاً مخفیاً فاحببت عن عرفا فخلقت محمدؐ میں ایک چھپا خزانہ تھا، پھر محبت ہوئی کہ پہچانا جاؤں تو محمد کی تخلیق کی"

تو اب حق یا خالق کی پہچان ہو سکتی ہے تو عشق یا نور محمدی کے طفیل کہ اسی سے ساری کائنات کی تخلیق ہوئی۔ یہ نور ہر حرکت کا محرک ہر شے کا باطن ہے یہ ازل سے چلا تھا اور ابد تک رہے گا۔ لولاک لما خلقت الافلاک۔

جب عرف نفسہ کے بعد انسان اپنے مقام کو پالیتا ہے تو اس کا وجود ایک خول کی طرح رہ جاتا ہے اور وہ خودی جس کی تکمیل کے لئے زمانہ نے کروڑوں کروٹیں بدلی ہیں ظہور میں آتی ہیں۔ اب یہ پیکر، مظہر حق بن کر حق کے نشتر کا ذریعہ بنتا ہے۔ خود تو ایک عاجز، مسکین، بانسری کی طرح کھوکھلا ہوتا ہے جس کا سرا کسی اور کے منہ میں ہوتا ہے مگر اس سے وہی آواز نکلتی ہے جو حق کی آواز ہوتی ہے۔ گویا وہ مکمل عبدیت ہی ہوتا ہے، عشق کی غربت کی چادر اوڑھے

اب وہ خود تجلائے حق کا آئینہ دار بن جاتا ہے۔ اپنے جسم کی مشکوٰۃ میں مصباح کے لئے۔ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ صرف اپنے وجود کی بتی کو خوب دھن کر پاک کر کے دیئے کی نظر کر دینا ہوتا ہے۔ اس طرح حق کی تجلی عام ہونے لگتی ہے۔

نبی کریمؐ خود منبع حق، مظہرِ حق، ہوتے ہوئے دنیا میں تشریف لائے اور اس وجود ظاہری کی تمام شریعتیں پوری کر کے وہ راہنمائی کر گئے کہ ہر راہرو کے لئے حق کی منزل تک پہنچنا آسان ہو جائے اور اس حق تک اس کی رسائی ہو جائے جو خود اس کے اپنے باطن وجود میں ہے۔ اس کے لئے حضورؐ نے غارِ حرا میں بیٹھ کر انہماک در انہماک، استغراق در استغراق فرمایا۔ یہ حواسِ خمسہ کی رسائی سے باہر کی بات تھی۔ یہ فتح الغیب، عشقِ ازلی کی کالی کملی میں لپیٹ کر ہی حاصل کی جا سکتی تھی کہ اس کے بعد شرح والضحیٰ ہو۔ یہ وصالِ حق، عقل و خرد و ہوش کی دنیا سے علیٰحدہ ہو کر ایک وجدانی عالم میں ہی نصیب ہو سکتا تھا۔ یہ عرفَ نفسہٗ فقد عرفَ ربہٗ کی تکمیل ہی نہ تھی بلکہ مکمل حق سے وصالِ ہو میں قیام۔ یہ روح، سر، خفی، اخفا غیب سے بھی پرے کی بات تھی۔ غیب تک رسائی کس کس کے نصیب ہو لیکن جب کسی کے دستِ کرم سے روح میں ہی کسی کو قیام نصیب ہو جائے تو اس مادّی زندگی کو دوسرے پہلو سے دیکھنے لگتا ہے۔ اس کیفیت میں وہ عقل کے پھندوں اور حواسِ خمسہ کے چکروں سے نجات پا جاتا ہے۔ اپنی "میں" کو مٹا کر محدود سے لامحدود میں قدم رکھنے لگتا ہے اور پھر اپنی انفرادیت کو مٹاتے مٹاتے سر، خفی، اخفا اور غیب تک رسائی اس کے لئے ممکن ہو جاتی ہے۔ جب کوئی ہستی اس طرح اپنی "مَیں" کی فنا کے بعد حق سے واصل ہو جاتی ہے تو خود مرکزِ حق

بن کر حق کی نشر و اشاعت کرنے لگتی ہے ۔ حق میں دوئی کہاں۔ حق ہی حق رہ جاتا ہے اور یہ خود غائب ۔

نبی کریمؐ نے فرمایا تھا ۔ مَن رَآنی فقد راہُ الحق ۔ اس سے زیادہ کھول کر کیا بات کی جاسکتی تھی ۔ پھر جب سامنے آنے والوں نے خود ذاتِ حضور اکرمؐ میں حق کی تجلّی دیکھی ۔ خواہ ان مٹی کی آنکھوں کی رسائی بتک ہی ہی سہی تو کیونکر نہ فریفتہ ہو جاتے اور حضورؐ کے ہر فرمان پر دل وجان سے عمل پیرا اور تصدق نہ ہو جاتے ۔ ایسوں کے لئے عشق سارے دروازے کھول دیتا ہے ۔ کیونکہ محبوبِ حقیقی تک رسائی عشق کی وارفتگی کے ذریعہ ہی کی جاسکتی ہے ۔ محبوب کا نام، محبوب کا تصوّر، محبوب کی ذات پھر کچھ اس طرح اس کے وجود میں رچنے لگتی ہے کہ عاشق خود غائب ہو جاتا ہے ۔ میں غائب توُ ہی توُ رہ جاتا ہے ۔ یہاں تک کہ اپنا وجود بھی توُ ہی توُ کے علاوہ کچھ نہیں رہتا ۔ کُلُّ شَیئٍ ھالِکٌ الا وجہہٖ ۔ وجہِ رب باقی ہے اور سب فانی ۔ گویا لیلیٰ ہی لیلیٰ رہ جاتی ہے اور مجنوں غائب ۔ لیلیٰ دراصل ایک ہی ہے ۔ دو کیسے ہو سکتے ہیں ۔ وحدہٗ لا شریکَ لہٗ ۔ اور یہ وہی لاشریک، یکتا، بے مثل ہے جو بیتاب ہے کہ اس کی پہچان ہو ۔ محمدؐ کے ذریعہ پہچان ہو ۔ مظہرِ عشق کے ذریعہ شناخت ہو ۔ یہ "میں" کا حجاب اٹھے اور حق ظاہر ہو ۔

تو جب کوئی ہستی اپنے وجود کی فنا سے گزر کر، اپنے کو مٹا کر، عشقِ مسکین عبدِ کامل بن کر، توُ ہی توُ یعنی حق کا مرکز ہو جاتی ہے تو اس کے ذریعہ نشرِ حق ہونے لگتا ہے ۔

کُن فیکون جاری و ساری ہے ۔ چراغ سے چراغ جلنے لگتا ہے ۔ کیونکہ ان

چراغوں کی لَو ایک ہی ہے ۔ نورِ محمدیؐ ۔ حق میں دوئی کا امکان کہاں ۔ اب اس پیکر کو، نشرِ حق کے لئے (حرا) باطن سے نکل کر فاران کی چوٹی (ظہور) پر آنا ہوتا ہے اور حال یہ ہوتا ہے کہ دل بدست دگرے جان بدست دگرے ۔ یہ سلسلہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا ۔

آدم کو جنتوں کی وسعتوں سے اتار کر زمین پر لایا گیا ۔ علم الاسماء کا مصداق بنا کر، خلیفۃ اللہ فی الارض بنا کر، اشرف المخلوقات کا رتبہ دے کر اور تمام عالمین پر فوقیت دے دی کہ کُن سے جو وجودِ کائنات کا سلسلہ جاری ہوا اس میں آدم اور اولادِ آدم مرکزِ حق، خلیفۃ اللہ فی الارض بن کر نشر و اشاعتِ حق کرتے رہیں ۔ اور ابلیس کو بھی چھوڑ دیا کہ وہ اور اس کی ذریت اگر گمراہ کر سکے تو کر کے دیکھ لے اس لئے کہ مرکزِ حق، خلیفۃ اللہ فی الارض، حق الحق کی شان کے آگے باطل کی تاریکیاں کہاں ٹھہر سکتی ہیں ۔ جاء الحق و زھق الباطل انا الباطل کان زھوقا ۔ عشقِ ازلی کے آگے نفس و خرد کے وسوسے کہاں راہ کھوٹی کر سکتے ہیں ۔ خود آدم صفی اللہ کی یہ کیفیت کہ عبدیتِ کامل کے تحت عاجزی کا جامہ اوڑھے، ظلمنا انفسنا کی حالت اپنے اوپر طاری کئے خلیفۃ اللہ کا نمونہ پیش کرتے ہیں کہ عاجز بندے ساری خدائی اپنے میں سمیٹنے کے بعد بھی عاجز و مسکین ہی رہتے ہیں ۔ آدمؑ کی طرح مختلف زمانوں میں مختلف انبیاء کرام آتے رہے اور اپنے زمانے کی صلاحیتوں کے اعتبار سے مسکینی، عاجزی اور فقر کا انداز لئے نشرِ حق کرتے رہے ۔ سیدنا نبی کریمؐ پر پیغام ختم ہوا ۔ ان کا پیغام دائم قائم کر دیا گیا ۔ الیوم اکملت لکم دینکم فرما کر مہر لگا دی گئی کہ آپ کے بعد نیا پیغام نہیں آنا ۔ نبوت کا دور ختم ہوا ۔

جمیعت کی شیرازہ بندی اور انسانیت کی اصلاحِ زندگی کے لئے ایک نظام پیش کر دیا گیا کہ ایسا ماحول، ایسا نظریہ پیدا ہونے کے بعد ہی انسان حق کی طرف رجوع ہو سکتا تھا۔ یہ پیغام، یہ نظریہ ایسا تھا کہ عشق کے ماحول میں اسے خود بخود ایک مستحکم صورت ملنے کا امکان تھا۔ کیونکہ عقل اور ظاہرداری کی حد تک رہ کر تو مذہب کا صرف خول ہی خول رہ جاتا ہے۔ اسلام نے سکھایا کہ اصل بنیادِ مذہب، جمیعت بندی سے ہٹ کر کچھ نہیں اور رجوع الی اللہ خالصۃً فی اللہ ہی مقصد تخلیق ہے۔ حق ایک ہے۔ محیط ہے۔ جب تک اسی یکتائیت کے رنگ میں حق کو اپنے اندر نہ ڈھونڈ پائیں نہ رجوع الی اللہ ہو سکتا ہے۔ نہ اس کے حصول کے بعد جمیعت بندی اس لئے باطن میں غوطہ زنی کرنے والے، غارِ حرا کی سنت پوری کرنے والے ان تیرہ صدیوں میں لاتعداد آئے اور آتے رہیں گے کہ جب تک بنیادِ وجود کو نہ پا لیا جائے، حق تک رسائی نہ ہو جائے، وصل کا رشتہ نہ بندھے، ظاہر کے اعمال کا اثر بہت پھیکا سا رہ جاتا ہے اپنی بخشش و نجات کا تو شاید یہ ظاہری خلوص سے ارکان کی پابندی ذریعہ بن سکتی ہے۔ نظامِ دنیوی میں اخلاق کا بہتر نمونہ پیش کر سکتی ہے مگر حق سے روشناسی، حق تک رسائی اس طرح نہیں ہو سکتی۔ یہ عقل و خرد و حواس کی دسترس سے باہر کی بات ہوتی ہے۔ یہ اپنی مَیں کو توڑنے کے بعد، عشق کے سہارے اور سوائے عشق کے کسی دوسرے ذریعہ سے ممکن نہیں یہ رسائی اور یہ کیفیت عشق کے حال میں ہی نصیب ہو سکتی ہے۔

مادی جسم، مادی آنکھوں کے لئے مادی پہلو ہی اختیار کرنا ہوتا ہے۔ کسی مرکزِ حق کو دیکھ کر ہی اور اس سے والہانہ لگاؤ پیدا ہونے کے بعد ہی اپنے قلب

میں عشق جاگ سکتا ہے کیونکہ ہر حسن کی بنیاد ہے ہی وہ خود حق۔ تو وہ فقراء جن کی "میں" کی فنا ہو چکی ہوتی ہے، جو ایک عاشق کی طرح عاجز و مسکین ہوتے ہیں اور اس عشق میں محبوبیت کی جھلک لئے ہوتے ہیں تو حق انہیں اپنے لئے منتخب کر لیتا ہے اور یہ نشرِ حق کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ نبی کریمؐ کے بعد یہ کام فقراء، اولیاء کے ذریعہ ہی لیا جاتا رہا ہے۔ یہ فقراء تو کبھی کا اپنے وجود کو ختم کر چکے ہوتے ہیں، ہر خواہش سے نکل چکے ہوتے ہیں اس لئے یہ تانبا کی اسی نورِ محمدی کی ہوتی ہے۔ نورِ محمدی سلسلۂ جاریہ ہے۔ نہ اس کی تقسیم ہو سکتی ہے نہ اس میں کمی بیشی، وہ تو وَسِعَ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ ہے۔ زمان و مکان کی حدود سے آزاد۔

مرکزِ حق کو نشرِ حق کے لئے کسی جگہ ٹھکانہ کرنا ہوتا ہے۔ اس جگہ کا انتخاب اس کے اپنے امکان سے باہر کی بات ہوتی ہے۔ یہ حکم کے تحت ہوتا ہے اور حکم کیا ہے۔ امر ہے۔ کن فیکون۔

کبھی کسی پیکر کو ایسی جگہ بٹھا دیا جاتا ہے جہاں کے لوگوں میں سوئی ہوئی باطنی خوبیاں ہوتی ہیں مگر ظاہر پر ماحول کی تاریکیاں یا عقل و نفس کے پردے پڑے ہوتے ہیں۔ کام فقیر کا وہی ہوتا ہے جو مرشدِ اولین نبی کریمؐ کا تھا۔ یُزَکِّیْھِمْ۔ کبھی فقیر کو ایسے ماحول میں بھیج دیا جاتا ہے جہاں باطل کی قوتیں یا شیاطین و اجنّا کا اثر ہوتا ہے کہ وہی کام کرے جو مرشدِ کامل اویس نے کیا یعنی جاءَ الحق وزھق الباطل۔ غرض کون سے ماحول کے لئے کسی فقیر کے ذریعہ کام لیا جاتا ہے۔ یہ صرف حق جانتا ہے۔ فقیر کی مرضی کو اس میں ذرہ بھر دخل نہیں

ہوتا۔ وہ تو ایک کھوکھلی بانسری کی طرح ہوتا ہے ایک خشک تنکے کی طرح۔ لیکن یہ کیفیت، فنائیت در فنائیت حاصل ہونے کے بعد نصیب میں آتی ہے۔ یہ وہ حالت ہے کہ امر حق ہوتے ہوئے بھی مسکینی اور عبودیت میں سر بہ سجود رہنا ہوتا ہے۔ اب سوچو کہ فقیری کیا چیز ہے۔ الفقر فخری کیوں حضورؐ نے فرمایا تھا اور غوث الاعظم نے کیوں ارشاد فرمایا تھا کہ فقیر وہ ہے جس کے ساتھ امر شامل ہو کُن کہے تو ہو جائے کیا یہ سب کچھ اکتساب یا مجاہدوں، یا اپنی کوشش اور خواہش سے حاصل ہو سکتا ہے؟ کیا اس کی بھی ضرورت رہ جاتی ہے کہ حق کی مرضی پر اپنی مرضی کو فوقیت دی جائے۔ یہ کام سپردہی ایسے کو ہوتا ہے کہ اس کی اپنی مرضی کچھ نہ رہے، نہ اپنے لواحقین کی مرضی سے وہ اثر انداز ہو نہ اپنے ارد گرد کے ساتھیوں کی۔ نہ ماحول کی اور دنیاوی تقاضوں کی۔ بلکہ وہ جو حق کی مرضی ہے اسی پر عمل پیرا ہو اور اُدھر کے ہی اشاروں پر چلے۔ اس حالت میں اپنے کو پائے کہ کائنات میں حقیر سے حقیر، مسکین سے مسکین عاجز سے عاجز، نہ صرف اپنے کو سمجھے بلکہ دیکھ سکے۔ اسی فنا، اسی خود فراموشی اور ہیچمدانی کے عالم میں فقیر آمر باللہ ہو سکتا ہے۔ اب جائزہ لو کہ عقل و حواس کا تھوڑا سا اختیار مل جانے کے بعد انسان نے اپنے کو کہاں سے کہاں پہنچا لیا۔ وہ مالک کی قدرتوں پر اپنے کو ہی صاحب اختیار سمجھنے لگ پڑا، وہ اپنے ظاہر کے زیر اثر باطن کے تقاضوں سے بالکل بے بہرہ ہو گیا۔ وہ خالق کے ہر کام میں اپنی مرضی کو دخل دینے لگ گیا لیکن فقیر مرکزِ حق کا خود اپنا باطن، حق ہوتا ہے اس لئے وہ اس حکم میں نہ کوئی دوئی دیکھتا ہے نہ دیکھ سکتا ہے بلکہ

وہ ایسا محسوس کرتا ہے ؎

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

اس حالت میں فقیر ایک دائمی لشکر میں ہوتا ہے ۔ جدھر یار لے جاتا ہے
وہ جاتا ہے جہاں بیٹھنے کا حکم ہوتا ہے جا کر بیٹھ جاتا ہے ؎

ہر جا کہ می بری منِ بیچارہ می روم
باشد عنانِ من بہ کفِ اختیارِ دوست

اس بیٹھنے کی جگہ سے فقیر کو ایسا والہانہ عشق ہوتا ہے کہ گویا وہ ازل سے ہی
اس جگہ کا آرزومند تھا ۔ وہ لطافت ، وہ حُسن ، وہ انوار اس کو اس جگہ نظر آتے ہیں
کہ گویا یہ وہی جگہ ہے جہاں آدم کو خلیفۃ اللہ فی الارض بنا کر ، سنوار کر ، امر دے کر اتارا
گیا تھا ۔ یہ غالبا وہی مٹی ہوتی ہے جس کو گوندھ کر اس کا جد بنایا گیا تھا ۔ اسی لئے ایک
کششِ ازلی اسے اس جگہ سے ہوتی ہے ۔ وہ توکل بر اللہ اس مقام پر ٹھکانہ کرتا ہے
ظاہری عقل و حواس کے اعتبار سے یہ جگہ ظاہر بینوں کو عقل کے مشوروں کے خلاف ۔
پُر از تکالیف و اندوہ معلوم ہوتی ہے ۔ مگر امر باللہ کے تحت ہر قدم پر تائیدِ ایزدی
شاملِ حال ہوتی ہے ۔ جس کی یہ ظاہر بیں عقل بھی خود تائید کرنے لگ جاتی ہے ۔

چراغ سے چراغ جلتا ہے ۔ مرشدِ کامل حکم دیتا ہے یا بشارتوں میں اس حکم
کی وضاحت کر دی جاتی ہے ۔ یہ مقام بشارت میں پہلے سے دکھا دیا جاتا ہے اور اس کی
تلاش میں ایک ازلی کشش محسوس ہونے لگتی ہے ۔

چنانچہ قادر نگر (بنیر) کی بابت پہلے سے بشارت میں ۱۹۵۸ء میں دکھا دیا گیا
اور ایک ایسے مقام کی طرف اشارہ کر دیا گیا جو بنیر میں پہاڑوں کے درمیان کہیں تھا ۔

نشانی کے طور پر پہاڑ میں سے ایک چھوٹا چشمہ پھوٹتا ہوا دکھایا گیا۔ اس کے قریب ایک چھوٹی مسجد پتھر کی نشانی اور سامنے میدان پھر اس بشارت کی تکرار ۶۰ء میں ہوئی۔ یہ کھلی نشانی تھی کہ مرشد پردہ فرمانے والے تھے اور اس پیغام کی علمبرداری اب خود کرنا تھی۔ جس کے لئے فقراء کا ظہور ہوتا ہے۔ چنانچہ ۶۱ء، ۶۲ء دو سال گرمیوں میں چھٹیوں میں نقشے ہاتھ میں لے کر بُنیر کے پہاڑوں میں چشمے اور مسجد کی تلاش ہوتی رہی۔ کئی مقامات اس نشانی کے دیکھے مگر دل نے تصدیق نہ کی کہ یہ وہی جگہ ہے اور ساتھیوں میں سے دو ایک اور نے بشارتوں میں اس وادی کی سیر بھی کرلی جس کی ابھی تلاش تھی۔ یہ تصدیق تھی اس ازلی رشتہ کی جو روحوں کو ایک دوسرے کے ساتھ ہوتا ہے اور اس ماحول سے تعلق کی جہاں سے نشرِ حق ہونا قرار پاتا ہے۔ ان نشانیوں کو انسان پکڑتا جائے تو حق کی کارفرمائیاں ہر ہر قدم پر نظر آتی جاتی ہیں اور حق سے رشتہ مضبوط ہو جاتا ہے۔

حق ایک ہے، محیط ہے۔ واصلینِ حق بھی ایک ہی رشتہ میں منسلک ہوتے ہیں۔ اسی لئے جو امرِ ربی ہوتا ہے اس کی تصدیق و تائید ہر مرکزِ حق سے ہونے لگتی ہے اور اھلاً وسھلاً مرحبا کی ہر طرف سے آوازیں آنے لگتی ہیں۔ بُنیر کے علاقہ میں سید علی خراسانی، پیر بابا علیہ الرحمتہ کا مزار پاک ہے۔ آپ سلطان الہند خواجہ اجمیری کے ہم عصر مشعلِ حق بن کر اسی خطہ میں جلوہ افروز ہوئے اور شاہِ خراسان مشہور ہوئے آج بھی حضور کا مزار آماجگاہِ خلائق ہے اور فیض کا دریا جاری ہے۔ دربارِ شاہِ خراسان میں حاضری منشائے الٰہی کے تحت ہوئی۔ وہاں سے تصدیق ملی کہ نشرِ حق کے لئے یہ علاقہ منتخب ہو چکا ہے اور ہر طرح پیر بابا کی اعانت اس سلسلہ میں ملے گی۔ اس کی ــــ
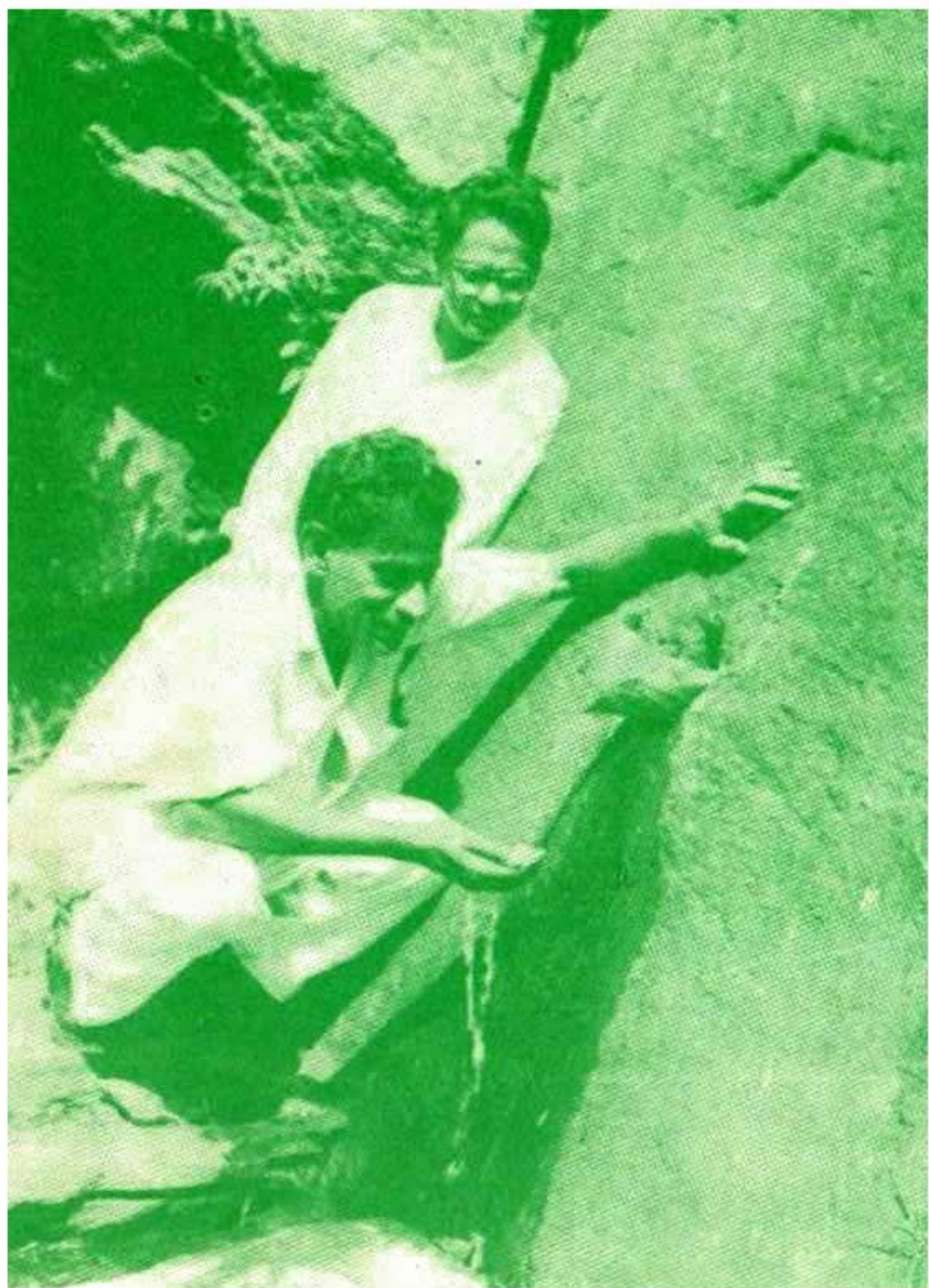
بشارتی چشمہ

جس سے پہلے قبلہ نے
پھر ساتھیوں نے پانی پیا۔

تصدیق دو ایک اور بزرگوں کے ذریعہ حضور پیر بابا نے فرمادی۔ انعام واکرام کی یہ بارش ایک عاجز فقیر کو امد تشکر میں جھکا دیتی ہے اور وہ سجدہ ریز رہتا ہے اس احسان کے بوجھ سے کہ حق کی پشت پناہی میں اسے خدمت کے لئے منتخب کیا گیا۔ حق اور حق والے خود پردے میں رہ کر ایسوں سے کام لیتے رہتے ہیں جنہوں نے اپنے آپ کو مٹا کر فنائیت حاصل کر لی ہو اور جو اس وجود میں امرِ حق کے اجراء کا ذریعہ بن سکیں۔

پیر بابا کے مزار کے قرب میں جزامی بھی کافی تعداد میں موجود ہیں ظاہر کی کوئی نشانی بے معنی نہیں ہوتی۔ یہ بھی ایک نشانی ہے اس بات کی کہ آج اس امت کو جذام کا مرض لاحق ہو گیا ہے۔ چشمِ باطن گواہی دے سکتی ہے اس حقیقت کی کہ یہ جذامی ٹھیک ہوئے تو امت ٹھیک ہوئی۔ جب تک ایسے آمونین کا ظہور نہ ہو جو مٹی کے جسم میں رہ کر لوگوں کی تالیفِ قلوب نہ کریں، ابتلائیں امت پر قائم رہتی ہیں۔ اب مشیتِ ایزدی کے تحت وقت آگیا ہے کہ امت کی ابتلائیں ختم ہوں۔ سب آمونِ حق اسی طرف رجوع ہیں۔ حق ایک ہی تو ہے اور اس کی رحمت سب کو ڈھانپے ہوئے ہے۔

بشارت والی جگہ کی تلاش میں ۱۱ جولائی سنہ ۶۳ کو ڈاکٹر مائکل پیر بابا لیپرسی کلینک کے بتائے ہوئے نشان پہ پیر بابا سے چار میل دور اندر پہاڑوں میں جانا تھا۔ حق کی راہ میں ہر نشانی کو دیکھنا ہوتا ہے۔ نام بھی ایک نشانی دیتے ہیں۔ میکائیل فرشتہ ربوبیت نشاندہی کریں تو ربوبیتِ حق تو پیچھے پیچھے ساتھ ہی ہوتی ہے۔ اس نشاندہی پر پیر بابا سے چار میل دور پہاڑوں میں جانا تھا۔ موچی بابا ایبٹ آباد والے بھی پیر بابا تک ساتھ تھے۔ آگے کے لئے قبلہ، سائیں عزیز جمدانی، پاشا، ولی اس مقام کی طرف روانہ ہوئے۔ سلطان خان کلینک کے کمپاؤنڈر اور ممہ جرا خان ساتھ تھے۔ ایک تنہائی

فاصلہ پر راستے کے کنارے کھلے میدانوں میں ایک چیڑ کا درخت ہے جو راہِ منزل کا
پتہ دیتا ہے اور اپنی یکتائیت میں ایک حُسن لئے ہے۔ اس درخت کے سائے میں
کچھ دیر قائم کیا اس درخت سے کچھ ایسی انسیت سی اب ہے کہ قادر نگر آتے جاتے اس
درخت کے نیچے کچھ دیر کے لئے قائم کر لیا جاتا ہے۔ دو تہائی راستہ پر پھر توقف کیا اس
جگہ سائیں عزیز کافی تھک گئے اور انہیں اس جگہ آرام کے لئے چھوڑ دیا گیا۔ آخری ایک
تہائی راستہ اس وقت کافی دشوار معلوم ہوا۔ پتھروں اور چھوٹی چھوٹی ناہموار چڑھائیوں
پر تھوڑے تھوڑے فاصلہ پر دم پھولتا تھا۔ لیکن وہاں تک رسائی کے شوق اور وہ
منزل آ پہنچی وہ منزل آگئی کی آواز نے بہر کیف کام کیا۔ بہ ظاہر یہ سفر ہاتھ پاؤں کی
جنبش طے کرتی ہے مگر حقیقت میں ایسا سفر کسی اور آسمان پر ہوا کرتا ہے۔ یہ
باتیں دل کی کیفیات سے ظاہر ہو سکتی ہیں کیونکہ دل ہی آئینہ دار ہوا کرتا ہے حقیقت کا۔ یوں
ساتھ ساتھ ظاہری تصدیقیں بھی ملتی جاتی ہیں۔ اس حسین وادی کا پُر کیف نظارہ، تصدیق
تھا بشارتوں کی اور والہانہ شوق، تائید تھا منزل کی رسائی کی۔ سامنے ٹھوس پہاڑ کی چٹان
سے ایک چھوٹے گول سوراخ سے پانی کا چشمہ جاری تھا۔ یہ وہی مقام تھا جس کی بشارت
دی گئی تھی۔ ساتھ ہی ایک چھوٹا سا چبوترہ تھا جو مسجد کے لئے پہلے استعمال ہوا تھا کہتے
ہیں صحن مسجد اخوند درویزہ باباؒ کی عبادت گاہ رہا ہے اور چشمہ ان کے ہی فیضانِ کرامت
سے جاری ہوا تھا۔ صحنِ مسجد کے ساتھ ایک بڑا پتھر ہے جس پر بہ تعمیلِ حکم اذان دے
دی گئی ؎

وہ اذاں بھی لگ چکی ہے اب حریمِ ناز میں
کُلَّ یَومٍ شانِ پھر شانِ بشر ہونے کو ہے

چشمے سے پہلے قبلہ نے پانی پیا پھر ساتھیوں نے۔ شکرِ ایزدی ہوا ادا کہ اُس

چشمہ سے بھی جو اس چشمہ کا اصل یعنی مخزنِ اسرار تھا سیرابی عطا ہوئی۔ یہ چشمہ، یہ صحنِ مسجد، یہ قطعہ زمین، یہ کُل کا کُل نقشہ اچھوتی آنکھ کو اس جہان کے منظر میں لے گیا۔ جس کا عکس یہ سرزمین تھی۔ ظاہر ہے تو صرف تصدیق ہوا کرتی ہے اس سرّ کی، اس رمز کی، جو ان ظاہری نشانیوں کے پیچھے پوشیدہ ہوا کرتا ہے۔

سخت چٹان میں سے چشمے کا پھوٹنا اور نشرِ حق کے لئے صحنِ مسجد ایک معنی رکھتا ہے۔ ایک پیام ہے اس نقشہ کا جو باطن کی گہرائیوں سے اور ظاہر کی صداقت لے کر جمے گا۔ اشارہ دیتا ہے اس رشتہ کی طرف جو مخزنِ اسرار سے بندے کا قائم ہو گا۔ یہ سخت چٹان سے چشمہ کا پھوٹنا خود اپنے قلوب کا چشمہ کا پھوٹنا ہے اور یہ صحنِ مسجد خود اپنا قلب ہے، عرش ہے، جس پر حق اپنے تمام مظاہر کے ساتھ جلوہ افروز ہو گا۔ یہ چشمہ نشانی ہے بسم اللہ کی، گنج اخفا کے پھوٹ پڑنے کی۔ کُن فیکون کے قلوب سے ابل پڑنے کی۔ اور یہ صحنِ مسجد نشانی ہے۔ الم نشرح کی۔ اشاعتِ حق کی اور یہ وادی نقشہ ہے جمعیت کے حُسن کی۔ پھر ایسی وادی پر، انوار کی بارش کیونکر نہ ہو۔ ملائک اور ارواحِ مقدسہ کا نزول کیونکر نہ ہو۔ جب تمام کا تمام ماحول، قدوسی ہو جائے تو اس وادی پر، احترامِ عشق سے قدم رکھنے والوں پر اور ظاہری آلائشوں اور زمیں کے چکروں سے آزاد ہونے والوں اور عاجزی سے رجوع ہونے والوں پر، رحمتوں کا نزول کیونکر نہ ہو۔ جب رحمت سب کو ڈھانپ لیتی ہے تو سب ایک ہی کیفیت سے اثر پذیر ہو جایا کرتے ہیں چنانچہ جوں ہی قبلہ نے ارادہ ظاہر کیا کہ یہ سرزمین کا ٹکڑا اس کے دنیوی مالک سے حاصل کر لیا جائے تو قدرت کی کارفرمائیاں دیکھیے کہ اس خطہ کا مالک میر جول خاں خود ہی بلا ارادہ ساتھ موجود تھا اور وہ تمام کی تمام جگہ مفت دینے

پر تیار ہو گیا۔ لیکن شرعی تقاضوں اور دنیاوی اصول کے تحت اس سفر میں، میر جول خان سے یہ زمین پانچ سو روپیہ میں حاصل کر لینے کا طے کر لیا گیا۔

چنانچہ اگلے ماہ تک والی صاحب ریاست سوات سے سکونت کے لئے زمین خریدنے کی اجازت حاصل کر لی گئی اور اگلی بار اکتوبر ۶۳ء میں سترہ آدمیوں کا قافلہ دوبارہ قادر نگر پیر بابا اس غرض سے آیا (اس سفر میں۔ قبلہ، ولی، پاشا، صمدانی، معین، پیر اسلم شاہ۔ ملوب عظیم قصور والے، لودھی، نیازی، نیر، منیر بھائی۔ مشتاق، حسین، غزان ڈرائیور، قریشی، نجم ساتھ تھے) شب پیر بابا میں سلطان ہوٹل میں قیام کیا گیا اور صبح کو قبلہ، پیر اسلم شاہ صاحب کی معیت میں تحصیل تشریف لے گئے اور انتقالِ زمین میر جول خان سے کرا لیا گیا۔ اس خریداری میں شرکت کے لئے اور جماعت کے نظریے کے تحت سب سترہ آدمیوں سے پانچ پانچ روپے لئے گئے تاکہ رقم کے ساتھ شامل کر دیئے جائیں اور اعلان کر دیا گیا کہ یہ زمین اللہ کی ہے۔ جس کی مرضی ہے جھونپڑی بنا کر یہاں رہے۔ اس کے بعد قادر نگر سب قافلہ پہنچا قبلہ نے اپنے ہاتھ سے چشمہ کے اوپر ۷۸۶ لکھا قادر نگر کچھ دیر قیام کر کے واپسی کے وقت سوات اور کالام کا سفر کیا۔ ٹھنڈی ہوائیں۔ ابر آلود مطلع اور برف سے ڈھکی پہاڑوں میں کالام اپنا حُسن آپ تھا۔

اس کے کچھ اور عرصہ بعد قادر نگر کا ایک اور چکر لگا۔ (جس میں قبلہ، ولی، پاشا، پیر اسلم شاہ، عظیم بھائی، لودھی بھائی، آفتاب بھائی اور افغانستان والے شاہ صاحب ان کے لڑکے ساتھ تھے۔ یہ شاہ صاحب کافی معمر تھے۔ عمر تقریباً ۱۰۰ سال پھر بھی قادر نگر جانے کے لئے دل سے آرزومند۔ پیر بابا

سے قادر نگر کا دشوار گزار راستہ جس جولانیٔ طبع سے انہوں نے طے کیا اس پر بے اختیار دل سبحان اللہ کہہ اٹھا۔ سچ ہے عاشق کبھی ضعیف نہیں ہوتے بلکہ عمر کے ساتھ ساتھ ان کی لطافتیں اور بھی بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہ بزرگ جب راستہ ہی کچھ دیر توقف فرماتے تو جولانیٔ طبع میں پہاڑوں کو دیکھتے اور فارسی میں شعر پڑھتے کہ اے اللہ میں نے کیا خطا کی تھی جس کے عوض آج پکڑا گیا اور ہنستے مگر واہ رے عزم کہ منزل کی قدم جو اٹھایا وہ واپس نہیں کیا۔ قادر نگر پہنچے بھی اور کچھ دیر وہاں ٹھہرنے کے بعد واپس بھی چل پڑے کیونکہ شب گزارنے کے لئے اس وقت قادر نگر میں کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ قادر نگر پہنچ کر جگہ کو پسند فرمایا۔ صحنِ مسجد میں نماز بھی پڑھی۔ مسجد کی بنیاد میں ایک پتھر بھی اپنے ہاتھ سے رکھا۔ سب لوگ پیر بابا اس شب کے لئے واپس آ گئے۔ پیر بابا میں لوگوں سے یہ بزرگ کہتے تھے کہ درانی صاحب کو سمجھاؤ کہ ارادہ سے باز آئیں جنگل میں یوں جا کر پڑ جانا مصلحت کے خلاف ہے۔ یہاں کے لوگ اچھے نہیں۔ گویا امتحان لے رہے تھے ساتھیوں کے عزم کا۔ پھر صبح کو خود ہی فرمانے لگے کہ قادر نگر کی بابت پیر بابا نے تصدیق کر دی ہے کہ ان کا کرم ساتھ رہے گا۔ کوئی مخالفت نہ کر سکے گا۔ نہ گزند پہنچا سکے گا۔

پیر بابا کے قیام میں سید معین الدین صاحب سجادہ نشین سے ملاقات ہوئی۔ یہ سٹری بابا ملنگ کے صاحبزادے ہیں جنہوں نے پیر بابا کی شاندار مسجد بنوا کر ثابت کر دیا ہے کہ مردانِ حق جب کسی کا بیڑہ اٹھا لیتے ہیں تو حق کی مدد ضرور ساتھ ہوتی ہے۔ اس سے کھلی نشانی اور کیا اس عالمِ امکان میں اس

کُن، امرِ ربی کی دی جا سکتی ہے جس کا آئینہ فقراء کا قلب ہوتا ہے۔

سید معین الدین صاحب نے جس شفقت و عنایت کا مظاہرہ کیا وہ قابلِ صد تحسین ہے۔ اس وقت سے اب تک قادر نگر کے ہر سفر میں آتے جاتے سید صاحب کے آستانہ پر کچھ دیر کے لئے توقف کیا جاتا ہے اور ان کی مہمانداری سے سرفرازی حاصل ہوتی ہے۔ کیا رحمت کی شان ہے کہ پیر باباؒ اور ان کے سجادہ نشین صاحب کی محبت و شفقت شاملِ حال ہے۔

دسمبر ۶۳ء کو مشرف خاں کی ٹرک میں اور ان کے اور عنایت کے اہتمام میں ہٹ کا سامان پیر بابا کے لئے لیٹاور سے روانہ کیا گیا۔ اس طرح جیپ میں کچھ لوگ اسی ٹرک کے ساتھ ساتھ روانہ ہوئے۔ پاشا، قریشی انجم، خدا بخش، عارف، منیر بھائی، غفار، علی مردان اس گروپ میں تھے۔ پیر بابا سے قادر نگر سامان پہنچانے کے لئے دو دن لگ گئے اور اس عرصہ میں ہٹ کی زمین ہموار کی گئی۔ سامان پہنچنے پر تین دن میں اینگل آئرن اور چپکس بورڈ سے ایک شاندار ہٹ کھڑا کر دیا گیا۔

دسمبر کو قبلہ معہ خاندان، مطلوب، ولی پیر بابا پہنچے۔ یہ ۷ شعبان کی شام تھی۔ مطلوب اور ولی سورج چھپنے کے بعد ہی قادر نگر روانہ ہو گئے۔ جب پہنچے تو ہٹ تیار تھا۔ آخری کام اس پہ ہو رہا تھا۔

صبح ۸ شعبان کو دربار سجا دیا گیا۔ ۱۰ بجے کے قریب جب قبلہ اور بچے پہنچے تو قادر نگر کی سرحد پر ان کا استقبال کیا گیا۔ دربار میں جب دو منٹ کے لئے قبلہ نے قدم رکھا تو دربار یہ نقشہ پیش کر رہا تھا کہ ؎

روشنی از نورِ تجلّی بام و در ہونے کو ہے

ان ہی دو ایک منٹ میں اچھوتے انداز میں سلام پیش ہوا۔ ؎

نورِ تاج الوراء سلامٌ علیک

قادرِ حق نما سلامٌ علیک

معنیٔ والضحیٰ سلامٌ علیک

نکتۂ اینما سلامٌ علیک

ایک بجلی سی اس مختصر وقت میں کوند گئی۔ باطنِ وجود میں ظہور رکُن ہوا ؎

مرکزِ ستر نگاہ قادر نگر ہونے کو ہے

فقیری دربار ایک مرکز ہوا کرتا ہے فیض عام کے جاری ہونے کے لئے مرجع خلائق کے لئے۔ خدمتِ خلق کے اجراء کے لئے اور آنے والے فیضیاب ہوتے ہیں اپنی اپنی لباط کے مطابق۔ اپنے ادب، اپنی عاجزی، اپنی بے کسی، اپنی صداقتِ ایمان کے حساب سے۔

فقیر خدمتِ خلق کا جامہ اوڑھے ٹھکانہ پر بیٹھتا ہے مگر اصل مقصد اس کا ہوتا ہے کہ مولیٰ اور بندہ کا رشتہ جوڑے۔ بندے کو مولیٰ کی طرف رجوع کرے اور حق کی پہچان کے راستے پر بندے کو لگا دے کہ حق کی یہی خواہش ہے کہ پہچانا جاؤں۔

فقیر کی زندگی طبق در طبق ہوتی ہے اور مخلوق اپنی اپنی لباط کے لحاظ سے فقیر کے آگے پیش ہوا کرتی ہے۔ کوئی فقیر کو صرف اپنا جیسا مٹی کا پتلا دیکھتا ہے۔ تو اس کے لئے وہ اسی انداز میں ہوتا ہے اور کسی کے لئے وہ ہر طبق میں سامنے

آتا جاتا ہے جیسے جیسے پردے اٹھتے جاتے ہیں وہ اسی شان میں فقیر کو دیکھا جاتا ہے۔ فقیر اسم اللہ جسم فقیر کا مصداق ہوتا ہے۔ اس لئے جیسے کو تیسا۔ اپنے اپنے ظن اور اپنی اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے مخلوق فیضیاب ہوتی رہتی ہے۔ فقیر خود عاجز، مسکین، بچے کی طرح سادہ ہوتا ہے اس لئے اس کے آگے بغیر عاجزی، مسکینی اور معصومیت کے بات نہیں بنتی۔

یوں حق ہر ایک کے باطن میں ہے۔ تو کون کس سے کم۔ کون کس سے جدا۔ لیکن یہ حالت تو بغیر اپنے کو مٹائے اور بغیر اپنی میں کو ختم کئے کیسے حقیقت سے روشناس کرا سکتی ہے۔ عشق کے ہی ذریعہ یہ ممکن ہوتا ہے۔ عشق میں مٹنا ہی مٹنا ہی ہوتا ہے اور کھونا ہی کھونا۔ عاشقی دعوے والی بات نہیں۔ یہ تو فیضانِ محبت کے سایہ میں پرورش پاتی ہے اور نظرِ مہر کے لئے نہ کوئی قاعدہ ہے نہ قانون۔ نظرِ مہر خود بخود ہوتی ہے۔ بے حساب ہوتی ہے۔ بے سبب ہوتی ہے۔ دنیاوی تعلقات کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔ ورد، وظائف، مجاہدوں اور اپنی عقل کی ترکیبوں اور کوششوں کو اس میں کوئی دخل نہیں۔ **واللہ خیر الماکرین۔**

یہ تو سورج کی روشنی کی طرح ہمہ گیر بارشِ انوار ہوتی ہے۔ اپنی "میں" کی کور چشمی البتہ اس روشنی کے قلب تک پہنچنے میں رکاوٹ ڈالتی ہے۔ جس دل میں "میں" کی حرص و ہوس ہو، اس میں رحمت کا فرشتہ نہیں اترا کرتا۔

جب بادلوں کی تاریکیاں ہوں تو شمع کی روشنی کا کور بینوں پر اثر نہیں ہوتا چراغ تلے اندھیرا ہوتا ہے تو بس ایک بجلی کوندتی ہے کہ اس برقِ تجلی سے کمزور نگاہ والے بھی فیضیاب ہو جاتے ہیں۔ قادر نگر کے اس قیام کے اندر ان بس اسی برقِ تجلی

کا ظہور رہا کہ بار بار چمکی۔ بار بار قلوب کو روشن کیا اور سیکنڈوں میں وہ کام ہوا جس لئے اہتمام اور انتظام کر کر کے عرصہ تک امیدوں میں بیٹھا جاتا ہے کہ رحمت کی نظر ہو۔ ظاہر بیں آنکھوں نے شاید یہی دیکھا ہو کہ کچھ لوگ پہنچے۔ کچھ دن اچھے ماحول میں رہے۔ پُر فضا مقام پر وقت گزارا اور بس۔ لیکن ظاہر تک کے نقشے بھی ایسے جمے کہ خود بخود۔ بغیر اہتمام، بغیر انتظام ان چند دنوں میں بہت کچھ ہوا۔

۹ شعبان فاتحہ والے دن ڈیم پر کام ہوتا رہا اور دربار کے قریب نیاز پکتی رہی عارف صاحب نے دُنبے حلال کئے مبین صاحب نے دیگ پکانے میں حصہ لیا نیاز کا کھانا غربا کو کھلایا گیا اور بعد میں اس علاقہ کے حاکم تحصیلدار اور تقریباً ۱۲ شخص اور قبلہ معہ ساتھیوں کے دسترخوان پر بیٹھے۔ سید معین الدین صاحب بھی تشریف لائے تھے اور نیاز انہوں نے ہی دی تھی۔

کھانے کے بعد تقریباً ۲½، ۳ بجے ان کے ایک قوال پارٹی نے نثار خواجہ قوال کی سرکردگی میں دربار میں قوالی بھی پیش کی۔ زاہد صاحب نے پہلے سے بشارت میں اس وادی کی سیر کرلی تھی۔ تاج الاولیاء اور باباجان کو بھی دیکھا تھا۔ دربار میں قوالی بھی ہوتی دیکھی تھی اور قوال کا نام بھی نثار خواجہ انہوں نے بشارت میں پہلے سے دیکھا تھا۔

یہ قوالی نشانی تھی جمیعت کے حُسن کی۔ جمیعت کے الم نشرح کی اور تصدیق اس بشارت کے ذریعہ اس بات کی کہ عالمِ مثال میں پہلے سے نقشے ترتیب پاتے ہیں

زاہد صاحب اس قوالی کے بعد تشریف لائے راستہ میں انہیں نثار خواجہ قوال واپس جاتے ملے۔ تو بشارت یاد آگئی۔

سہ پہر کو ایک سکھ پارٹی بھی آئی تھی۔ ان کو مٹھائی دی گئی جو تبرک کے طور پر انہوں نے لی۔ یہ سکھ بیعت کی غرض سے آئے تھے مگر بعد میں کہتے تھے کہ بات کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ ایک ملنگ بھی آیا تھا جس نے ایک تار بجایا۔ نئے یک تارے کے لئے قبلہ نے اسے کچھ روپے دیئے۔ خریداری کے بعد لوگوں نے کہا جا کر سنا آؤ تو وہ بھی کہتا تھا کہ فقیر سے ڈر لگتا ہے۔ شام تک مختلف ٹولیوں میں ساتھی جوق در جوق پہنچے۔ کوئی پھول لایا تھا۔ کوئی اگر بتی۔ کوئی مٹھائی، کوئی چادر۔ کسی نے نیزے پر علم قادری بلند کیا اور دربار میں فاتحہ کے سامان کر دیئے گئے۔ مُبین صاحب نے قرآن خوانی کی، پیر اسلم شاہ صاحب نے شجرہ پڑھا۔ زاہد صاحب نے قُل۔ مطلوب صاحب نے ڈر ر شجرہ پڑھا کہ یہ ان ہی کے قلم سے لکھا گیا تھا۔ ساتھیوں نے قبلہ کو ہار پہنائے۔ ولی نے علم پیش کیا اور مطلوب صاحب نے یہ نظم پڑھی ؎

یہ اِنّا فتحنا کا علم تیرے لئے ہے

عجب حسین نظارہ تھا۔ انا فتحنا لکم فتحاً مُبینا کا نقشہ پیش نظر تھا۔ باطن میں جو نقشہ جما تھا اس کی ظاہر میں بھی جھلک دکھا دی گئی۔ یہ سب کچھ بظاہر اتفاقیہ ہوا تھا۔ مگر سب کچھ بہ منشائے الٰہی۔ قدرت خود اپنے جمائے ہوئے نقشوں کو ظاہر کے حسین پہلو میں بھی دیکھنے کی مشتاق ہوا کرتی ہے۔ یہ اسی کی ایک جھلک تھی تاکہ ظاہر کی حد تک یا بند رہ جانے والی آنکھوں کو بھی کچھ نہ کچھ فیض مل سکے۔

دوسرے دن صبح سویرے ولی نے اذان دی اور بابا قادر اولیاءؒ کا عطا کیا ہوا علم، پہلی بار قادر نگر کی ایک منتخب پہاڑی پر نصب کیا گیا۔ علم کو سب جماعت نے ہاتھ لگا کر چٹان پہ پہنچایا جہاں قریشی صاحب (غلام رسول) کے ہاتھوں

وہ نصب کر دیا گیا۔ علم کا لگایا جانا بہت بڑی بات ہوا کرتی ہے۔ یہ حکم کے تحت ہوا کرتا ہے اور حکم کیا ہے۔ کُن فیکون۔ عَلَم نصب کرنے سے وہ سرزمین خالصتہً حق کی ملکیت ہو جایا کرتی ہے اور حق کا زیرِ فرمان اس سرزمین پر ہر جاندار اور جن و بشر ہو جایا کرتا ہے۔

دوسرے دن بھی ڈیم اور دوسری جگہوں پر کام ہوتا رہا۔ شام کو سورج غروب کے بعد چراغاں کیا گیا۔ فتح مبین کی خوشی میں۔ عَلَم کے نیچے چٹان پر اسلام بہادر اور احسان اللہ درّانی نے "یون فائر" کیا۔ عجب نقشہ اس چراغاں کا اس جنگل میں تھا۔ سب ساتھی فرطِ انبساط میں شمعوں کی طرح روشن نظر آتے تھے۔ اسی دوران میں ایک اور محفل دربار میں لگی۔ گلاب ہی گلاب ایک چادر پر بچھے تھے۔ بیٹھے ہی بیٹھے سماں بندھا۔ دو ایک نظمیں پڑھی گئیں۔ ولی نے اجازت لے کر سہرا پڑھا۔ رنگ بندھا۔ پھولوں کی بارش قبلہ پر کی گئی اور ؎

"جُھک گئی خلقت ساتھ ولیؔ کے"

پڑھنے کے ساتھ ساتھ سب ہی جماعت قدم بوس ہوئی۔ تجدید ہو گئی پہلی بار اس گل افشانی کی جو حضور بابا قادر اولیاء کے دربار میں جشن پر لوگ کرتے تھے۔ وہی نقشہ تھا۔ وہی رنگ تھا وہی قلوب کی کیفیت۔ وہ خود ہی موجود تھے جب "تو" اور "میں" ایک ہوا تو "تو" کون "میں" کون۔ میں "تو" ہوا "تو" "میں" ہوا حق ایک ہی تو ہے ؎ یہی وجہ رنگ شکل دگر ہونے کو ہے، کا نقشہ درپیش تھا قادر رنگر اس قیام کے درمیان وہ انوار کی بارش ہوئی۔ وہ قلوب روشن ہوئے کہ ہر طرف سے اس کی تصدیق ہونے لگی۔ کسی کو بشارتوں میں روشنی

بخشی گئی، کسی کو جاگتے میں نظارے دکھائے، کسی کے قلب پر تجلی گری، تو کسی کا ضمیر روشن ہوا غرض کوئی انعام و اکرام سے نہ بچا۔

"امر بسم اللہ" کھلے دربار عطا ہوا کہ بسم اللہ کہہ کر جو بھی ایسا کام کریں گے جس سے اپنا دُور کا بھی تعلق نہ ہو اور خدمت خلق کے لئے ہو تو کامیابی ہوگی۔ یہ امر کام آیا ایسوں کے لئے بھی جو وہاں مجبوراً نہ جا سکے تھے۔ مگر دل سے اُدھر لو لگائے بیٹھے تھے۔ فرمادیا ہاں وہ زیادہ دل سے قریب ہیں۔ وہ بھی اس انعام و اکرام میں شامل ہیں۔ وہ بھی اس امر میں شامل ہیں۔ گویا جماعت کی جماعت ایک رشتہ میں پرو دی گئی۔

فتحِ مبین

★

پاسبانِ ملّت فتحِ مبین فتحِ مبین

سامنے ہے منزلِ عین الیقین عین الیقین

اُبھرا اُفق سے دینِ متین دینِ متین

محمل نشین ہے شرعِ مبین شرعِ مبین

اے امینِ فطرت روح الامین روح الامین

سُبحاں تیری قدرت دل کے مکین دل کے مکین

آسمانِ سطوت روشن جبین روشن جبین

آن بانِ قدرت مہرِ یقین مہرِ یقین

راز دانِ خلوت رازِ طٰسین رازِ طٰسین

جانِ جانِ جلوت طٰہٰ یٰسین طٰہٰ یٰسین

ہے دلّی کی قسمت نورِ یقین نورِ یقین

ساربانِ اُمّت فتحِ مبین فتحِ مبین

ہوا غیب سے جو چلی اللہ اللہ۔ تو رحمت کی کھڑکی کھُلی اللہ اللہ
فضا میں ہر اک سمت اِک کیف سا ہے۔ کلی دِل کی پھر سے کھُلی اللہ اللہ
یہ روحِ الامینی یہ عین الیقینی۔ خبر غیب کی مِل گئی اللہ اللہ
نمودِ حقیقت ہوئی اللہ اللہ۔ لو! تقدیرِ اُمت کھُلی اللہ اللہ
ہوئی ذات کی آگہی اللہ اللہ۔ یہ اِسرارِ و رمزِ خودی اللہ اللہ
عروسِ اُمم بن کے اَب روحِ اعظم۔ تمنائے عالم ہوئی اللہ اللہ
تولّائے محبوبیت کی نشانی۔ وہ مُہرِ ولایت ہوئی اللہ اللہ
ہوئی رسمِ آئینہ مصحف عدم میں۔ بندھی حق سے نسبت نئی اللہ اللہ
عروسِ اُمم نے شہیدوں کے خوں کی۔ لگائی ہے مہندی ابھی اللہ اللہ
کھُلا نانۂ ذات خاکی بدن میں۔ لو! تفسیرِ یٰسین ہوئی اللہ اللہ
عجب شدتِ شوق آئی بدن میں۔ شہادت حقیقت بنی اللہ اللہ
یہ ثَمَّ وجہُ اللہ یہ فقرِ ھُو اللہ۔ ہوئی سُرخرو بندگی اللہ اللہ
ترا ہاتھ میں ہاتھ آتے ہی ساقی۔ چراغاں یہ ہستی ہوئی اللہ اللہ
ضیا بار نُورِ سراپا کے صدقے۔ پُرانوار ہستی ہوئی اللہ اللہ

یہ معراج اپنی دلی اللہ اللہ
تجلّائے حق آگہی اللہ اللہ

یٰسین

اَب سحر ہونے کو ہے. بزمِ دگر ہونے کو ہے
نذرِ ساقیٔ حرم قلب و نظر ہونے کو ہے
جَل چکی ہے شمعِ سوزاں مطلعِ انوار ہے
اس شبِ تاریک کی آخر سحر ہونے کو ہے
کس اچھوتی شان سے توبہ ہوئی ہے اَب قبول
در کھُلے ہیں فیض کے نظرِ مہر ہونے کو ہے
بن گئی استغفراللہ صورتِ رحمِ کثیر
رشتۂ مابینِ مولیٰ و بشر ہونے کو ہے
اس رُخِ تاباں سے شرحِ والضّحیٰ ہونے کو ہے
گیسوئے مشکیں سے افسون و سحر ہونے کو ہے

اَنتُمُ الاعلون اور اِنّا فتحنا کے طفیل
یہ جہان آب و گل زیر و زبر ہونے کو ہے
روشن از نورِ تجلّی بام و در ہونے کو ہے
یبتغی دجہ ربک شکل دِگر ہونے کو ہے
ہے نزولِ شان رحمت کثرت انوار ہے
شجرِ زیتونِ مبارک بار ور ہونے کو ہے
پھر ادائے ناز سے شقّ القمر ہونے کو ہے
پھر الم نشرح ہوا کشفِ صدر ہونے کو ہے
وہ اذاں بھی ہو چکی اب حریم و ناز ہیں
کُلّ یوم در شانِ پھر شانِ بشرُ ہونے کو ہے
اَمرِ بسم اللہ ولی بارِ دگر ہونے کو ہے
مرکزِ ستر فگاں قادر نگر ہونے کو ہے۔

اَلصَّلوٰۃُ وَالسَّلَامُ علیٰ خاتَمُ النَّبِیِّین وَسَلَامٌ علی المُرسلین

سلام اے مرسلینِ حق، سب ہی ہو ظلِ نورانی
سلام اے رحمت للعالمین ملجائے ایمانی
سلام اے بابا دُرّانی، حبیبِ فخرِ انسانی
سلام اے قبلۂ جانی، مسیحِ روحِ انسانی
سلام اے دُرِّ علینی، اے عُبید اللہ دُرّانی
سلام اے سِرِّ مکنونی، امینِ امرِ ربانی
سلام اے جذبِ تاجیؒ کے جلالِ شیرِ یزدانی
سلام اے شاہِ قادرؒ کے جمالِ ماہِ کنعانی
سلام شانِ کمالی کے، رموزِ نورِ القانی
سلام فقرِ ھُوَ اللہ ہشت خصلت کے نگہبانی
سلام راہِ سخا میں، ابراہیمیؑ شان دکھلانی
سلام راہِ رضا میں، اسمٰعیلیؑ آن اپنانی

سلام اس خامشی پر ذکریاؑ کی یاد آجانی
سلام سادہ لباسی پر وہ موسیٰؑ کی قدردانی

سلام اے صبرِ ایوبیؑ کے پیکر شمعِ سوزانی
سلام یحییٰؑ سی تنہائی میں داؤدیؑ نواخوانی

سلام راہِ قلندر میں مسیحیؑ بات دُہرانی
سلام اِس فقر و مسکینی میں احمدؐ کی حیاآنی

سلام اے دُرِّ عینی، اے عُبید اللہ دُرّانیؒ
سلام اے قبلۂ جانی، مسیحِ روح انسانی

سلام اپنے شکستہ جسم کی تفصیل طُولانی
سلام اُمّت شکستہ حال کی تصویرِ لاثانی

سلام اُس دردِ امت پر بنا جو سوزِ روحانی
سلام عشقِ محمدؐ میں ادا قرنیؒ کی اپنانی

سلام اے غوثِ امت اے فقیر مرتضیٰ ثانی
سلام اے شانِ اُمت کی ادائے اعظم ثانی

سلام اے آیۂ وَالتّوُد کی تفسیرِ پنہانی
سلام اس شجرِ زیتونی کی یہ توقیر تبلانی

سلام اُمت کے مُردہ جسم میں یہ سُورِ پھنکوانی

سلام وہ امرِ بسم اللہ دُرودِ تاج پڑھوانی

سلام یہ تخرجُ الحیَّ مِن المیّت بھی دِکھلانی

سلام اے حیّ و قیومی متاع کے فیضِ سُبحانی

سلام اے بابا دُرّانیؒ حبیبِ فخرِ انسانی

سلام اے سرِ مکنونی ، امینِ امرِ ربانی

سلام اے مرسلینِ حق، بقائے وجہِ ربانی

سلام اے رحمت للعالمین ملجائے ایمانی

سلامِ مرسلین ہم سب کی رُوح کا ذکرِ سلطانی

سلام ہر فردِ امت کا ولی کی چشمِ گریانی

پیش کردہ :- بہ تقریبِ مُبارک

عُرس بابا تاج الدینؒ ۲۶ محرم ۱۳۹۶ھ

از نیاز مندان

بسم اللہ الرحمٰنِ الرحیم

نشانِ راہ از قبلہ

(یتفکرون ۔ غور کرو ۔ اپناؤ ۔ ہوجاؤ)

ذکر ۔ حق کی راہ پر گامزن ہو کر دین، دنیا کی کامیابی کا راز " ذکر بہ امر اللہؐ میں پوشیدہ ہے یہ ذکرِ خفی ہے ۔ عطا ہے ۔ مرشدِ کامل اپنے کو عطا کرتا ہے هَل جزاء الاحسان اِلّا الاحسان ۔ شدتِ شوق، عشق و محبت کی راہ اِسی سے کھلتی ہے ۔ فاذکرونی اذکرکم ۔ یہ ذکرِ یار ہے، تڑپ کے ساتھ، تصوّر کے ساتھ، یہ طاقتیں، یہ مقامات یا انوار و تجلّیات حاصل کرنے کی بات نہیں ۔ یہ سوداگری نہیں ۔ محو ہو جاؤ کھو جاؤ جیسے مجنوں ۔ محبوب کے رنگ میں رنگ جاؤ ۔ رانجھا رانجھا کہتے میں آپ ہی رانجھا ہوای ۔ یہ ذکرِ آرزو طلب سے پاک ہے ۔ بھیک نہ مانگو ۔ بے نیاز ہو جاؤ تکلیف ہو، قیامت ٹوٹ رہی ہو، اس کا سہارا نہ لو ۔ سوائے محبوب کے دوسرا خیال نہ آئے پھر دیکھو رحمت ۔ اسی ذکر سے روح کی حیات ہے ۔ اسی سے روح و جان میں فروغِ کُن ہے ۔

یہ ذکر لطیفۂ نفس میں پکارہے شدت کے ساتھ ۔ آیۂ کریمہ ہے ۔ یہ ذکر لطیفہ قلب میں یاد ہے تصور کے ساتھ ۔ سورۂ رحمٰن ہے ۔ یہ ذکر لطیفۂ روح میں درود

ہے حضوری کے ساتھ ۔ درود تاج ہے ۔ یہ ذکر لطیفۂ غیب میں امر ہے محبوبی کے ساتھ ۔ سورۂ یٰسین ہے یہی ذکر اسمِ ذات ہے ۔ نسبتِ محمدیؐ رحمت محمدیؐ کا رابطہ ہے ۔ اِلّا بالسلطان والی بات ہے ۔ یہی ذکر اسمِ اعظم ہے ۔ آمرِ حق کی تلوار ہے ۔ قُم بِاذنی کی ادا ہے ۔

ذکر میں کُلَّ یَومٍ ھُوَ فِی شَان کی تجلی بن جاؤ ۔ زندگی کے ہر عمل حق کی راہ میں ہر قدم پر اسے اپناؤ ۔ مندرجہ ذیل جیسی اقداروں میں کامیابی کی چابی یہی ہے یہی کُن فَیَکُون ہے ۔

زندہ ساتھ : شیخ کی ذات ، نورِ محمدی ، حق ، کا زندہ ساتھ محسوس کرو ۔ حقیقت ایک ہے ۔ ان سب کی حقیقت میں کوئی دُوئی نہیں ۔ شیخ ہی حق ہے ۔ سانس سا ساتھ ۔ جانِ سا ساتھ ۔ رُوحانی ساتھ ۔ زندگی کے ہر حال میں ، رنج میں خوشی میں ، بیماری میں ، ابتلا میں ، قبر میں ، قیامت میں ، جنت میں ، ہر جگہ ساتھ ۔ ہر قدم پر ساتھ ۔ بسم اللہ کا ساتھ ۔ ھُوَ مَعَکُم اَینَمَا کُنتُم ۔ جہاں ہو ساتھ ہے ۔

عاجزی میں : رحمت کو سموتی ہے ۔ اپنے کو عاجز کر ڈالو ۔ عاشق عاجز ہوتا ہے ۔ ٹوٹا ہوا دِل ۔ ہر ایک سے نیچا ۔ سمندر کی سطح کی طرح سب سے نیچا ۔ پھر ہر چیز اسی کی طرف آتی ہے ۔ عاجزی صابر کا مقام ہے ۔ عبد کا مقام ہے ۔ صابر ، عاجز اور بے نیاز ہو کر دیکھو ۔ کڑوے ، سخت ، خون ، آگ سب کو صبر سے جذب کرو پھر دیکھو اِنَّ اللہَ مَعَ الصّابِرِین ۔ اللہ صابر لوگوں کے ساتھ ہے ۔

مثبت پہلو : زندگی میں صرف مثبت پہلو پر نظر رکھو ۔ منفی خیال کو چھوڑ دو ۔ ہر شخص ، ہر

چیزمیں صرف حُسن دیکھو۔ لوگوں کی برائیوں پر نظر نہ کرو۔ صرف خوبیاں دیکھو انسان یا اجنّا کے شر میں اپنا توازن نہ کھوؤ۔ محبت شفقت، نرمی کا رابطہ رحمت سے ہے اس کے آگے منفی قوتیں کہاں رُک سکتی ہیں۔ جاء الحق وزھق الباطل۔ حق آیا باطل رفع ہوا۔ ابتلا میں بھی منفی خیال کی جگہ مثبت سوچو۔ پھر دیکھو کہ جیسا سوچو گے ویسا ہوگا۔ حق فرماتا ہے۔ میں بندوں کے ظن (سوچ، فکر، خیال) کے مطابق ہوں جیسے کو تیسا۔

چور دروازہ :۔ قُربِ حق، حق تک رسائی کا چور دروازہ خدمتِ خلق ہے۔ دنیا کے کام آنا ہے۔ لوگوں کا دُکھ درد اپنانا ہے۔ صدقات سے، جسم سے، جان سے، رُوح سے، علم سے، ہُنر سے، اَمر سے، اخلاق سے، ایثار سے خلقت کے کام آنا ہے اسی لئے فرمایا ہے خالق کو خلقت میں ڈھونڈو۔

روزی :۔ پیر پکڑنے کے بعد سب کچھ اسی کی طرف سے آتا ہے جو پیر کی طرف سے آئے وہی حلال ہے باقی سب حرام۔ ہر دسترخوان پیر کا دسترخوان ہے۔ اپنے خون پسینے کی کمائی تک پیر کی دَین ہے یہ وسیلہ کی بات ہے۔ پیر ہی وسیلہ حق ہے۔ اسی لئے فرمایا ہے۔ وسیلہ پکڑو۔ جس کے لئے ہادی مُرشد نہیں۔ اس کے لئے ہدایت نہیں۔

جمیعت :۔ سب سے بڑی پیروی سنت جمیعت کا درد، غمِ امت کا اپنانا ہے۔ یہ غارِ حرا کی سنت ہے۔ معراج میں بھی اُمتی اُمتی فرمایا۔ اُمت کی فکر میں پیٹ پر پتھر باندھے میدانِ بدر میں سربسجود ہوئے۔ جس آنکھ میں غمِ اُمت کے آنسو نہیں وہ کیا۔ یہ زندگی انفرادی نہیں۔ ایک جمعی سلسلہ ہے۔ جمیعت میں حیات ہے۔ برکت ہے جمیعت پر ہی رحمت نازل ہوتی ہے۔ جنت میں بھی گروہ کے گروہ جائیں گے۔ جمیعت کا غم جھوٹ مُوٹ ہی اپنا کر دیکھو۔ وہ سچ کر دیتا ہے۔

نورِ محمدی: ۔ وُسِعَ کُلِّ شَیئٍ ہے ۔ ذرہ ذرہ سے عیاں اور نہاں ہے ۔ ہر حُسن، خوبی، حق میں اسی کی تابانی دیکھو ۔ اپناؤ ۔ کائنات کی رونق اسی کی تجلی ہے، کثافتوں سے نظر ہٹا کر، مادے سے نظر ہٹا کر، لطافتوں، اعلیٰ اقدارِ زندگی اور مجردات میں اِسے دیکھو اور پاؤ ۔ نورِ محمدی کے کُن کا کیف لو ۔ رحمتِ محمدی میں آجاؤ ۔ نظر سوائے روشنی کے، تاریکی کی طرف کبھی نہ جائے گی ۔

حق: ۔ شیخ کی ذات اور حق ایک ہی ہے ۔ مٹی کے بُت تک نظر نہ رکھو ۔ پسِ پردہ نورِ محمدی کا ظہور رہا ہے ۔ قرنیؓ کی ادا اپناؤ ۔ اِس نُور کو اپنی محبتوں کی شدت میں ایک اکائی دیکھو میں ۔ تم بھی غیر نہیں اس اکائی میں پاؤ ۔ وحدت الوجود کا کیف اپنے عشق کی شدتوں میں لو ۔ اپنے وجود کو درمیان سے ہٹاؤ عشق ہی عشق ہے، حُسن ہی حُسن ہے ۔ رحمت ہی رحمت ہے ۔ نُور ہی نُور ہے ۔ اَللہُ نورُ السمٰوٰت والارض ۔ وُہی ہے ۔ سب کچھ وہی ہے ۔ حقیقت ایک ہے ۔ "ہے" کا کیف لو ۔

زندگی را خود بدہ تفسیرِ نَو
خود بدہ ایں خواب را تعبیرِ نَو

(زندگی کو خود نئی تفسیر دو ۔ خود اس خواب زندگی کی نئی تعبیر دو)

۷۸٦

PALM AND HOROSCOPE READINGS OF QIBLA DURRANI SAHEB

Palm and Horoscope readings copied from the original diary written by Qibla in November 1948 and June 1949. The original palm readings and drawing of the horoscope (زائچہ) were conducted in Telegu and rendered into English by Qibla himself.

O

PALM Date 27. 11. 48

Mr. U. Durrani Saheb Age 41

1. Length of Life :— 88 years
2. Peculiarity :—A practical philospher and destined to become a Sanyasi in the year 62nd.
3. Profession & Fortune :—Between 38 and 42 years — a period of 4 years :—
   (a) Worst period in life.
   (b) You will return to service in Aligarh within a few months, work there just one or two years only. In your 45th year, you will be taken to another institution near about Delhi. From that date two sources of income. You will continue there si years. Again a change to another institute on near abou. roughly 50th to 60th, a period of 10 years—the best period in the professional life.
   (c) Retiring and shortly Renunciation. This period from 62 to 88, a period of 16 years—The first period of 8 years a period of intense struggle and meditation and prayer. The later and the last period of 8 years —the perfect life of a God realised soul.
4. Just one child more, probably a son.
5. From 42 years, health alright.
6. She is an innocent pure noble lady, a true helpmate
7. During 62nd–75, when books will be written.
8. No Foreign Travel.

HOROSCOPE

By : Kala Subba Rao Esqr, Kakinada.

Birth : Rajmundry : Saturday 4.5.1907/9.23 A. M.

Venus	Sun Mercury		Langam Rising Jupiter
Saturn	R A V I		R A H A R I N
Moon Ketu			
MARS			

Moon		Mercury	Saturn
Rising Jupitor Ketu	A M S A		
			RAHARIN
	Venus	Sun Mars	

Uttars hadha.
Ravi (Sun) Manadesa Sestam
(Balance)

Forth Foot
Y. M. D.
0–10–10

The Mahadesa of Jupitor begins from 14. 3. 1943.

1.	Plavanga Chitra Bahula	2 W. A.	4th Foot
2.	Bharani.	Ravi (Sun)	3rd Foot
3.	Moon.	Uttarashadha	4th Foot
4.	Mars.	Purvashada	3rd Foot
5.	Mercury.	Aswani	2nd
6.	Jupitor.	Arudra	3rd
7.	Venus.	Urtrabhara	4th
8.	Saturn.	Purvabhadra	3rd
9	Rahu.	Pushyama	1st

I. Jupitor in 1 and Venus in 10. Therefore strength for trying for salvation. (viv—Euthi Marguman).

II. Saturn who in the Karaka for Viragyam is in his own house. Mercury the Lord of the Langa is in conjunction with Atranakaraka. Sun who is in uchcha.
Therefore more strength for Viragyam. In the period for Jupitor the Rayyadhipati in good sub periods, he will be immersed in doing pennance.

III. (a) The Lord of Arudha Lagnam is in Lagnam.

(b) The Lord of Arudha Bhagyam is in Uchcha.

(c) Jupitor who is the Lord of the Rajayam (10) according to Lagna is looking at Arudha lagna. Therefore Native will become a Rajayogi (قادریہ)

The Lords of the 2nd (House of Wealth) and 11 (The House of Latham) are looking at 2nd House. Therefore the Native is always rich.

The Lord of the 7th house (Kalathram) and Korak are in the good houses. Therefore too much of Kalethsa Bhagyam. On the whole Rajayogum. Less evil, more good. Therefore the Native will have Tapobhagyam

Kakinada
June 1949

Sri Challa Subba Rao.

READING OF THE HOROSCOPE
BY
GURU MAHADESA

Present period : 14.11.47 to 20.2.50
sub. per : Budha Desa, Autar Desa.

This period Maka Desa, Autar Desa. Lords. Keyendevdh Patalu. Yoga Karakule Karam. Langam Dwiswa bhawamu. Aguta warna widuna Lagnamku Guru Budhale. Kandaradhi Patab A yi Makastananhi Ande Laru-gana Asulaha balam Nivajahalu. Jupitor is the ruling star.

Mercury 11th house Vashan.

Present period : bad period, so far as health is concerned. After 20.2.1950 to 26.1.51, Ketu is ruling. Best period of life. Later all is well and no bad periods. Age 71 or 72.
From July 1948 to July 1949 year bad period.

1. Join duty in March 1950. Will gain in health everyday after July 1949.

2. Will be in service for six years from March 1950. i. e. upto March 1956. 1951-53 you will get wealth enough to make you independent of further service and you will get fame in service and religious knowledge.

3. After six years you will devote entirely to Yogas.

4. After 1956 — All India travel as a Yogi on river sides and will ave contact with great rishis.

5. 1951-53 ; Must become Raja Yogi, and will have a lasting name left behind.

6. Only after October 1949 you can go to Karachi when this will be good.

7. Will settle by a riverside on the hills and build an Ashram.

O